’’چہارسُو‘‘

۔اردو افسانہ اور چند افسانہ نگار۔

''اردو افسانے کے مختلف موضوعات پر وقتاً فوقتاً لکھتا رہا جو مختلف رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ میں نے افسانوی مجموعوں پر تبصرے بھی کئے ہیں اور افسانوی کتابوں پر جائزے بھی لکھے ہیں۔ افسانوں سے متعلق میرے مضامین میں افسانے کا تعارف، اس کا ارتقائی سفر، اس کا مستقبل اور چند افسانوں کے تجزیئے بھی شامل ہیں۔ میں نے اردو کے معروف افسانہ نگاروں کے فن پر بھی لکھا ہے جن میں پریم چند جیسے اہم افسانہ نگار شامل ہیں۔ کچھ جدید افسانہ نگاروں کے فن کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ کچھ افسانہ نگاروں پر لکھے گئے مضامین دستیاب نہ ہوئے جن میں جیلانی بانو کی افسانہ نگاری بھی شامل ہے۔ کچھ نئے مضامین بھی لکھے جن میں شاہد کامرانی، شیر شاہ سید اور قرۃ العین حیدر شامل ہیں۔ کئی افسانہ نگاروں کے ایک ایک افسانے کا تجزیہ بھی شامل اشاعت ہے۔ ان تبصراتی مضامین میں محسن بھوپالی (منظوم افسانے) نظمانے پر تجزیاتی مضمون، سعدیہ سیٹھی کے افسانوی مجموعے ''رشتوں کا بھنور'' ایک مضمون اردو ڈرامے پر ایک نظر قرۃ العین کی ناول نگاری پر ایک تازہ مضمون کے ساتھ ان مضامین کی تعداد بیس ہوگئی ہے۔ تمام مضامین افسانہ' افسانہ نگاری اور افسانے کے مستقبل، اس کی اہمیت اور اس کے ارتقاء سے متعلق ہیں''.....پروفیسر افتخار اجمل شاہین

قیمت: تین سو روپے۔ دستیابی: ویلکم بک پورٹ اردو بازار کراچی۔

۔لفظوں کا سفیر۔

''پروفیسر زہیر احمد کنجاہی نے جہاں ہر صنف میں اپنے قلم کا جادو جگایا ہے جس کو قاری کی آنکھوں میں سانسوں میں دھڑکنوں میں محسوس کیا جاسکتا ہے وہاں ان کی شخصیت ہر شخص کو اپنی طرف لبھاتی بھی ہے۔ میں نے زہیر کنجاہی صاحب کی ہر صنف کو خوشبو کی طرح محسوس کیا اور کوشش کی کہ اس خوشبو کو پھیلا کر سمندر کو کوزے میں بند کردوں مگر میرے خیال میں ابھی ایسا کوئی کوزہ کسی نے نہیں بنایا جس میں پروفیسر زہیر کنجاہی صاحب کی شخصیت وفن کا سمندر سما سکے۔ زہیر کنجاہی صاحب خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہنے والے ایسے تخلیق کار ہیں جن کے پاکیزگی خیالات سے کوئی شخص متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ممکن ہے آپ ساحلِ سمندر پر کھڑے ہو کر سمندر کی گہرائی کا اندازہ لگانے پر قادر ہوں مگر جناب زہیر کنجاہی کی تخلیقات جس قدر بھی پڑھی جائیں اُن کے وسعت خیال اور وسعتِ فکر کو پہنچنا قاری کے لئے بہت دشوار ہوتا ہے۔ ہر چند میں نے زیرِ نظر کتاب میں کنجاہی صاحب کی شخصیت وفن کے بہت سے حوالے قلم بند کئے ہیں مگر میرے خیال میں کنجاہی صاحب جیسے بحرِ بیکراں کے لئے ابھی بہت جستجو اور کاوش باقی ہے اور آنے والے دنوں میں اس حوالے سے مفید اور بامقصد کام ہونے کی توقع بھی ہے''.....ملکہ طالب ایڈووکیٹ

دستیابی: پروفیسر زہیر کنجاہی، ڈھیری حسن آباد، راولپنڈی۔

۔ایسے بھی افسانے۔

''قیصر سلیم صاحب ایک اچھے افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانے ''رات گزر گئی جاناں'' ''برن کنڈی اور دوسری کہانیاں'' کے عنوانات سے منظر عام پر آچکے ہیں۔ اس کے علاوہ ''افسانہ'' کے نام سے ایک سہ ماہی کی ادارت بھی کر چکے ہیں۔ ان کی افسانہ نویسی کے رجحان نے انھیں دوسری زبانوں کے افسانوں کی طرف متوجہ کیا۔ اس سلسلے میں ان کے تراجم منتخب امریکی افسانے، منتخب عالمی افسانے اور اس کے بعد انگریزی میں ترجمہ کئے گئے بنگلہ دیشی افسانوں کا اردو ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔ اور اب مختلف زبانوں کے افسانوں کا زیرِ نظر ترجمہ پیش خدمت ہے۔ ان افسانوں کا انداز ذرا مختلف اور موضوعات میں انفرادیت ہے۔ زیرِ نظر مجموعے میں بنگلہ دیشی، چینی، ہندی، امریکی، برطانوی اور عربی کہانیوں کے تراجم ہمیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ کہانیوں کی انفرادی خصوصیات کے باعث یہ افسانے افسانہ نویس کا ایک نیا اندازِ تحریر لئے ہوئے ہیں''..... خواجہ حسن منظر

دستیابی: ویلکم بک پورٹ، اردو بازار، کراچی

''چہارسُو''

N.P.R- 063

زندگی کے ساتھ ساتھ

چہارسُو

چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو

جلد۲۰،شمارہ:جنوری،فروری۲۰۱۱ء

زرِسالانہ

دلِ مضطرب نگاہِ شفیقانہ

مجلسِ مشاورت

قارئین چہارسُو

بانی مدیرِاعلیٰ

سید ضمیر جعفری

❍❍❍

مدیرِمسؤل

گلزار جاوید

❍❍

معاون مدیران

بینا جاوید

فاری شا

محمد انعام الحق

❍

''اب کے برس''

دیکھیں گے دعاؤں میں اثر اب کے برس میں
لگ جائیں گے شاخوں پہ ثمر اب کے برس میں

پوشیدہ ہے امیدِ ظفر اب کے برس میں
کرنا ہے کوئی کارِ ہنر اب کے برس میں

چمکے گا میری ارضِ وطن کا بھی مقدّر
ابھریں گے نئے شمس و قمر اب کے برس میں

ہم عزمِ سفر گردشِ افلاک میں رکھ کر
رکھیں گے ستاروں کی خبر اب کے برس میں

جل اٹھیں گے محفل میں دیئے سوزِ دُروں سے
بن جائے گا ہر قطرہ گہر اب کے برس میں

اٹھیں گے کئی پردے ابھی رازِ نہاں سے
اجلیں گے کئی رنگِ سحر اب کے برس میں

پھر آئینے بانٹیں گے کہیں ذوقِ تجلّی
غافل نہ رہیں اہلِ نظر اب کے برس میں

چھا جائیں گے ہم وسعتِ افلاک پہ عظمیٰ
باندھیں گے نئے رختِ سفر اب کے برس میں

-عظمیٰ صدیقی-

(لندن)

چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو

رابطہ:537،ویسٹریج-III،راولپنڈی۔فون:92-51-5462495 فیکس:5490181 ای۔میل:chaharsu@gmail.com

پرنٹر:فیض الاسلام پرنٹنگ پریس ٹرنک بازار راولپنڈی

متاعِ چہارسو

سرِ ورق، پسِ ورق---------شعیب حیدر زیدی
تزئین------------------عظمیٰ رشید
کمپوزنگ-------------------تنویرالحق

قرطاسِ اعزاز

دعا دیوانگی-------------نذیر فتح پوری	۳
چشمِ حیراں--------------شہلا تبسم	۴
زہے نصیب--------------عروب شاہد	۵
آئینۂ زیست------------پروین شیر	۷
براہِ راست--------------گلزار جاوید	۸
حدِ عاشقی--------------فاری شا	۱۵
سرنگوں گنبد و محراب--------وارث علوی	۱۹
نہالِ دل پر سحاب---------ستیہ پال آنند	۲۲
کٹھن راہوں پہ------------انور سدید	۲۶
دیواریں حائل-------------قمر رئیس	۲۹
کسی سے محبت نہ کرنا---------عبداللہ جاوید	۳۱
پہلو میں دل-------------محمد علی صدیقی	۳۶
خوبصورت دنیا-------------رے ڈکس	۳۷
روشنیاں بجھتی جاتی ہیں----------اقبال بھٹی	۳۸
نیلا لفاف---------------پروین شیر	۴۳
حوصلوں کا امتحاں----------عطیہ سکندر علی	۴۵

خیرالوریٰ کا آستاں

امین راحت چغتائی، خورشید انور رضوی	۵۲

افسانے

مکافاتِ عمل-------------شہناز خانم عابدی	۵۳
قوسِ قزح---------------رخشندہ روحی	۵۵
شہرِ ناپرساں-------------روبینہ ناز	۶۰
اپی ٹاف----------------نثار احمد صدیقی	۶۲
خوابوں کے پھندے-----------کنیز نبوی	۶۴
سرمایۂ جاں---------------گلزار جاوید	۶۷

رفعتِ عالم

مشکور حسین یاد، کرشن کمار طور، امین راحت چغتائی، شبنم شکیل، سرور انبالوی، قمر بھوپالی، جین جوہر، خالد حمید، بہل تشنہ، آصف ثاقب، غالب عرفان، انوار فیروز، مہندر پرتاپ چاند، حسن عسکری، مناظر عاشق ہرگانوی، صفوت علی صفوت۔	۷۰

صفِ جدید

پیش کردہ خدمات------------ثمینہ فرخ	۷۸

شباب کا موسم

زہیر کنجاہی، کرامت بخاری، صابر عظیم آبادی، سعید نقوی، سیفی سرونجی، شگفتہ نازلی، شوکت جمال، مراق مرزا، نوید سروش، انور جاوید، قیصر مسعود، شان بھارتی، سرفراز نواز، عزیز نبیل، سمیع نوید۔	۹۰

داستانِ حیات

ہوا کے دوش پر-------------فیروز عالم	۹۵

فکرِ فردا

اقراء-----------------صفوت علی صفوت	۱۰۰

آئینۂ فن

شام تجھے سلام--------------ناصر ملک	۱۰۱

سیلابی پانی

نقاش کاظمی، خیال آفاقی، پرتپال سنگھ، مناظر عاشق ہرگانوی، یونس صابر، بہل تشنہ، پروین کمار اشک، غالب عرفان، آصف رضا، کرشن گوتم، جہانگیر اشرف، فیصل عظیم، مسکین احمد منصور، شگفتہ نازلی، شائستہ سحر، تصور اقبال۔	۱۰۳

ایک صدی کا قصہ

وی۔شانتارام------دیپک کنول	۱۱۱

ورثہ

رباعیات-----------اکبرالٰہ آبادی	۱۱۳

رس رابطے

جستجو، ترتیب تروین----وقار جاوید	۱۱۴

☆

قرطاسِ اعزاز پروین شیر کے نام قرطاسِ اعزاز پروین شیر کے نام قرطاسِ اعزاز پروین شیر کے نام قرطاسِ اعزاز پروین شیر کے نام قرطاسِ اعزاز پروین شیر کے نام

دعا دیوانگی

شاعرہ مصورہ پروین شیر
علم و فن کا آئینہ پروین شیر

اہلِ فن سے پائی ہے دادِ سخن
ذکر ان کا انجمن در انجمن

عزمِ محکم کا ہے پیکر دلنواز
کامیابی کا ہے یہ بھی ایک راز

رفعتوں پہ ان کی ہیں نظریں سدا
ہے بلند پروازیوں کا سلسلہ

ہمنوا اور ہم سخن ہیں سینکڑوں
ہم جلیسِ انجمن ہیں سینکڑوں

مہربانوں، قدر دانوں کا ہجوم
چاروں جانب ہے دعاؤں کا ہجوم

صفحۂ قرطاس روشن کر دیئے
آگہی کے جب جلائے ہیں دیئے

واہموں سے، وسوسوں سے دور ہیں
خوب اپنے آپ میں مسرور ہیں

رنگ بھرتی ہیں ردائے فکر میں
محو رہتی ہیں سخن کے ذکر میں

ہجرتوں کا کرب بھی سہنا پڑا
دُور اپنوں سے سدا رہنا پڑا

پنچھیوں جیسی گزاری زندگی
اس چمن سے اُس چمن کی سیر کی

روشنی، خوشبو، دعا دیوانگی
ان عناصر سے مزیّن زندگی

واہ واہی سے خزانے بھر لیے
رنگ سارے نام اپنے کر لیے

یوں دکھائے ہیں ہنر کے سلسلے
کرچیوں سے آئینے خانے بنے

نزہتِ احساس کو زندہ کیا
گلشنِ افکار تابندہ کیا

شش جہت میں کام روشن ہوگیا
کام ہی سے نام روشن ہوگیا

یاس اور حرماں نصیبی سے پرے
ہر طرف روشن ہیں خوشیوں کے دیئے

رک نہیں سکتا ہے اب یہ کارواں
اپنی منزل کی طرف ہے جو رواں

قرطاسِ اعزاز پروین شیر کے نام قرطاسِ اعزاز پروین شیر کے نام قرطاسِ اعزاز پروین شیر کے نام قرطاسِ اعزاز پروین شیر کے نام

نذیر فتح پوری (بھارت)

''چشمِ حیراں''

شہلاتبسم (کینیڈا)

جائے پیدائش تعلیم وتربیت:

عظیم آباد کے علمی اورادبی گھرانے میں آنکھیں کھولیں۔والد...... سیدفضل اللہ قادری (مفکر، فلسفی، دانشور)۔والدہ......شکیلہ قادری ادبی ذوق کی مالک۔بھائی......ڈاکٹرسیدشمس الضحیٰ (ادبی نام عارف عظیم آبادی) سائنس دان اورانگریزی کے شاعراور مصنف۔خالو...... پروفیسراختر اوررینوی، مشہورناقد اور افسانہ نگار۔جن کی نگرانی میں ادبی ذوق کی تربیت ہوئی۔خسر......سیداحسن شیر۔ خدابخش لائبریری کے سیکریٹری اور میوزیم کے کیوریٹر (پٹنہ،بہار) علامہ اقبال سے ان کے گہرے مراسم تھے۔شوہر......وارث شیر (پروفیسر ریاضی) سیاست اور ریاضی پر۸ کتابوں کے مصنف ہیں۔کینیڈاآکر یونیورسٹی آف ونی پیگ سے سائیکالوجی اور یونیورسٹی آف مے نی ٹوبا سے فائن آرٹس کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مصوری کی نمائش شروع ہی کی تھی کہ اپنے تین بچوں کو سنوارنے میں لگ گئیں۔بیٹی صہبا بیٹے شیرازاور فراز۔

ملازمت:

فلم کلاسی فکیشن، گورنمنٹ آف مے نی ٹوبا' کینیڈا۔

شاعری:

سب سے پہلی نظم ۱۲سال کی عمر میں کہی۔۱۹۸۰ء میں پہلی اشاعت ہوئی۔ پھر ہندوستان پاکستان کے مختلف رسالوں میں غزلیں'نظمیں چھپتی رہی ہیں۔جن میں صریر'سیپ'ادب ساز'ذہن جدید'مون تاج'شعروحکمت'آج کل' اقدار'نیاسفر'روشنائی' کتاب نما'مباحثہ'آئندہ'ایوان اردو'نیاورق'چہارسو'انتساب' پرواز'اسباق' کاروان ادب'نئی صدی'تحریک ادب'جدیدادب'سبق اردو'سب رس تخلیق وغیرہ ہیں۔

نثری تخلیقات:

افسانے (بہت کم) مقالےاور مضامین۔

تصانیف:

شاعری/مصوری''کرچیاں'' پہلا ایڈیشن ۲۰۰۵ء۔اردواور انگریزی میں کوفی ٹیبل سائیز میں۔ دوسرا ایڈیشن ۲۰۰۸ء (کوفی ٹیبل) اردو اور انگریزی میں۔۲۰۱۰ء میں ہندی میں۔شاعری/مصوری کا دوسرا کوفی ٹیبل مجموعہ''نہال دل پر سحاب جیسے''۲۰۱۰ء میں تین زبانوں میں شائع ہوا۔اردو'انگریزی اور ہندی۔

ایک شعری مجموعہ اور سفرنامہ مصوری کے ساتھ ابھی زیرطبع ہے۔

فلاحی خدمات:

کتابوں اور C.D کی آمدنی عراق کے مصیبت زدہ بچوں اور سیلاب زدگان کے لیے بھیجی۔ ہندوستان میں غریب بچوں کے اسکول (سرسید اسکول) کی مدد، ہرسال کینیڈین اسکول آف بلائینڈ اوراپاہجوں کے ادارے کے لئے پینٹنگس کی آکشن سے مدد۔

مصوری:

اب تک ۵۷۵ پینٹنگس بنائی ہیں

نمائش:

پیرس' کینیڈا کے کئی شہروں میں 'نیویارک'امریکہ کے شہروں میں'لندن' ہندوستان'جرمنی' چین ۲۱ گروپ/Juried نمائشیں اور ۸Solo نمائشیں

کینیڈین فلم انڈسٹری کے لئے Painting چنی گئی۔کئی ادبی جرائداور کتب کے سرورق کے لیے مصوری کی جیسے شعروحکمت،ادب ساز،مون تاج، جدیدادب اسباق وغیرہ۔کتابوں میں سلطان جمیل نسیم، ستیہ پال آنند، اطہررضوی، افتخاراجمل شاہین۔

موسیقی:

انڈین میوزک اسکول' کینیڈا سے ستاراور کینیڈین میوزک اسکول سے آرگن کی تعلیم حاصل کی۔ستاراورآرگن کی ایک فیوژن موسیقی کی سی ڈی اور شاعری اور ستار کی دوسی ڈی پروڈیوس کیں۔

اعزازات وانعامات:

۔شعری/مصور مجموعہ''کرچیاں'' کودنیائےشعروادب برطانیہ کاپلیک۔
۔ادبی کلچر'بنارس (انڈیا) کاایوارڈ۔
۔شعری/مصور مجموعہ''نہال دل پر سحاب جیسے'' کو احمدادایا اردو مرکز انٹرنیشنل (لاس انجلس) ایوارڈ۔
۔مصوری میں......۸ایوارڈس
۔فلاحی خدمات کے لیے یونی سیف ایوارڈ
۔وُمن آف ڈسٹنکشن (کینیڈا) میں نامزدگی
۔بالی وُڈ کی فلم میں آرٹ ڈائرکشن

سیاحت:

فرانس (پیرس' جیورنی' شنٹ لی' ورسائی' اوویر)' جرمنی (اشٹوٹ گارٹ' ہیرن برگ' آخن' فرینک فرٹ' ہائڈل برگ)' بلجیئم (بروژ' برسلس)' دوبئ' ابودھابی' بحرین' ہالینڈ (ایمس ٹرڈیم' روٹرڈیم' ہیگ)' موراکو (مراکش' کاسابلینکا' اوسیااورا' رباط' فیز' میکنس' سہارا' مُڈلٹ' ٹوڈراگورج)' اٹلی (روم' وینس' پوم پے' فلورینس' پیزا' کپری' نیپلس' مورانو' برانو)' ترکی (استنبول)' اسپین (قرطبہ' مُدرڈ' الحمرا' سِول' ٹولیڈو' بارسیلونا)' پرتگال (لس بن)' یونان (اتھنس' جزیرہ ہائیڈرا)' چین (بیجنگ' سوزو' ہان زو' ٹونگلی' شنگھائی)' سویٹزر لینڈ (جینوا' لوزان)' نیپال (کاٹھ منڈو)' برطانیہ کے اہم مقامات' نارتھ امریکہ، کینیڈا، انڈیااور پاکستان کے اہم مقامات۔

''زہے نصیب''

عروب شاہد
(راولپنڈی)

پروین صاحبہ' تسلیمات۔

آپ کی تازہ کتاب ''نہال دل پر سحاب جیسے'' شاعری اور مصوری کا شاہکار ہے۔ میرے خیال میں آپ کی شاعری اور مصوری دونوں لاجواب تخلیقی عمل ہیں۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ آپ کو لفظوں اور رنگوں سے یکساں طور پر آشنائی ہے۔ میرے خیال میں یہ کتاب ایک حقیقی فنکار کی بہترین ترجمان ہے۔ میری جانب سے اس عظیم کارنامے پر دلی مبارک باد قبول کیجیے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ
(دہلی' بھارت)

محترمہ ومکرمہ' پروین شیر

کرم نامہ نکہت خلوص کا پیام بن کر نظر نواز ہوا۔ شکر گذار ہوں۔ جواباً نام بنام مہہ ومہر کا سلام بھیجتا ہوں۔ پروین شیر صاحبہ کے لئے۔ اور عید کی پیشگی مبارکباد کا ہدیۂ تہنیت۔ گر قبول اُفتد آپ کو میری تحریر پسند آ گئی۔ مجھے روحانی مسرت حاصل ہوئی۔ آپ کی شاعری نے داخلی بصیرت عطا کی تھی۔ مسرت سے بصیرت تک کا دائرہ مکمل ہوا۔

ایوان اردو میں آپ کی کہانی ''نیلا لفاف'' اندر دور تک اتر گئی۔ مخلص، حساس اور حقیقی فن کار ایک ایک لفظ کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے۔ آپ نے صلیب کا بوجھ اٹھا کر یہ کہانی لکھی ہے۔ جس میں لفظ لفظ ہم کلام ہے اور احساس چاک گریبانی کے باوجود پاس گریباں کے تقاضوں سے بے نیاز نہیں۔ مبارک ہو!

آپ لوگوں کا ہندوستان کا پروگرام ہو تو قبل سے اطلاع دینے کی زحمت فرمایئے۔ خاکسار چشم براہ رہے گا۔

پروفیسر لطف الرحمٰن
(بھاگلپور' بہار)

محترمہ پروین شیر صاحبہ' السلام علیکم۔

آج آپ کی مصور شعری البم موصول ہوئی۔ دیکھ کر از حد مسرت ہوئی۔ آپ اپنے شاعری اور مصوری کے فن میں یکتا اور بے نظیر ہیں۔ مبارکباد! یہ خط صرف کتاب کی رسید ہے۔ جیسا کہ میں نے کہا تھا 5-4-3 دسمبر کو کلکتہ میں انشاء کی سلور جبلی تقریبات منعقد ہو رہی ہیں۔ سیمنار اور مشاعرہ۔ میں آپ کو اس سیمنار میں شرکت کی زبانی دعوت دے رہا ہوں۔ البتہ ایئر ٹکٹ ہم فراہم نہیں کر سکیں گے۔ مقامی میزبانی ہمارے ذمہ واجب ہوگی۔ آپ کلکتہ ضرور آیئے۔ انشاء اللہ آپ مصوری اور شاعری کے اس شہر سے خوش ہوں گی۔ یہاں مقامات دیدنی تو زیادہ نہیں لیکن یہ فکر وفن کا شہر ہے۔ آپ کا جواب موصول ہونے پر باقاعدہ دعوت نامہ ارسال کیا جائے گا۔ امید ہے آپ بخیر ہوں گی۔

ف۔س۔اعجاز
(کولکتہ' بھارت)

پروین صاحبہ' سلام احترام۔

چند روز قبل آپ کی کتاب موصول ہوئی تھی۔ کرچیاں (Fragments) ایک قابل داد پیشکش ہے۔ آپ کے قلم اور موقلم سے مصوری اور آپ کے شاعرانہ احساسات کی شمولیت نے اسے باوقار بنا دیا ہے۔ فرانس بیکن کے مطابق:

''چند کتابیں ذوق سلیم کے حامل افراد کے لیے ہیں، چند کتابیں دیانت داری کا اظہار کرتی ہیں اور ایسی بھی کتابیں ہیں جن کے مطالعے سے فکر وخیال کو تقویت ملنے کے علاوہ ان کا متن ذہن نشین ہو جاتا ہے''۔

آپ کی کتاب قطعی طور پر مکمل یکسوئی' تندہی اور توجہ کے ساتھ پڑھی جا سکتی ہے۔ اس کا شمار اعلیٰ درجہ کی کتابوں میں کیا جا سکتا ہے۔

ولی عالم شاہین
(کینیڈا)

محترمہ پروین شیر' دعائیں۔

ہر ایک بوند کئی بجلیوں کی حامل تھی..... آپ کی تازہ تصنیف ''کرچیاں'' خوبصورت حیرتوں کا خزانہ ہے۔ ہر صفحے پر ایک نہ ایک مصرعہ چمک ہی جاتا ہے۔ چند نظم تو شدید تاثر چھوڑتی ہیں۔ مجھے ''کاش''، ''شکست''، ''سراب''، ''بہت مرتی ہوں لیکن''، ''ڈسپوزبل'' بہت پسند آئیں۔ غزلیں بھی خوب ہیں۔ میں انشاء اللہ مفصل تبصرہ جلد کروں گا۔

سلیم محی الدین
(بھارت)

پروین جی' آداب۔

آپ کی کتاب ''کرچیاں'' کی جلد موصول ہوگئی بہت بہت شکریہ۔ یہ کتاب بھی اپنے آپ میں تصور کا ایک ایسا جہان سموئے ہوئے ہے جس تک اُڑان آسان نہیں۔ آپ کی کلپنا کی پرواز بہت بلند ہے جذبہ بہت عظیم۔ مبارکباد قبول کیجیے۔ آپ کی دونوں کتابوں کے بارے میں ''ادیب انٹرنیشنل'' کے تازہ شمارے میں کچھ بہتر سا شاملِ اشاعت کرنے کو من چاہتا ہے۔ آپ کی تازہ تخلیقات کا انتظار رہے گا جلد توجہ فرمایئے۔

ڈاکٹر کیول دھیر
(لدھیانہ' بھارت)

عزیزہ محترمہ' سلامت باشد۔

میں تم سے چھوٹا ہوں عمر سے آدمی بڑا نہیں ہوا کرتا اگر ایسا ہوتا تو کئی بزرگ ہستیاں کم عمری میں ہی تشریف لے گئیں۔اب میں تمہیں کن القاب سے مخاطب کروں؟ پرانی کہاوتیں بھی اب ختم ہوگئیں۔ پہلے ڈاکو ہوا کرتے تھے اب بھی ہیں لیکن پہلے جنگل میں رہتے تھے اور اُس علاقے سے کسی کی گزرنے کی ہمت نہیں ہوا کرتی تھی۔آج عالی شان بنگلوں کے اندر شہر میں رہ کر کرسی پر بیٹھ کر ڈاکے ڈل رہے ہیں۔اسی طرح شیر جنگل میں رہتا تھا اور بادشاہ کہلاتا تھا کسی کی ہمت نہیں تھی کہ اس کا سامنا کر سکے۔جنگل میں اگر بوڑھا' جوان یا پٹھا ہی شیر ہو یا شیرنی ان میں سے کسی پر بھی نظر پڑ جائے تو آدمی بری طرح شیر شیر کی آواز لگا کر بھاگتا تھا۔ میں تمہیں اردو ادب کی شیر مانتا ہوں۔اسی لئے میں ہمت کر کے پیاری پروین شیر کو بہت ساری دونوں ہاتھوں سے کھوبا بھر دعائیں دے کر زندہ باد کہہ کر مخاطب کر رہا ہوں۔دل بہت چاہتا تھا تم سے گفتگو کرنے کو مگر میں اپنے کو اس لائق ہی نہیں سمجھتا۔تمہیں میں پڑھتا ضرور رہا ہوں۔''شاعر'' جو میرے پاس برسوں سے آرہا ہے اس میں تفصیل سے معلومات ہوئی اور عزیزی سیفی کا انتساب پروین شیر نمبر پڑھ کر تو میں میدان میں آ گیا اور ۸۴ سال میں ہو کر آیا ۔میں بچپن سے ہی خوبصورت مناظر دیکھنے کا شوق لے کر آیا ہوں ساتھ ساتھ انہیں بناتا بھی تھا حُسن پرستی آج بھی موجود ہے اس لئے آج بھی اپنے کو جوان سمجھتا ہوں ہر خوبصورت قدرتی مناظر کو دیکھ کر تڑپ جاتا ہوں۔کم عمری میں ہی میں نے فائن آرٹ کے کئی امتحانات دے ڈالے جب میٹرک کیا تو فائن آرٹ لے کر' انٹر مینجمنٹ کیا وہ بھی فائن آرٹ سے بمبئی سے سرجے جے آرٹ سے۔ لندن سے RDS کیا اور فائن آرٹ لے کر ہی بی۔اے کیا۔آخر میں جب اردو سے زیادہ لگاؤ ہوا تو اس میں ایم۔اے کیا۔

کئی بڑے بڑے انعامات بھی حاصل کئے۔لیکن یہ سب گھر بیٹھے بیٹھے ہی ہوا۔چھوٹی جگہ ہونے کی وجہ سے اپنی پینٹنگ کہیں بھیج نہ سکا ہر شخص نے فائدہ میرے اس شوق سے ضرور اٹھایا۔اب آخر عمر میں اس شوق کو مار کر ادبی دنیا میں آ کر اپنا وقت گزار رہا ہوں۔اردو یہاں کی زبان ہے ریاست کے زمانے میں یہی سرکاری زبان تھی۔ یہ شوق بھی تھوڑا تھوڑا پہلے سے موجود تھا۔میں خود ہی لکھا پڑھا کرتا تھا۔

سن ۱۹۴۷ء میں ایک چار ورقی قلمی اخبار نکالا کرتا تھا یہاں کوئی پریس وغیرہ بھی نہیں تھی اور نہ کوئی اخبار آتے تھے ہفتہ میں ایک اخبار کوئی آ گیا تو آ گیا۔اس قلمی اخبار میں کچھ کھیل کود اور بچوں کیلئے اسکاؤٹنگ سے متعلق خبریں لکھا کرتا تھا، کچھ تصویریں یا کارٹون بھی بنا دیا کرتا تھا۔آج بھی ایک دو کاپیاں میرے پاس بچی ہوئی محفوظ ہیں۔سن ساٹھ سے سرکاری اسکول میگزین میں میرے مضامین بھی چھپ جاتے تھے۔عزیزی سیفی جس کو اللہ نے ادیب اور شاعر ہی پیدا کیا ہے۔کسی اسکول میں داخل نہیں ہوا مزدوری کرتے کرتے قدرت نے اس کو ذہانت کے ساتھ ساتھ شوق بھی پیدا کیا اور سارے امتحانات پرائیویٹ پاس کرتا رہا۔یہاں تک کہ ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی ہوگیا اور محکمہ تعلیمات میں ہیڈ آف دی اسکول ہوگیا۔کئی لوگوں کو پی۔ایچ۔ڈی کرا چکا ہے۔ میں تو اسے دعائیں ہی دیتا ہوں روز شام میرے ساتھ ہی چائے پیتا ہے اللہ اس کی عمر دراز کرے۔

میں نے کچھ کتابیں اس پر لکھی ہیں اور مرتب بھی کی ہیں وہ کتابیں تم نے ضرور پڑھیں ہونگیں۔ابھی حال میں میری ایک کتاب ''اور بکھرے شیرازے'' کے نام سے شائع ہوئی ہے جس کو میں Surface ڈاک سے تمکو بھیجوں گا۔باتیں بہت غیر ضروری لکھ گیا تم بور ہوگئی ہوگی۔

ایک مضمون ٹوٹا پھوٹا تم کو تھوڑا پڑھکر لکھا ہے۔تمہیں پڑھا تو بہت ہی پیار آیا ہمت کر کے لکھ رہا ہوں معاف کرنا بیٹا میری آنکھیں نم ہو جاتی ہیں جب ایسی پیاری بچیوں سے بات کرتا ہوں میری بھی ایک ہی بچی ہے جس کو دیکھنے روز اس کے پاس جاتا ہوں۔

اچھا میں تو رام کہانی لکھتا ہی جاؤں گا اور تم خیال کر رہی ہوگی عجب آدمی سے واسطہ ہوا اللہ کرے کہ تمکو یہ میری لکھی ہوئی سطریں ملجائیں۔اپنی خریت اور ملنے کی رسید بھیج کر میری انتظار کی گھڑی روکنا۔دعا گو

محمد توفیق خان

(سرونج' بھارت)

محترمہ پروین شیر صاحبہ' سلام ورحمت!

برادرم افتخار امام صدیقی کے ذریعے آپ کی والدہ محترمہ کی رحلت کی اطلاع نے ملول کیا۔ادبی وفنی رشتے سے آپ کے اس غم میں دلی طور پر شریک ہوں۔ یہ سانحے ہمارے لئے ایک دردِ مشترک ہی ہوتے ہیں۔جب ساعتِ غم کا غبار تہہ نشیں ہو جاتا ہے تو درد کی ایک اور پرت دل کے نہاں خانے میں جم جاتی ہے اور ہماری شخصیت میں گداز اور گسک کی catharsis کی ایک جہت اور پیدا ہو جاتی ہے۔خدا مرحومہ کی روح کو آسودہ رکھے، مغفرت فرمائے اور آپ کو اور اہلِ خانہ کو صبر عطا کرے۔میری بیوی فریدہ اور بیٹی نائلہ سعید بھی آپ سے اظہارِ تعزیت کر رہی ہیں۔

مختلف رسائل میں آپ کی تخلیقات برابر پڑھنے کو ملتی ہیں۔متوجہ کرتی ہیں اور حظ اندوز بھی۔بعض رسائل میں ہم لوگ ساتھ بھی چھپتے ہیں بلکہ ہم ورق بھی ہوتے ہیں۔آپ کبھی بمبئی تشریف لائیں تو آپ سے ملاقات کی مسرت حاصل ہوگی۔گزشتہ دنوں آپ کے دہلی آنے کی اطلاع ہوئی تھی۔

دعائے خیر کے ساتھ۔

مخلص

عبدالاحد ساز

(ممبئی' بھارت)

ایک آئینۂ زیست!

پروین شیر

نومبر ۱۷۸۵ء کی سرد ہواؤں میں اسکاٹ لینڈ کے ایک چھوٹے سے گاؤں Alloway میں ایک چھبیس سال کا غریب کسان اناج اُگانے کی کوشش میں زمین کھود رہا تھا۔ اس کا مضبوط کھدال۔۔۔ اپنے فولادی ہاتھوں سے زمین پر وار کر رہا تھا اور اُس کی تہوں تک پہنچ رہا تھا۔ یکا یک اس نوجوان کا شتکار نے ایک کمزور چوہے کو دیکھا جو گہرے خوف کے سمندر میں ڈوبا کپکپا رہا تھا جس کا چھوٹا سا مٹی کا گھر اس بے رحم کھدال کے وار سے ٹوٹ کر بکھر گیا تھا۔ وہ چوہا بے گھر، غیر محفوظ ہو کر یخ بستہ ہواؤں کی زد میں آ کر کانپ رہا تھا۔ اُس کی زندگی اب مفلوج ہو کر رہ گئی تھی۔ اس سانحے نے ایک غریب کسان کے سامنے قدرت کے نظام اور زندگی کی سچائی کو لا کھڑا کیا۔ اس نوجوان کا نام تھا روبرٹ برنس (Robert Burns)۔ وہ عظیم شاعر جس نے اس واقعہ سے متاثر ہو کر ۱۷۸۵ء میں نظم ''To a Mouse'' کہی۔ جو زندگی کا آئینہ ہے۔ اور پھر اس نظم سے متاثر ہو کر John Steinbeck (نوبل پرائیز وِنر) نے ۱۹۳۷ء میں اس موضوع پر ناول لکھا جس کا نام اسی نظم کی ایک سطر سے لیا '' Of mice and men'' گویا یہ نظم برنس کی آنکھوں سے ٹپکا ہوا آنسو کا قطرہ تھا جس میں زندگی کی سچائی کا سمندر سما گیا تھا۔ برنس کیلئے اپنی بقا کی کوشش کسی کی فنا کا سبب بن گئی۔ قدرت کا یہ بھی نظام ہے Survival for the filtest۔ اُس چوہے نے ایک عرصہ کی کٹھن محنت کے بعد اپنا گھر بنایا تھا۔ تحفظ کے خواب دیکھے تھے۔

تاب ناک مستقبل کی تیاری چوہے اور ہم دونوں ہی کرتے ہیں۔ انسان اور چوہے یکساں زندگی جیتے ہیں۔ خواب بنتے ہیں لیکن ایک ہی جھٹکے میں وہ اُدھڑ جاتے ہیں۔ اُمیدوں کے عالی شان محل تعمیر کرتے ہیں اور آندھیوں کی زد میں آ کر ڈھے جاتے ہیں تو ہم انسانوں میں اور چوہوں میں کتنی مماثلت ہے۔ ایک ہی دنیا، ایک ہی بقا کے مسئلے اور اُس کا بوجھ، وہی مستقبل کی تابانیوں کی اُمیدیں۔ وہی آندھیاں اور اُس کے وار کرتے ہوئے خنجر، وہی برفیلے موسموں کے خراش ڈالنے والے لانبے، نوکیلے ناخن وہی غم کے سیاہ بادلوں میں چھپتی ہوئی خوشیوں کی چاندنی۔۔۔ بقول برنس:

But mousie, thou art no thy lane
in proving foresight may be vain:
The best laid Scheme o'mice an' men
Gang aft agley,
An' lea'e us nought but grief an' pain For promis'd joy!

تقریباً دو سو پچیس برس قبل برنس نے یہ نظم کہی تھی۔ لیکن ہم آج بھی اُسی خوف اور بے یقینی کے جنگل میں بے اماں بھٹک رہے ہیں ہر صبح آس کے اُفق پر خواب کا سورج سر اُٹھاتا ہے اور ہر شام آنسوؤں کے سمندر کی تیز لہروں میں لہولہان ہو کر سر جھکائے ڈوب جاتا ہے۔ ہر رات یقین کے گھر میں اُمید کا چاند دبے پاؤں روشن دان سے کُود کر آتا ہے لیکن کڑوے سچ کی سیاہی اُسے نگل لیتی ہے۔ دو سو پچیس برس پہلے روبرٹ برنس اور وہ چوہا بے بسی کی دیواروں میں قید تھا۔ آج بھی ہم انہیں دیواروں میں مقید ہیں۔ وقت بوڑھا ہو گیا ہے لیکن ان کی سنگلاخ، لاچاری کی اونچی فصیلوں میں بند ہم سب کمزور چوہوں کی طرح باہر نکلنے کی کوشش رائیگاں میں ان سے ٹکرا کر منتشر ہو جاتے ہیں اور بوڑھا وقت زیرلب مسکراتا رہتا ہے۔ ہم ہمہ وقت تمناؤں، اُمیدوں اور خوابوں کے گھروندے بناتے رہتے ہیں۔ اُنھیں یقین کی دھنک، تتلیوں اور پھولوں کی حسین رنگوں سے سجاتے رہتے ہیں لیکن یہ گھروندے تلخ حقیقت کے تیز سیلاب کے ہاتھوں ٹوٹ بکھر کر بہہ جاتے ہیں۔ ہم تہی دامن، بے اماں، تند، یخ بستہ ہواؤں کی زد میں کانپتے رہ جاتے ہیں۔ جس طرح برنس کے کھدال نے چوہے کے گھر کو ڈھا دیا۔ لیکن برنس کا اُس چوہے کو یہ کہنا کہ:

Still, thou art blest, compar'd wi' me!
The present only toucheth thee
But Och! I backward cast my e'e,
On prospects drear!
An' forward, tho' I canna see,
I guess an' fear!

تو پھر انسانوں سے زیادہ چوہے خوش نصیب ہیں جو صرف حال میں جیتے ہیں جبکہ ہم انسان۔۔۔ ماضی کے درد اور انجانے اور ان دیکھے مستقبل کی بے یقینی کے خطرے سے لرزتے رہتے ہیں۔ ''کاش'' اور ''شاید'' کے جال میں الجھے ہوئے۔ تذبذب کے سمندر میں ڈوبتے ابھرتے ہوئے۔ دور مستقبل کے آسمان کی ہتھیلی پر اُمیدوں کے ستاروں کی لکیروں کو تکتے ہوئے۔ گئی رتوں کی یادوں کے درد کے شکنجے میں جکڑے ہوئے۔ حسین فردا کے شک کی زنجیروں سے بندھے ہوئے۔ ''شاید'' کے غبار میں ڈوبے ہوئے۔ ہم ماضی اور مستقبل کے قیدی ہیں۔ حال سے آزاد۔ وسوسے کے دائرے میں مقید کہ نہ جانے کیا ہوگا۔ سوالات، اُلجھنیں، یقین اور بے یقینی سے سہمے سہمے۔ ماضی کو مڑ مڑ کر دیکھتے ہوئے جہاں پچھتاوے، نارسائیاں، غلطیاں، ناکامیاں، خوابوں کی کرچیاں اور تہی دامانیاں کچوکے لگاتی رہتی ہیں۔ ان کے گہرے سمندر میں ڈوب کر حال کے ساحل کو بھول جاتے ہیں۔ زندگی کو جانتے نہیں جینے کی تیاری ہی کرتے کرتے بے نشاں ہو جاتے ہیں۔ اور چوہے؟ مستقبل کے خوف اور ماضی کے درد سے پرے ہوتے ہیں۔ حال کی بانہوں میں سمٹ کر جینا جیتے ہیں۔ نہ ماضی کی چبھن نا مستقبل کے وسوسے۔ تو کیا انھیں کمزور سمجھنے والے انسان ان سے برتر ہیں؟ ان سے بہتر ہیں؟ ان سے زیادہ خودمختار ہیں؟ ان سے زیادہ محفوظ ہیں؟ ان سے زیادہ قوی اور توانا ہیں؟ ان سے زیادہ خوش حال ہیں؟ ان سے زیادہ خوش نصیب ہیں؟۔۔۔ نہیں۔۔!

براہ راست

ہر چند ہمارا دل، دماغ اور قلم لحہ بہ لحہ، نئی بات اور نئے خیال کو گرفت میں لینے کے لیے بے چین و بے قرار رہا کرتے ہیں۔ کبھی کبھی کوئی موضوع، کوئی نکتہ، کوئی پہلو ایسا بھی دَر آتا ہے جس کی تفہیم پہلے سے کہی بات، بہتر انداز میں کرتی ہے!

ہمارے خیال میں محترمہ پروین شیر کے تعارف میں کچھ نیا کہنے سے بہتر ''بہار اپنا تعارف آپ ہے'' کی مدد سے پروین صاحبہ کی جستجو، لگن اور اضطرار کو آپ سے متعارف کرانا زیادہ مناسب ہے!!

ذیل کے صفحات میں پروین صاحبہ کی شخصیت وفن کی نسبت معروف ومقتدر اہلِ قلم نے وہ سب کچھ رقم کر دیا ہے جو ایک حقیقی فنکار کے فنّی اثبات کے لیے لازم تصور ہوتا ہے۔ ہمارے خیال میں پروین صاحبہ کی تخلیقات اپنا تعارف آپ اور زندگی سے بھرپور مثبت اندازِ زیست اس امر کی گواہی دے رہا ہے کہ پروین صاحبہ کے دل، دماغ میں سلگتی تخلیقی لَو روشن تر شمع بن کر اردو ادب کو منوّر کرتی رہے گی!!!

گلزار جاوید

☆ بیشتر خواتین اہلِ قلم کی طرح آپ کے ہاں بھی کم سنی میں تخلیقی جوہر دریافت ہونے کی اطلاع ہے۔ آپ ہمیں ان حالات وواقعات سے آگاہ کیجیے جن کے زیرِ اثر آپ کے جذبات واحساسات میں تغیر وتبدل رونما ہوا؟

☆☆ فطرت کی جلوہ سامانیاں اور تقاضِ حیات کی بدصورتی نے محسوسات کی مٹی میں تخلیق کا بیج بویا۔ اس سوال نے ماضی کے کئی دریچے کھول دیے ہیں۔ آنکھوں میں قطرہ قطرہ برسوں پرانی یادوں کی بوندیں ٹپک رہی ہیں۔ دریچے سے جھانک کر دیکھوں چھ سال کی بچی سرِ شام چھت پر گھنٹوں تنہا کھڑی تکتی ہوئی بے کراں آسماں کے کینوس پر نقش بناتے حسیں شہاب، دور اُفق پر درختوں کی Silhouette اپنے آشیانوں کی طرف اُڑتے پرندوں کی قطاریں.....اور پھر رات گئے 'آنگن'، شبنمی گلاب اور بیلے کی پنکھڑیوں پر تیرتے ان گنت چاند' اُس وقت کہیں دور سے مدھر نغموں کی مدھم آواز' گھر کے سامنے گھنا نیم کا درخت اور چاندنی میں چمکتے' لہراتے پتوں کی سرسراہٹ' گرمیوں کی ہلکی ٹھنڈی ہوا' فلک کی مانگ میں کہکشاں کی افشاں چاند اور بادل کی آنکھ مچولیاں رفتہ رفتہ ان سبھوں نے مل کر.....میرا ہاتھ تخلیق کے ہاتھوں میں دے دیا۔ قدرتی مناظر میں جذب ہو کر خود کو بھول جانے کی عجیب کیفیت.....میری تخلیقی نمود فطرت کی رہین منت ہے۔

ماضی کا دوسرا دریچہ وا ہوا ہے۔ اُس بچی کے حساس دل کو دیکھ رہی ہوں جو ہمیشہ پیروں تلے ہریالی اور اپنے اردگرد ہم عمر کچھ بچوں کے قدموں تلے پتے ہوئے پتھر اور اُن کے رِستے ہوئے تلوے دیکھ کر کراہ اُٹھتی۔ اپنی ریشمی اور اُن کی بوسیدہ' پیوندلگی پوشاک دیکھ کر سوچ میں ڈوب جاتی۔ سوالات کے کانٹے زخمی کر دیتے۔ سردیوں میں کپکپاتے گرمیوں میں جلتے جسم' اُن کے گندے' اُلجھے ہوئے بال میری زندگی کو اُلجھا دیتے۔ درد کی انگلیاں تخلیق کی بند پلکیں کھولتیں ایک آنکھ زندگی کے بے پناہ حسن' سے سرشار تو دوسری اس کی اندوہناک بدصورتی سے سسکنے لگتی۔

سانحہ تھا والد کی وفات..... جو پانچ سال کی معصوم عمر نے جھیلا وہ ماں کا اُجڑا ہوا چہرہ' سونی کلائیاں' حسین رنگوں کی جگہ بے رنگ لباس' ان کی آنکھوں سے بہتے آنسو میرے قلم کی رگوں میں سرایت کر گئے۔ اُن کی اذیت کے رنگ میرے موقلم میں اُتر گئے۔

☆ والد کی وفات کے بعد آپ کی تعلیم' تربیت اور شخصیت کی تعمیر میں کن شخصیات کا زیادہ دخل ہے اور کیا آپ باقاعدہ کسی کو رہبر ورہنما یا استاد مانتی ہیں؟

☆☆ زندگی کے ننھے پودے کو شجر بنانے میں کئی شخصیات نے دھوپ' پانی' ہوا اور زرخیز مٹی کا کام کیا۔ عمر کا سب سے اہم حصہ اس کی شخصیت کی شکل بنانے یا بگاڑنے میں شروع کے چھ سال ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے میرے والد (سید فضل اللہ قادری) سب سے زیادہ اہم رہے۔ وہ ایک فلسفی اور عظیم دانشور تھے۔ دردمند اور غریب پرور جاگیردار تھے۔ انسانیت کی باتیں کرتے اور زندگی کا مطلب سمجھاتے۔ ان کے کتب خانے میں ہزاروں فلسفے کی کتابیں تھیں جو اب خدا بخش لائبریری کی زینت ہیں۔ والد کی وفات کے بعد والدہ (شکیلہ قادری) ماں بھی تھیں اور باپ بھی۔ انھوں نے مضبوط کردار اور اعلیٰ قدروں سے روشناس کیا۔ یہ بتایا کہ عورت ماں ہے۔ زمین کی طرح سب کچھ بانہوں میں سمیٹ کر ان کی حفاظت کرتی ہے۔ اپنی ذات میں دوسروں کے دکھ جذب کر لیتی ہے۔ ان میں بھی ادبی ذوق اس قدر تھا کہ کئی اعلیٰ ادبی رسالے گھر میں آتے تھے۔ بچپن سے ہی میں کتابوں میں گھری رہی۔ میری تعلیمی اور میرے اندر خوابیدہ فنکار کو جگانے میں میرے بڑے بھائی ڈاکٹر سید شمس الضحیٰ' (ادبی نام۔ عارف عظیم آبادی Scientist شاعر وادیب) نے اہم کردار ادا کیا۔ دوسرے بھائی ڈاکٹر سید نورالہدیٰ (اردو ادب کے گرویدہ اور کلاسیکل موسیقی کے دلدادہ) نے میری شخصیت کی تعمیر میں بہت کاوشیں کیں۔ میرے خالو پروفیسر اختر اورینوی (معروف ادیب اور تنقید نگار) مجھ سے مختلف موضوعات پر مضامین لکھواتے۔

اردو میں بہترین ریزلٹ لانے پر انعامات سے نوازتے۔ میرے نانا.....ڈاکٹر سید محمد محسن (بین الاقوامی شہرت یافتہ ماہر نفسیات اور ادیب) کی صحبت نے بھی میرے ادبی ذوق کو فروغ دیا۔ بچپن سے ان کا مشہور افسانہ ''انوکھی مسکراہٹ'' جس کا ترجمہ کئی زبانوں میں ہوا تھا میرے ذہن و دل پر نقش ہوگیا۔ یہ ایک غریب گورکن کی بچی کی نفسیاتی کہانی ہے کہ جب کسی کی موت ہوتی تب اُسے کھانا نصیب ہوتا۔ کسی کی موت اُس بچی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لے آتی۔ اس کہانی نے میرے اندر دوسروں کے کام آنے کا جذبہ پیدا کیا۔ بچپن ہی سے ان قدآور شخصیات کی دانشوری کے شجر نے مجھے سطحی دنیا کی دھوپ سے بچائے رکھا۔ تخلیقی جذبات کو مہمیز کیا۔ پھر کینیڈا وہ بھی دور دراز دنی پیگ کیا آئی جیسے دوسرے سیارے پہ آ گئی۔ نہ کوئی اردو بولنے والا نہ اُردو کی کوئی کتاب۔ لیکن قلم اور کاغذ تو تھا۔ اپنوں سے جدا ہونے کی افسردگی کاغذ پر بکھیرتی رہی۔ جہاں تک فنون لطیفہ میں رہبر' رہنما یا استاد کا سوال ہے تو فنکار پیدا ہوتا ہے۔ ہاں! Skill دنیا میں آ کر سیکھتا ہے۔ جیسے ظاہری حسن نکھارنے کے لیے کسی عورت کو غازہ لگایا جائے۔ اس لئے کہ میری پہلی نظم برسوں پہلے بغیر کسی رہبری' رہنمائی اور اُستاد کے رسالہ شمع میں ۱۹۸۰ء میں شائع ہوئی تھی۔ میری پہلی مصوری کو بھی بغیر کسی ٹریننگ حاصل کئے ایوارڈ ملا تھا۔ اور آٹھ سال کی عمر میں جب ہاتھوں میں ساز تھاما (بینجو) تو بغیر کسی سبق کے نغمے اُبل پڑے تھے۔ کسی بھی گانے کی دھن بہ آسانی نکل آتی تھی۔ کینیڈا آ کر بڑی مشکلوں سے ایک کتاب نکات عروض حاصل کی اور کبھی کبھی مشق سخن کرتی رہی۔ ۲۰ سال قبل یہاں بھی مشاعرے ہوتے تھے۔ انُ میں حصہ لیتی رہی۔

واشنگٹن علی گڑھ ایسوی ایشن مشاعرہ کے دعوت نامہ پر اپنا کلام سنانے کے بعد ایک ایسی مشہور شخصیت سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا جن کی کہانیاں بچپن سے بیسویں صدی اور شمع رسالوں میں پڑھتی رہی تھی۔ وہ تھے جناب ستیہ پال آنند صاحب۔ حیرت انگیز خوشی سے دوچار ہوئی۔ ان کی حوصلہ افزائی اور مشورے بہت سودمند ثابت ہوئے تھے۔ انھوں نے مجھے ایک کتاب بھیجی تھی جس کا نام ''رسالہ استادِ شاعری'' ہے۔ یہ میرے مشق سخن کے لیے بے حد مفید ثابت ہوئی۔

یہاں انگریزی کے ادیب جناب ڈاکٹر ٹوم ڈف اور ڈاکٹر گورڈن لو (Gordon Love) نے بھی میری حوصلہ افزائی کی اور سراہا۔ زندگی کے ٹیڑھے میڑھے راستوں پر میرے رہ نما میرے رفیق حیات وارث شیر ہمیشہ رہے۔ یہ میری خوش قسمتی ہے۔ کون کیا ہے..... کس کے چہرے پہ کتنے چہرے ہیں' لوگوں کو کیسے پرکھنا چاہیے یہ سب میں نے ان سے ہی سمجھا اور سیکھ پائی۔

☆ پاکستان کب' کس عمر اور کس سبب جانا ہوا' وہاں آپ کا کس قدر وقت گزرا اور اُس کی بابت آپ کے احساسات کیا ہیں؟

☆☆ میرے سب بھائی بہن' چچا اور ان کا پورا خاندان پاکستان ہجرت کر گئے تھے۔ والدہ کو جائیداد کے سلسلے میں کچھ سال ہندوستان رکنا پڑا۔ میں والدہ کے ساتھ رہی۔ پاکستان آنا جانا ہوتا تھا وہاں کچھ وقت گزرتا کچھ ہندوستان میں۔ ظاہر ہے میرا خاندان پاکستان میں تھا تو مجھے وہاں جا کر روحانی خوشی ہوتی۔

☆ اب باری کینیڈا روانگی کے وقت اور جواز کی ہے؟

☆☆ بہت کم عمری میں یہاں تعلیم اور شادی کی وجہ سے آنا پڑا۔

☆ سنا ہے! وارث صاحب کو مشرقی اور بہاری بنانے میں آپ کو سخت محنت کرنا پڑی۔ وارث صاحب نے بھی یقیناً آپ کی شخصیت وفن کو نکھارنے وسنوارنے میں اہم کردار نبھایا ہوگا کچھ احوال اس کا بھی سنایئے؟

☆☆ وارث نے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کی۔ ہر قدم پر ساتھ دیا۔ میری ہر کامیابی پر فخر کیا۔ ریاضی اور فنون لطیفہ دو متضاد شعبے ہیں لیکن پھر بھی وہ ہمیشہ میری مصوری کی نمائش اور ادبی محفلوں میں میری خاطر میرے ساتھ گئے۔ کبھی کوئی رکاوٹ نہیں ہوئی۔ اس معاملے میں بہت خوش نصیب ہوں۔

☆ اپنے پسندیدہ تخلیقی وقت' ماحول اور مزاج کی بابت کچھ بتلایئے؟

☆☆ مصوری کے لیے روشن لمحے۔ جب سورج کی نرم کرنیں دبے پاؤں آ کر میرے اسٹوڈیو میں جگمگاتی ہیں اور کھڑکی سے باہر برف کی نازک پنکھڑیاں آسمان سے لہراتی ہوئی اُترتی ہیں یا پھر موسم بہار کی ہوا میں درختوں کی سرسراہٹ کے نغمے تخلیقیت کو مہمیز کرتے ہیں۔ میرے قلم سے میری ملاقات تب ہوتی ہے جب دنیا خوابیدہ ہوتی ہے اور رات بیدار۔ جب چاندنی آہستہ سے میرے بستر پر قدم رکھتی ہے اور میری آنکھوں کو چوم لیتی ہے۔ باہر برف کے ذرّوں میں لاکھوں چاند چمکتے ہیں یا موسم گرما کی ہلکی ٹھنڈی ہوائیں چاندنی میں ڈوبے پھولوں سے چھیڑ خوانی کرتی ہیں۔ میرا تخلیقی وقت صرف تنہائی چاہتا ہے اس دنیا میں دوسری دنیا پیدا ہوتی ہے۔ رات کی گہری تنہائی.....کھڑکی سے باہر ایک خوابناک فضا..... میں اور میرا قلم و کاغذ.....دن کے روشن اجالے، قدرت کے حسین نظارے، C.D پلیئر سے نکلتی مدھر نغموں کی آواز۔ میں، میرا موقلم اور کینوس.....!

☆ خوبصورتی کی بابت آپ کا نظریہ کیا ہے؟

☆☆ ایک نوزائیدہ بچے کی مسکراہٹ، کسی کی آنکھوں سے جھانکتا اٹوٹ پیار، آنگن میں کھلے گلاب پر چمکتا چاند، پتوں پر جھلملاتا شبنم کا قطرہ، خوشی کا احساس، لمحۂ سکون اور وہ سب کچھ جو انوکھے تجربے کی راحت سے سرشار کردے خوبصورتی ہے۔

☆ محبت کی نسبت آپ کے ذہن میں کس قسم کا تصوّر پایا جاتا ہے؟

☆☆ جیسے خوشبو کی وضاحت الفاظ میں ممکن نہیں اسی طرح محبت بھی ہے۔ یہ وہ ساز ہے جس کے تاروں کو مناسب انگلیاں چھیڑیں تو خوبصورت نغمے اُبل پڑتے ہیں۔ یہ خوشی کی بوند ہے جو اپنے نوزائیدہ بچے کی سب سے پہلی مسکراہٹ دیکھ کر ماں کی آنکھوں سے ٹپک جاتی ہے۔ یہ وہ رشتہ ہے جو پانی اور شکر کا ہے کہ جب دونوں ملتے ہیں تو ایک ہو کر نئی پہچان میں ڈھل جاتے ہیں۔ یہ وہ آنکھ ہے جو دل کی گہرائی میں اُترتی ہے صرف چہرے پر نہیں۔ یہ روحانی خوشی کا مدار ہے۔ غیر مشروط اٹوٹ بندھن ہے، یہ زندگی کی تکمیل ہے، یہ زندگی ہے.....!

☆ کچھ تفصیل خوشی اور ملال کے لمحات کی بیان فرمایئے یہ کیفیت کب کب اور کیونکر وارد ہوتی ہے اور اس سے نجات کا کیا طریقہ اختیار کرتی ہیں؟

☆☆ خوشی کے لمحات..... جب پہلی بار اپنے نوزائیدہ بچے کو تھاما۔ جیسے میرا دل میری گود میں آ گیا اس تکمیل کی سرشاری کا احساس۔ ہلکی ہواؤں کا نرم لمس، بادلوں سے سنائی دیتے خاموش نغمے، دور اُفق پر بسی رنگین دنیا کے حسین نظارے، کسی بے بس کے آنسوؤں کو مسکراہٹ میں بدل دینے کے تجربے، دیوار جاں کے اندر جھانکتی کسی ایکسرے آنکھوں سے سچے پیار کو پانا ہی روحانی خوشی کے لمحات ہیں میرے لیے۔

ملال کے لمحات..... جب کسی پر خود سے بھی زیادہ اعتماد کیا اُسی نے اتنے زخم دیے جن کا حساب رکھنا بھی مشکل تھا۔ جب میرے خلوص پر شک کیا جاتا ہے۔ مجھے وہ سمجھا جاتا ہے جو میں نہیں ہوں۔ ان سدا بہار زخموں کو ریشمی کپڑوں سے چھپائے رکھتی ہوں۔ کبھی تند ہواؤں سے یہ سرک جاتے ہیں، ان پر نظر پڑتی ہے تو غم کے سمندر میں ڈوب جاتی ہوں۔ ان سے نجات؟..... احساسات کے پھول قرطاس کی زمین پر کھلانا۔ کینوس پر جذبات کی دھنک کے رنگوں کو بکھیرنا۔ تخلیقیت کی دنیا میں کھو جانا۔

☆ دل مشرقی' دماغ مغربی والی کیفیت کا آج کل کیا حال ہے اور آپ کی تخلیقات پر اس صورت حال کا کیا اثر ہوتا ہے نیز ہمارے قارئین کو اس دل کی کارستانیوں سے بھی آگاہ کیجیے جو آپ کے دماغ میں واقع ہے؟

☆☆ دل و دماغ کی کشاکش تو جاری رہتی ہے۔ جب دماغ میں واقع دل مجھ پر حکمرانی کرنے لگتا ہے اور اُس کے آگے جھک جاتی ہوں تو زندگی عذاب الیم ہو جاتی ہے۔ دل مشرقی اور دماغ مغربی.....اور اس کا میری تخلیقات پر اثر ..... اس بارے میں میرا خیال ہے کہ مشرق ہو یا مغرب' شمال ہو یا جنوب' اس کراں سے اُس کراں تک انسانی جذبات یکساں ہوتے ہیں اور تخلیقیت تو جذبوں کا اظہار ہے۔ یہ وہ شجر ہے جو مختلف تہذیبوں کی شاخوں کو اپنے تنے سے جوڑ کر رکھتا ہے۔ کسی عورت کو اسکرٹ بلاؤز پہنایا جائے یا شلوار قمیض اُس کی روح تو وہی رہتی ہے۔ بقول علی سردار جعفری ''مئے بدلتی نہیں بدلے ہوئے پیمانوں سے'' یہ ضرور ہے کہ ناپختہ عمر سے مغرب میں قیام نے دونوں دنیاؤں کو سمجھنے کا موقع فراہم کیا۔ مغربی تہذیب کے تجربے نے ایک عرفان و آگہی عطا کی جس نے مشرقی روایت کے شعور و ادراک سے مل کر میرے کینوس میں وسعت پیدا کی۔ تخلیقی آگ کو نئی روشنی ملی۔

☆ بظاہر پُرسکون ازدواجی زندگی کی حامل شاعرہ کے ہاں تنہائی' اکلاپا و جدائی کے ذکر کے ساتھ تشنگی اور ادھورے پن کا احساس بھی بہت گہرا ہے؟

☆☆ مجھے میری شاعری میں تلاش کرنے والوں کو یہ جاننا چاہیے کہ وہاں میرے علاوہ دوسرے بھی بستے ہیں۔ تخلیق کی بنیاد مشاہدہ بھی ہے۔ کچھ حساس دل دوسروں کے زخم بھی اپنا لیتے ہیں۔

''مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ'' (اقبال)

اس کے علاوہ سوچ و فکر سے تنہائی کے چراغ روشن ہو جاتے ہیں جب تک سوچ کے چراغ کی ضیاء پاشیاں ہیں تنہائی، تشنگی اور ادھورے پن کے چراغ بھی فروزاں رہتے ہیں۔

☆ ایک مکتبہ فکر آپ کے ظاہر و باطن میں جاری جنگ کی نشاندہی بھی کرتا ہے' مثلاً کس قسم کی جنگ ہے یہ اور اس کا جواز کیا ہے؟

☆☆ میرے خیال میں ظاہر و باطن کی کشمکش ہر زندگی کا حصہ ہے۔ کچھ ایسے حالات درپیش آتے ہیں کہ باطن کے خام جذبوں کو اگر ظاہر قابو میں نہ کرے تو زندگی کا توازن برقرار نہیں رہتا۔ دوسروں کی خوشی کے لیے باطن کا گلا گھونٹنا اور ظاہر کو جیت دلانا ضروری ہوتا ہے۔ باطن کی ضد کو توڑ کر' ظاہر کو بچا کر اپنی بقا حاصل ہوتی ہے۔ ایک اچھا فنکار دردوں اور بیروں کے درمیان تفادات کو انگیز کر کے زندگی کو خوش رنگ بنانے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ خود پرستی سے پرے فلاح انسانی کے لیے نئی راہیں تلاش کرتا رہتا ہے۔ ذاتی خواہشات کو قابو میں رکھے بغیر تہذیب کا تحفظ نہیں کیا جا سکتا۔

☆ بہت سے احباب آپ کے بارے جلد باز' جذباتی اور متلون مزاج ہونے کا تاثر کیوں قائم کیے ہوئے ہیں؟

☆☆ میرے خیال میں اس سوال کے جواب کے لیے آپ کو اُن اصحاب سے رجوع کرنا چاہیے جنھوں نے یہ رائے قائم کی ہے۔ وہی آپ کو بہتر طور پر بتلا سکتے ہیں کہ اُن کے تاثر کی بنیاد کیا ہے۔

☆ آپ کے بارے رومانی شاعرہ کا ذکر کثرت سے کیا جاتا ہے اور یہ بھی غالباً اردو شاعری میں پہلی بار ہوا ہے کہ صنف نازک کی نمائندہ شاعرہ کو معشوق کے بجائے عاشق سے موسوم کیا گیا؟

☆☆ جی نہیں یہ اُردو شاعری میں پہلی بار نہیں ہوا۔ عبداللہ جاوید صاحب نے پروین شاکر کے اس شعر کے حوالے سے اُنھیں معشوق کے بجائے عاشق سے موسوم کیا ہے۔

کوئی چاہے نہ تمہیں میری طرح
اب کسی سے محبت نہ کرنا

اور اس سے نہ رہی کوئی طلب
بس مرے پیار کی عزت کرنا

سوال یہ ہے کہ عورت صرف معشوق ہی کیوں ہوسکتی ہے؟ عشق کے مقدس عمل کی تفہیم میں جنس کوئی معنی نہیں رکھتی اور اس عمل کو صرف حسن و عشق تک ہی کیوں محدود رکھا جائے؟ زندگی کے کئی معاملات میں ہم سبھی کہیں عاشق ہوتے ہیں اور کہیں معشوق۔ عشق اگر خالص انسانی جذبہ ہے تو عورت کا بھی حق ہے۔ جذبۂ عشق تو انسانی شخصیت کا جز ہے۔ جہاں تک رومانیت کا تعلق ہے تو بیشتر ناقدین نے میری شاعری کے موضوعات تشبیہ واستعارات اور نظموں کی موسیقیت کو رومانویت سے موسوم کیا ہے۔ انسانی جذبہ عشق اُس وقت سے فعال ہے جب سے انسان نے اس کے معنی سمجھے۔

☆ کچھ روشنی ان خواب کی نسبت ڈالیے جن کے ٹوٹنے کا خوف یا غم آپ کے ہاں شدت سے نمایاں ہے؟

☆☆ بے شمار ہیں۔ کن کن پر روشنی ڈالوں؟ ابدی رشتوں کے خواب' خوبصورت انسانیت کے خواب' لامتناہی محبت کے خواب..... اکثر آدھی زندگی خواب دیکھنے میں گزرتی ہے اور باقی اُسے بکھرتا دیکھنے میں۔

ہر فنکار بنیادی طور پر خواب دیکھتا ہے۔ اپنے عصر کے روح فرسا حقائق وحادثات کے بالمقابل وہ جہان نو آباد کرتا ہے معنوی سطح پر۔ جہاں انسانی اقدار اور رشتوں کا تقدس پائمال نہ کیا جارہا ہو۔ جہاں ریاکاری نہ ہو' تعصب کا غلبہ نہ ہو۔ خواب کو فنکار کی ذاتی زندگی تک محدود نہیں رکھنا چاہیے۔ کسی خواب کو فنکار کی ذات تک محدود رکھنا' فن پارہ کو تخلیق کار کی آسودگی' نا آسودگی کی ترجمانی گرداننا اس کی معنویت کو محدود کر دیتا ہے۔ بلکہ معنوی سطح پر Fixity اس کی موت کے مصداق ہے۔ فنکار کے خواب ٹوٹ کر بکھرنے کا عمل دراصل آفاقیت کا حاصل ہے۔ میری کئی نظمیں بھی انہیں معصوم خوابوں کے ٹوٹ کر بکھرنے کا المیہ ہے۔

☆ زوال عمر یعنی بڑھاپے کا خوف بھی آپ کو بے کل رکھتا ہے شاید دار الضعفا کا طواف بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے؟

☆☆ قاری آزاد ہے۔ جو چاہے رائے قائم کرلے لیکن یہ بالکل غلط ہے۔ زوال عمر سے نہیں بلکہ رشتوں کے زوال سے خوف زدہ ہوں۔ دکھی ہوں۔ جس سے زندگی کھوکھلی ہوجاتی ہے۔ دار الضعفا میں بھی اُنھیں ٹوٹے ہوئے رشتوں سے ٹوٹی پھوٹی زندگیوں کی خاموش کراہیں گونجتی ہیں وہاں جا کر اُن کی تنہائیوں کے زخم پر انسانیت کے رشتے کا مرہم لگانے کی کوشش کرتی ہوں۔ جواب جھرّیوں کے جال میں قید ہیں۔ ان کے بوسیدہ بدن اکیلے پن کی ٹھنڈک سے لرزیدہ اُس ماضی کو ترستے ہیں جب رشتوں کی نرم وگرم آغوش میں محفوظ تھے۔ لیکن رشتوں کے شیشے وقت کے پتھر سے ٹکرا کر چکنا چور ہوجاتے ہیں۔

☆ خواتین شاعرات کے تخلیقی جوہر کی نسبت بہت سے حلقوں میں اکثر شکوک وشبہات کا اظہار کیا جاتا ہے! آپ کو کبھی اس قسم کے سوال کا سامنا ہوا تو آپ کا ردِعمل کیا ہوگا؟

☆☆ شک وشبہات کا عذاب خواتین شاعرات ہی پر کیوں نازل ہوتا ہے؟ یہ تو مردوں کے متعصابہ ذہن کا مظہر ہے۔ دوسرا سچ یہ بھی ہے کہ ایک گندی مچھلی پورے تالاب کو گندا کر دیتی ہے۔ مشاعروں میں پڑھنے والی متشاعرات کے متعلق جب پہلی بار سنا تو انگشت بدنداں رہ گئی۔ لیکن ایک ہی لاٹھی سے سبھوں کو ہانک دینا کہاں کا انصاف ہے؟ ایک کرے اور دس بھریں۔ اگر مجھے اس قسم کے سوال کا سامنا ہوا تو غم وغصہ کی جگہ سوال کرنے والے کی تنگ نظری پر اُس سے ہم دردی ہوگی۔ ان کی ذہنی حالت زار پر کف افسوس مل کر رہ جاؤنگی۔

☆ آپ کو دکھ کی شاعرہ کہنے والے فیشن کے طور پر یہ بات کہتے ہیں' معاملہ اگر سنجیدہ قسم کا ہے تو اس پر گفتگو ضروری ہے؟

☆☆ مجھے اس کا علم نہیں تھا کہ اتنی سنجیدہ بات فیشن کے طور پر بھی کہی جا سکتی ہے۔ لیکن یہ سچ ہے کہ مجھے سسکتے دلوں کے زخم رلاتے ہیں۔ غیر متوازن نظام بے چین کرتا ہے۔ الم ناک حقائق افسردہ کرتے ہیں۔ جبر واستبداد' بے کیف رشتوں کی اُلجھنیں' رشتوں کے تقدس کی پائمالی مجھے توڑتی ہے۔ خوابوں کی کرچیاں زخمی کرتی ہیں۔

☆ کچھ لوگ آپ کو منفی صورت حال سے ٹکرانے والی شاعرہ بھی گردانتے ہیں مگر منفی حالات کی نشاندہی نہیں کرتے؟

☆☆ زندگی میں مثبت اور منفی دونوں حالات پیچھا کرتے رہتے ہیں۔ جو سامنے آکر ٹکراتا ہے اُس کی ترجمانی کرتی ہوں۔

☆ آپ کا تخلیقی سفر کسی جستجو اور تلاش کا حامل کیوں لگتا ہے' آخر کس شے کی کمی ہے آپ کے ہاں؟

☆☆ کیا آپ ایک زندگی بھی ایسی بتا سکتے ہیں جہاں کوئی کمی نہ ہو؟ دنیا ارتقاء کی طرف رواں دواں ہے۔ مکمل جہاں مل جائے تو دنیا جنت نہ ہوجائے؟ تکمیل کی تلاش ہر زندگی کو ہے۔

☆ پروین شیر کا مرقع ساز تخیلی شاعری میں دانشوری کی نذر ہوگیا! اس عجیب وغریب رائے کی نسبت قاری کیا نتیجہ اخذ کرے؟

☆☆ عرض کرچکی ہوں..... قاری آزاد ہے جو چاہے نتیجہ اخذ کرلے۔

☆ قاری کو چونکانے کی خواہش بھی آپ کے ہاں بڑی شدومد سے نظر آتی ہے۔ ''پنچ لائن'' کو ہتھوڑے کی طرح قاری کے سر پر مارنے کے لیے آپ بے چین وبے قرار کیوں رہا کرتی ہیں؟

☆☆ میں تو صرف یہ چاہتی ہوں کہ قاری جذبوں کے سمندر میں ڈوب جائے صرف لہروں کا نظارہ نہ کرے۔ اگر ہتھوڑے محسوس ہوتے ہیں تو یہ اُن کے سر کا قصور ہے۔ اپنی دانست میں تو میں کچھ نہیں کرسکتی۔

☆ آپ کی شاعری قاری کو جس قدر آسودگی پہنچاتی ہے اس سے

زیادہ بے چین و بے کل کیا کرتی ہے۔ایک ہی وقت میں پڑھنے والے کو دو ہرے عذاب میں مبتلا کرنا مناسب ہے کیا؟

☆☆ اس سوال کا جواب ایک سوال ہے کہ آپ آسودگی کو بھی عذاب سمجھتے ہیں؟ زندگی دکھ اور سکھ کے تضاد کا نام ہے۔تخلیق ایسی ہو جو دونوں پہلوؤں سے آشنا کرے ورنہ نامکمل رہ جاتی ہے۔میری ایک نظم کی ان سطور میں شاید آپ کو اس سوال کا جواب مل جائے.....

یہ دونوں پاؤں' آنکھیں' کان
دونوں ہاتھ' گرچہ ہم سفر تو ہیں
الگ رستوں کی آوازوں
پہ ان کا دھیان رہتا ہے!
قدم اک ٹھنڈی ہریالی پہ ہے
تو دوسرا تپتے ہوئے پتھر پہ جلتا ہے
مدھر شہنائیاں اک کان میں ہیں
دوسرے میں دکھ بھری چیخیں
اگر اک ہاتھ میں سورج چمکتا ہے
تو اک بجھتا دیا ہے دوسرے میں اور
مسرت کی دمک اک آنکھ میں ہے
دوسری میں غم کی تاریکی.....

☆ اس رائے کی بابت آپ کیا کہنا چاہیں گی کہ آپ اپنی تخلیقات بالخصوص شاعری کو مقصدی بنانے کے لیے بڑے جتن کیا کرتی ہیں' مثلاً وہ جتن کیا ہیں اور اُن کے استعمال سے کس حد تک آپ اپنے مقاصد حاصل کر پاتی ہیں؟

☆☆ کوئی بھی شاعری بنائی نہیں جاتی خود بن جاتی ہے اور نہ اس کے لیے کوئی جتن کی ضرورت ہے الفاظ کے پرندے جذبات کے رنگین پروں کو پھیلائے خود اُڑتے ہوئے آ کر قرطاس کی شاخوں پر بیٹھ جاتے ہیں۔اگر یہ مقصدی نغمے سنائیں تو یہ حالات اور جذبات پر منحصر ہے۔کسی کی بے بسی کے آنسو میرے قلم کی رگوں سے بہتا دیکھ کر کوئی اُنھیں مسکراہٹ میں تبدیل کرتا ہے تو یہ میری کامیابی ہے۔میری شاعری کی ڈور مغرب میں بسنے والے ہم وطنوں کی نئی پود کو اپنی زبان و تہذیب سے باندھ دیتی ہے تو یہ بھی میری کامیابی ہے۔یہ ڈور یہاں کی نئی پیداوار کو بھی باندھ سکی جب یہ قلم اور موقلم ہاتھوں میں ہاتھ دے کر چل پڑے۔الفاظ کے پرندوں کے پروں پر موقلم کے رنگ بکھرے اُنھوں نے جو گیت سنائے وہ ان بچوں کی ماں کی زبان میں بھی تھے اور ان کی زباں انگریزی میں بھی اس لیے اپنے مجموعے (شاعری مصوری' انگریزی ترجمے کے ساتھ) کی اشاعت سے میں نے کافی حد تک اپنے مقصد کو حاصل کر لیا ہے۔

☆ کچھ لوگوں کے خیال کے مطابق اردو ادب کے آپ پر کسی قدر نامہربان رہنے کی ذمہ دار وہ شاعرات ہیں جو آپ کی ہم عصر ہوتے ہوئے آپ سے پہلے زیادہ شہرت' نام اور مقام حاصل کر چکی تھیں؟

☆☆ اگر اپنے مجموعے کی اشاعت کا خیال نہ آتا تو میں آج بھی اردو ادب میں گم نام ہی رہتی۔میری تخلیقات میز کی دراز میں بند رہتیں۔جس کی وجہ تھی کچھ گوشہ نشینی کا سکون کچھ یہاں کی مشینی زندگی۔یہی سچ ثابت ہوا تھا کہ ''تجھ سے بھی دل فریب ہیں غم روزگار کے'' جب فعال ہوئی تو میری قدر دانی میری اُمید سے زیادہ ہوئی۔پہلے مجموعے کو ایوارڈ سے نوازا گیا۔معتبر' اعلیٰ و معروف تنقید نگار' دانشور اور فنکار میری تخلیقات کی طرف متوجہ ہوئے۔اپنے تاثرات سے نوازا۔میرے دوسرے مجموعے (جو ماں کے نام ہے) کو بھی احمد ادیا اردو مرکز انٹرنیشنل ایوارڈ حاصل ہوا جو میرے لیے بہت عزت کا باعث ہے۔اردو ادب مجھ پر بہت مہربان ثابت ہوا۔

☆ بہت سے لوگ آپ کی پروین شاکر' فہمیدہ ریاض اور فیض احمد فیض سے ذہنی قربت کی نشاندہی بھی کرتے ہیں؟

☆☆ اس دنیا کی آبادی تقریباً سات Billion ہے۔سنا ہے کہیں نہ کہیں ہر انسان کی شکل کا ایک دوسرا انسان بھی موجود ہے۔اسی طرح انسانی جذبات میں بھی یکسانیت ہوتی ہے۔میں برسوں سے کینیڈا' وہ بھی وِنی پیگ جیسی دور دراز جگہ میں ہوں۔جب یہاں آئی تھی ایک شخص بھی اردو بولنے والا نہ تھا۔وطن کا کچھ بھی نہ تھا۔اردو کتابیں مصیبتوں سے حاصل ہوتی تھیں۔بدقسمتی یہ ہے کہ میں نے فہمیدہ ریاض کو کبھی پڑھا ہی نہیں۔فیض احمد فیض اور پروین شاکر کو بھی بہت بعد میں پڑھ سکی ایک عہد کے تخلیق کاروں میں جذبات' ایک درد کے جراثیم اور یکساں خیالات کی گونج سنائی دینا واجبی ہے۔ایسا ہر دور میں ہوتا آیا ہے۔اس تجربے سے سبھی گزرتے ہیں کہ کہیں کچھ پڑھا کسی نے کچھ کہا تو ایسا لگا کہ یہ تو اپنے دل کی بات کہہ دی گئی۔

☆ ایک اطلاع یہ ہے کہ آپ انگریزی میں بھی شعر کہتی ہیں! اب تک کس مقدار اور معیار کے اشعار کہہ چکی ہیں اور ان کی بابت احباب کا ردِعمل کیا ہے؟

☆☆ انگریزی میں کم اشعار کہے۔یہاں ایک Poetry Club ہے۔وہاں جب بھی اپنا کلام پڑھا تو لوگوں نے بہت سراہا۔

☆ کیا یہ تاثر درست ہے کہ آپ اردو کی نسبت انگریزی شعراء کے زیادہ نزدیک ہیں اگر درست ہے تو پھر آپ کے پسندیدہ انگریزی شعراء اور آپ کے ہاں اُن کے اثرات کی نشاندہی ضروری ہے؟

☆☆ دونوں سے نزدیک ہوں۔انگریزی شعرا میں جو مجھے بہت پسند ہیں وہ ہیں روبرٹ برنس' پابلو نرودا' کیٹس' شیلی' ورڈس ورتھ' مارگرٹ ایٹ وُڈ وغیرہ خاص کر Mark strand ' Patricia Kathleen page اور Annie Louesa walken لاشعوری طور پر ہر اچھی شاعری اثر انداز ہوتی ہے۔

☆ مشرقی بیٹیاں اکثر والد کے قریب ہوا کرتی ہیں اور انہیں اپنا آئیڈیل بنالیتی ہیں جبکہ آپ نے والدہ کی شخصیت کو اپنے گرد لپیٹا ہوا ہے؟

☆☆ پانچ سال کی تھی جب میرے والد اس دنیا کو چھوڑ گئے تھے۔ اسی لیے میری والدہ ہی میرے لئے سب کچھ تھیں۔ ان کی عظیم شخصیت کے متعلق کچھ کہنا تو سمندر کو قطرے میں رکھنے کی کوشش ہوگی۔

☆ والدہ کی وفات کے بعد کہی گئی قریب پچاس نظموں کو douglas dunn کی انتالیس نظموں سے تشبیہ دی جاتی ہے جو انہوں نے اپنی جواں سال بیوی کی وفات کے بعد لکھی تھیں؟

☆☆ مجھے افسوس ہے کہ Douglas Dunn کو کبھی نہیں پڑھا ہے۔ اب ضرور پڑھونگی۔

☆ آپ کے فنکارانہ برتاؤ کو ''مابعد جدید'' سے منتھی کرنے والے آپ کو کس طرف دھکیلنا چاہتے ہیں؟

☆☆ مختلف ناقدین نے اپنے طور پر رائے دی ہے۔ میں نے کسی ایک ڈائمینشن کی شاعری نہیں کی معنی قائم کرنے کا حق قاری کو ہے۔ میں کوئی فیصلہ نہیں کرسکتی۔

☆ ''ان کا معاشرتی شعور انہیں ترقی پسند شعراء کی صف میں کھڑا کردیتا ہے'' کونسی ترقی پسندی' کیا آپ کسی طور کمیونزم یا سوشلزم کے سحر میں گرفتار رہی ہیں؟

☆☆ انسانیت کا درد رکھنے کے لیے کسی سیاسی نظریہ یا کسی تحریک سے متاثر ہونا ضروری نہیں کسی 'ازم' سے تعلق ہونا ضروری نہیں۔ میں چاہتی ہوں غیر متوازن نظام میں توازن پیدا ہوا ایسا نہ ہو کہ کنارے تک پہنچنے کے لیے سمندر میں کوئی مضبوط جہاز میں محفوظ بیٹھا خوبصورت نظاروں کا لطف اُٹھاتا ہوا اپنا سفر پورا کرے اور کوئی ہانپتا ہوا شاور بھنور سے لڑتا' چٹانوں سے ٹکراتا لہولہان ہوکر اپنا سفر پورا کرے۔ یہ میرے اپنے جذبات ہیں آپ انہیں جو نام دے دیں۔

☆ جہاں اردو ادب کی یہ حالت ہو کہ بڑے بڑے نامور اہلِ قلم اپنی جیب سے کتابیں چھاپتے ہوں وہاں یہ کیونکر ممکن ہے کہ آپ کو اپنی تخلیقات سے اس قدر معقول آمدن ہوجائے کہ آپ رفاع عامہ شروع کردیں؟

☆☆ میری مصوری اور شاعری (انگریزی ترجمے کے ساتھ) کے دونوں مجموعے مغربی دنیاؤں میں بہت مقبول ہوئے ہیں۔ کیونکہ یہ Coffee Table کتابیں ہیں۔ یہاں ایسی کتابوں کی بہت قدر و قیمت ہے خاص کر جب اس میں مصوری بھی ہو۔ اسی لیے مجھے پہلے مجموعے (کرچیاں) کا دوسرا ایڈیشن شائع کرنا پڑا۔ خوش قسمتی سے مے فی ٹوبا (کینیڈا) آرٹ کاؤنسل گرانٹ ایوارڈ مجھے ملا تھا جس سے پہلے ایڈیشن کی اشاعت میں آسانی ہوئی تھی۔ کینیڈا کی سب اعلی بین الاقوامی کتابوں کی دوکانوں نے انہیں رکھا اور فروخت کیا۔ ان گنت لائبریریز اور آرٹ گیلریز نے خریدا جس کی ساری آمدنی پاکستان زلزلہ زدگان کو گئی تھی۔ اب اس دوسرے مجموعے سے بھی یہ کامیابی مل رہی ہے۔ نیک کام صدقِ دل سے کیا ہے تو اس پر اللہ کی رحمت تو ہوتی ہی ہے۔

☆ ایک تاثر یہ ہے کہ آپ اپنی تخلیقات کی آمدن غریب اور نادار لوگوں پر خرچ کیا کرتی ہیں دوسری رائے یہ ہے کہ آپ نے اس آمدن کو یتیم و نادار بچوں کے لیے وقف کر رکھا ہے؟

☆☆ دونوں صحیح ہیں۔ کینیڈا کے Blind Institute اور اپاہجوں کے ادارے کو ہر سال اپنی پینٹنگ Donate کرتی ہوں جن کے National auction سے ان لوگوں کی مدد کی جاتی ہے۔ ہندوستان کے ایک گاؤں میں سرسید اسکول کے غریب بچوں کی تعلیم میں اپنی کتاب اور پینٹنگ کی آمدنی سے مدد کرتی ہوں۔ Unicef کے ذریعہ اپنی شاعری اور ستار کی C.D سے عراقی بچوں کی مدد کی۔

☆ pampered life گزارنے والی تخلیق کار کب' کہاں' کیسے محکوم اور خستہ حال لوگوں کی شریکِ غم ہوگئی؟

☆☆ سنا ہے ایک سرطان کے مریض نے طبیب سے کہا کہ آپ میرا علاج کیسے کرینگے جبکہ آپ کو کبھی سرطان ہوا ہی نہیں۔ اس سے بہتر آپ کے سوال کا اور کیا جواب دوں؟ کچھ لوگ اتنے حساس ہوتے ہیں جو آگ کو دیکھنے ہی سے جل جاتے ہیں ہاتھ لگانے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔ آئرلینڈ کا مشہور گلوکار Bono کروڑپتی ہے لیکن اپنی ساری آمدنی غریبوں کو دے دیتا ہے۔ فرانس کا Albert Schweitzer جو نوبل پرائیزونر کروڑپتی تھا افریقہ جاکر بیماروں کے بیچ رہ کر ان کی خدمت کیا کرتا تھا۔ کینیڈا کا معروف مصور Ray Dirks یہاں کی خوش حال زندگی چھوڑ کر افریقہ جاکر رہتا ہے غریبوں کی مدد کرتا ہے۔ تو جناب کینسر کا علاج کرنے کے لیے ڈاکٹر کو بھی کینسر ہونا ضروری نہیں۔

☆ موسیقی بالخصوص ستار آپ کی زندگی میں کب اور کیسے داخل ہوا۔ آپ نے اس کی باقاعدہ تربیت کس طرح حاصل کی اور اس سے استفادہ کی صورت کیا ہے؟

☆☆ جب سے ہوش سنبھالا موسیقی سے جنون کی حد تک عشق رہا۔ بچپن میں پورے چاند کی رات چھت پر جاکر بینجو کے تارے کو چھیڑتی اور سحر زدہ ہوجاتی۔ ستار ہمیشہ محبوب ساز رہا لیکن والدہ نے اس کی اجازت ہی نہ دی۔ قسمت سے رفیقِ حیات ایسے ملے جو نہایت وسیع النظر ہیں اس لیے کینیڈا ونی پیگ کے میوزک اسکول سے ستار کی تربیت حاصل کی۔ دو تین راگوں کی حد تک مہارت پالی کہ اپنا دل بہلا سکوں اور اپنی شاعری کی آواز میں اس کی آواز ملا سکوں۔ کینیڈین میوزک اسکول سے آرگن (پیانو کی شکل کا ساز) کی تربیت لی اور اس میں بھی کچھ صلاحیت پیدا کرلی۔ اس کے علاوہ آکورڈین پر بھی کچھ دسترس ہے۔ ان تینوں پر کلاسیکل سر میں ایک C.D Fusion تیار کی جسے یہاں مقامی لوگوں نے پسند کیا۔ شاعری اور ستار کی C.D سے عراق

کے بچوں کی مدد کی گئی تھی۔ کینیڈا کے نیشنل ٹیلی ویژن اور ریڈیو (انگلش چینل اور انگلش ریڈیو Canadian Broadcasting Corporation) میں انٹرویو کے سلسلے میں ستار کے Live performance کا موقعہ ملا اور اس کی پذیرائی کی گئی۔ ستار میرا بہترین دوست ہے۔ جب ہم دونوں ایک دوسرے کی آغوش میں ہوتے ہیں تو اس کے نغموں کو میری انگلیاں جگاتی ہیں۔ میری اور اس کی آوازیں ایک دوسرے میں سما کر مجھے ایک پرسکون جہاں میں لے جاتی ہیں۔ ایسی دنیا جہاں کوئی خلل کوئی اضطراب کوئی درد نہیں۔ صرف طمانیت اور تکمیل کا احساس اور خواب ناک فضائیں ہیں۔ یہاں کی مشینی زندگی کی دھوپ میں ستار ایک سایہ دار شجر ہے میرے لیے۔ لیکن اب میں اپنی والدہ کی ہدایت کے مطابق گھر سے باہر اسے نہیں لے جاتی۔

☆ قلم کے ساتھ برش سے بھی آپ کا گہرا تعلق ہے۔ ہمارے قارئین یہ جاننا چاہیں گے کہ اس شوق لطیف سے آپ کا ناتا کب اور کیونکر جڑا اور آپ نے اس فن میں مہارت کس طرح حاصل کی نیز مصوری میں آپ کس تھاٹ کی نمائندہ ہیں؟

☆☆ قلم کے ساتھ موقلم بھی میرا ساتھی بچپن ہی سے تھا۔ حسین قدرتی مناظر میں ضم ہو جانے کی کیفیت۔ موسم کے ساتھ بدلتے قدرتی Kaleido Scope کے حسین رنگوں کو اپنے پاس محفوظ کر لینے کی خواہش میں جب لکیریں کھینچیں تو وہ مکالمہ کرنے لگیں۔ اس دن سے برش کو تھاما تو آج بھی یہ ہم سفر ہے۔ میرے دل کو کینوس کی گود میں رکھ دیتا ہے۔ فن خداداد ہوتا ہے۔ فنکار پیدا ہوتا ہے بنایا نہیں جاتا۔ Skill دنیا میں آ کر حاصل کرتا ہے جو میں نے یونیورسٹی آف مے نی ٹوبا' کینیڈا سے حاصل کیا۔ اس سے بہت پہلے بغیر کسی تربیت مجھے مصوری میں پہلا انعام حاصل ہو چکا تھا جس طرح بغیر کسی مشق سخن' مطالعہ اور رہنمائی میری پہلی نظم ایک رسالہ ''شمع'' میں شائع ہوئی تھی۔ میری مصوری Surrealism ' Realism اور Symbolism سے تعلق رکھتی ہے۔

☆ کچھ تفصیل Film making کے تجربات کی بابت بتلایئے اور یہ بھی کہ آپ کے ذہن میں یہ خیال کس طرح آیا؟

☆☆ یہ خیال مجھے نہیں ہمارے ایک دوست کو آیا اور ہم لوگوں کے ساتھ مل کر انھوں نے ایک فیچر فلم بنائی جس کے ڈائریکٹر ہندوستان کے مشہور و معروف ہرشی کیش مکھرجی تھے۔ اس فلم کا نام ''ناممکن'' تھا جس میں مشہور فلمی ستارے زینت امان' راج ببر (سجاد ظہیر کے داماد) ونود مہرہ کے ساتھ میرے بیٹے شیراز کا خاص Role تھا۔ اس کے گانے لتا منگیشکر اور کشور کمار کی آواز میں تھے۔ اور بیش تر شوٹنگ میرے گھر پر ہوئی تھی۔ میرا گھر جیسے فلم اسٹوڈیو بن گیا تھا۔ دل چسپ تجربہ تھا۔ گھر کے اطراف پولیس کا پہرہ جرنلسٹ اور اخبار والوں کا تانتا رہتا تھا۔ آرٹ ڈائرکشن میرے ذمے تھا۔ کہیں کہیں ڈائیلاگ میں بھی مشورے دیتی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ جب ہم ٹیلی ویژن پر ڈرامے یا فلم دیکھنے جاتے ہیں تو وہ زندگی کی طرح سچے محسوس ہوتے ہیں لیکن ان کی Filming دیکھتے ہیں تو وہ بے حد اُکتا دینے والے جھوٹے لمحات ہوتے ہیں۔ اس Film making کا ایک تجربہ یادگار رہے جب میرے بیٹے شیراز کو پہلی بار مجھ سے الگ ہونا پڑا تھا۔ شوٹنگ کے سلسلے میں اسے ٹورنٹو (نیا گرافالس) جانا پڑا۔ ایک سین میں Villain نے اُسے رسی سے باندھ کر اُس کے سر پر بندوق رکھی تو میرے آٹھ سال کے معصوم بچے نے خوفزدہ ہو کر مجھے فون کیا اور کہا ''میں تمہیں بہت Miss کر رہا ہوں''۔ یہ سن کر میں رو پڑی تھی اور پھر فوراً اُس کے رول کو جلد ختم کروا کر اُسے واپس بلوا لیا تھا۔

☆ اپنی فلم میں بطور آرٹ ڈائریکٹر آپ کی خدمات کو کس نظر سے دیکھا گیا اور کبھی آپ کے دل میں اس شوق کو بطور پیشہ اپنانے کا خیال نہیں آیا؟

☆☆ انڈین فلم انڈسٹری میں میرے کام کو کافی سراہا گیا لیکن کبھی بطور پیشہ آرٹ ڈائرکشن کا خیال نہیں آیا۔ اس فلم میں میرا بیٹا تھا اور میرے گھر میں Filming ہوئی تھی اسی لیے یہ کام میں نے کیا تھا۔

☆ دنیا کی بڑی لائبریریز اور یونیورسٹیز میں آپ کی تخلیقات رکھے جانے کا سبب اور Source کیا ہے؟

☆☆ میری کتابوں پر تبصرے بین الاقوامی اخبارات اور رسالوں میں شائع ہوئے (اردو اور انگریزی) انٹرویوز ہوئے۔ ٹیلی ویژن اور ریڈیو میں۔ انہیں بنیادوں پر ہر جگہ اعلیٰ لائبریریز اور آرٹ گیلریز نے انھیں خریدا۔ اس طرح کی کوفی ٹیبل کتابیں مغربی دنیا میں بہت مقبول ہیں۔

☆ اس الزام کا دفاع آپ کس طرح کریں گی کہ پروین شیر کی تمام شہرت و ناموری ان کی پُرکشش شخصیت اور عمدہ مالی حیثیت کی مرہونِ منت ہے؟

☆☆ اللہ کی پناہ..... گویا ادبی دنیا نہ ہوئی فلم انڈسٹری ہوگئی۔ اس الزام کی دونوں وجوہات بے بنیاد ہیں۔ ادب سے پرکشش شخصیت اور مالی حیثیت کا رشتہ میری تو سمجھ میں نہیں آیا۔ میں تو بہت کم سنی سے مغربی دنیا کی باسی ہوں۔ میری شخصیت اور فن کی ارتقاء زیادہ یہیں ہوئی بہ حیثیت تارک وطن۔ یہاں آرٹ کی دنیا میں اپنا قدم جما لینا اور خود کو منوا لینا میرے لیے مشکل تو تھا لیکن یہاں صرف صلاحیت پر کامیابی' شہرت و ناموری کا دارومدار ہوتا ہے۔ شخصیت اور مالی حیثیت پر نہیں نہ نام و نسب کام آتا ہے نہ پرکشش شخصیت۔ مغربی تہذیب میں جتنی بھی خامیاں ہوں لیکن یہاں آرٹ کی دنیا صاف' ستھری' سچی اور کھری ہے۔ بالکل Straight forward نہ مروّت' نہ جانبداری نہ سفارش اور نہ خوشامد۔ ایمان داری کے پیمانے سے صلاحیت کو ناپ تول کر ہی انعام و اکرام سے نوازا جاتا ہے۔

مجھے فخر ہے کہ یہاں بطور مصور جو رتبہ مجھے ملا وہ صرف میری صلاحیت پر برسوں پہلے یہاں کی صوبائی آرٹ سوسائٹی کے ججوں کا پینل میری

باقی صفحہ ۳۰ پر ملاحظہ کیجیے

''حدِ عاشقی''

(جنابہ پروین شیر کے غزلیہ کلام سے مختصر انتخاب)

فاری شا (راولپنڈی)

○

ہے آسیبوں کا سایہ میں جہاں ہوں
شبِ دشتِ بلا میں بے اماں ہوں

چراغاں سا ہے دروازے پہ لیکن
میں اندر سے بہت تیرہ مکاں ہوں

کنارے پر پڑاؤ سب نے ڈالے
سمندر میں اُتر تنہا رواں ہوں

وہ بادل تھا ہوا کا ہم سفر تھا
میں تشنہ کام فصلِ رائیگاں ہوں

ہوا کی زد پہ جیسے شمع کی لو
میں اپنے حوصلوں کا امتحاں ہوں

ستوں کچے تھے بارش سہہ نہ پائے
سلگتی دھوپ میں بے سائباں ہوں

پتا میرا اب اس کو کیا ملے گا
نشاں ہوتے ہوئے بھی بے نشاں ہوں

☆

○

میں دوں صبر کے امتحاں اور کتنے
مرے سر پہ ہیں آسماں اور کتنے

تہوں پر تہیں کھلتی ہی جارہی ہیں
ہیں چہروں میں چہرے نہاں اور کتنے؟

بہت تند ہیں یہ تھپیڑے ہوا کے
گریں گے شجر ناگہاں اور کتنے؟

ہمیں نذرِ غارت گری کرنے والو!
مٹاؤ گے نام و نشاں اور کتنے؟

وہ موجِ تلاطم، وہ منہ زور طوفاں
دریدہ ہوئے بادباں اور کتنے؟

زمیں کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے تو کردی
بہاؤ گے خوں اب یہاں اور کتنے؟

☆

○

تہہ گرداب تو بچنا مرا دشوار ہے' پھر بھی
کنارے دور ہیں' ٹوٹی ہوئی پتوار ہے' پھر بھی

تھکن سے چُور رہوں' سر رکھ دیا ہے اُس کے سینے پر
مجھے معلوم ہے یہ ریت کی دیوار ہے' پھر بھی

متاعِ رشتۂ جاں کاروبارِ منفعت کب تھی
خریداروں کے حلقے میں سرِ بازار ہے' پھر بھی

مری مٹھی میں نازک پنکھڑی محفوظ رہتی ہے
بچانا سنگ باری میں اسے دشوار ہے' پھر بھی

سمندر تشنگی کا اب سراب عشق میں ضم ہے
شکستہ حال میرا شیشۂ پندار ہے' پھر بھی

ترے لہجے کی شبنم جذب کر دے کچھ نمی اس میں
اگرچہ دل سلگتی ریت کا انبار ہے' پھر بھی

چراغ آرزو ہے منتظر دہلیز پر میری
وہ دوری کے دھندلکوں میں بہت لاچار ہے' پھر بھی

یہ مٹی چاک پر تھمتی نہیں ہے اتنی گیلی ہے
کٹھن یہ مرحلہ ہے' کوزہ گر لاچار ہے' پھر بھی

☆

○

دلگیر اس طرح سے ہوئے زندگی سے ہم
لیتے ہیں سانس بھی تو عجب بے دلی سے ہم

سر پر ہمارے روز نیا آسمان ہے
وحشت ہے جو زمیں کی، کہیں کیا کسی سے ہم

قسمت کے پھیر میں تو کچھ اپنی خطا بھی تھی
کس منہ سے اب سوال کریں زندگی سے ہم

آنکھوں سے خواب چھین لیے روزگار نے
آپہنچے کتنی دور تمہاری گلی سے ہم

پروینؔ سوچتے ہیں یہ ساحل کو دیکھ کر
گرداب سے نباہ کریں گے خوشی سے ہم

○

عذاب جاں ہوا پستہ قدوں کے شہر میں آنا
سرِ آئینہ خانہ خواب کے شیشے بکھر جانا

میں وہ طائر کہ ہے پرواز جس کی مستقل جاری
تلاشِ لامکاں میں کہکشاں کے پار ہے جانا

کہاں وہ چل دیئے ہیں قافلے ڈھونڈیں کہاں ان کو
نہ ہے گردِ سفر باقی نہ رستہ جانا پہچانا

تمناؤں کی شورش ہے تو اے شوریدہ خاطر اب
شکستہ ہی سہی اک آئینہ تو ڈھونڈ کے لانا

اسے اب سادگی کہیے کہ حد عاشقی کہیے
ترے ہاتھوں میں جو پتھر تھے اُن کو پھول ہی جانا

☆

○

آج تنہا یہاں ہوگئے
آئینے سب کہاں کھو گئے

بلبلے موجِ لمحات پر
پل کو اُبھرے، نہاں ہو گئے

بادباں تھا دریدہ مگر
ساحلوں کو رواں ہوگئے

کوزہ گر اب کریں بھی تو کیا
چاک جانے کہاں کھو گئے

پھول چننے کو جو نہی بڑھے
ہاتھ یہ خونچکاں ہو گئے

غرق تھے آنسوؤں میں کبھی
آج رونے کے دن سو گئے

شاخ کہتی ہے ٹوٹی ہوئی
کچھ پرندے یہاں رو گئے

رنگ تتلی کے اب ہیں کہاں
دست باراں انھیں دھو گئے

☆

○

الجھنیں اور تلخیاں بے کیفیاں
آبلہ پائی جنوں ارزانیاں

ہیں ردائے برف میں لپٹی ہوئی
مضمحل احساس کی سب وادیاں

دن گزرتا ہے جنونِ شوق میں
رات بھر چنتی ہوں دل کی کرچیاں

ہر طرف غل اور کتنا شور تھا
کون سنتا دل کی آہ و زاریاں

دے گئی ہیں مجھ کو جلوت کا مزا
خلوتِ دل میں تری پرچھائیاں

پھر کوئی پروینؔ طوفاں آئے گا
پر سکوں ہیں آج کل پُروائیاں

☆

○

ازل سے تابہ ابد سب کے سب اکیلے ہیں
تو پھر یہ کس کے لیے زندگی کے میلے ہیں

یہ کس تلاش میں پاگل ہوا بھٹکتی ہے
عذاب کس کو گنوانے کے اس نے جھیلے ہیں

طرح طرح کے بناتا رہا بہانے وہ
شکستِ وعدہ و پیماں کے خوب حیلے ہیں

لہو لہان گزرنا پڑا ہے ننگے پاؤں
رہ حیات کے پتھر بہت نکیلے ہیں

کہیں ہیں ٹوٹے کھلونے کہیں جلے بستے
ستم گروں نے یہاں کیسے کھیل کھیلے ہیں

جیئے نہیں کبھی تیاریوں میں جینے کی
تمام عمر غموں کے عتاب جھیلے ہیں

حسین خوابوں سے سرسبز رُت کے پایا کیا
ہر ایک برگِ تمنا کے رنگ پیلے ہیں

بکھر نہ جائے کہیں جسم کی یہ خاکستر
ہوا تھی تند بہت ہم جدھر سے گزرے ہیں

وہ تھام کر ہمیں چلتا رہا تو چلتے رہے
جہاں وہ چھوڑ گیا ہم وہیں اکیلے ہیں

کچھ اپنی جان بھی پھولوں سے زیادہ نازک ہے
کچھ اُس کی بات کے لہجے بھی تو نوکیلے ہیں

☆

○

سب الجھنوں سے آج گزر جانا چاہیے
شیرازۂ حیات بکھر جانا چاہیے

بیساکھیوں پہ آس کی کب تک چلا کریں
چارہ گروں تلک یہ خبر جانا چاہیے

بستی کو چھوڑ دشت نوردی کریں مگر
اس کو بھی آزما کے کدھر جانا چاہیے

کچھ تو اُجالا ہو مری تاریک راہ میں
آنکھوں کو نورِ شوق سے بھر جانا چاہیے

کچھ تو نشاں بہار کا باقی یہاں رہے
گلشن میں برگِ گل کو بکھر جانا چاہیے

پلکوں پہ ڈھو رہا ہے کوئی وزن برف کا
تھوڑی سی دھوپ آج اُدھر جانا چاہیے

کشتی ہماری جو سرِ ساحل نہ آ سکی
طوفاں سے ہم کو اس کا تو ہرجانہ چاہیے

کچھ تو مری وفاؤں کا مجھ کو صلہ ملے
دامن میں خار ہی سہی بھر جانا چاہیے

اب تو یہی سیاستِ دوراں کا حال ہے
جس سمت کی ہوا ہو اُدھر جانا چاہیے

☆

''سرنگوں گنبد و محراب''

وارث علوی

(احمد آباد، بھارت)

پروین شیر کی کتاب ''کرچیاں'' جب ہاتھ میں آئی تو محسوس ہوا کہ اردو بھی ایک متمول زبان ہے جس میں ایسی گراں بہا اور خوبصورت کتابیں شائع ہوسکتی ہیں۔ پروین شیر کم سنی سے کینیڈا میں مقیم ہیں۔ شاعرہ بھی ہیں مصور بھی اور موسیقار بھی۔ خیر پردیس میں مصور اور موسیقار تو ہوا جاسکتا ہے لیکن جس کی عمر پردیس میں گذری ہو اس کا شاعرہ ہونا حیرت انگیز ہے کیونکہ کم سنی میں پردیس میں سوائے اپنے گھر کے مادری زبان کا کوئی اور ماحول نہیں ملتا اور انگریزی کے اثر سے دیسی زبان کے تلفظ کی ادائیگی اتنی مشکل ہو جاتی ہے کہ بولنے والا رک رُک کر، ہکلا کر، بڑی تکلیف سے انگریزی لب ولہجہ میں اردو الفاظ ادا کرتا ہے۔ پروین شیر کی زبان کی شستگی اور اسلوب کی پختگی ایسی ہے کہ لگتا ہے وہ کوئی ہماری سرزمیں ہی کی لسانی فضاؤں میں پروان چڑھنے والی شاعرہ ہیں۔

میں فنِ مصوری کا پارکھ تو نہیں لیکن تصویروں کا نگارخانہ ہو یا مرقع، میں حیرت ومحویت کے عالم میں کھو جاتا ہوں۔ پروین شیر کی تصویروں میں مجھے وہی فن کارانہ مہارت اور حسن آفرینی نظر آئی جو مصوری کے عمدہ نمونوں میں ملتی ہے۔ میں عرصے تک ان کی تصویروں میں کھویا رہا کہ شاعری تو ویسے بھی پڑھنے کو بہت مل جاتی ہے اچھی تصویریں مشکل ہی سے نظر نواز ہوتی ہیں۔ لیکن جب نظمیں پڑھیں تو ایک بات کا احساس ہوا۔ پروین شیر کا مرقع ساز تخیلی شاعری میں دانشوری کی نذر ہو گیا ہے۔

رومانی حسیت کی غنائیت، وجدانی کیفیت اور رنگ آفرینی کی جگہ حقیقت پسندی نے لے لی ہے۔ ان کا شوقِ موسیقی اور مصوری کو دیکھ کر یہ توقع عبث نہیں تھی کہ شاعری میں تخلیقی تخیل کوئی ماروائی جست لگائے گا یا METAPHYSICAL STARE مابعد الطبیعاتی Stare پیدا کرے گا یا پراسرار روحانی فضاؤں کی سیر کرے گا۔ لیکن پروین شیر کے لیے روزگار کے غم ان سب سے زیادہ دلنواز نکلے۔ ہمارے دور کی بے چینی اور بے قراری، غربت وافلاس کے نظارے، بے محابا تشدد، جنگ، قتل وغارت گری اور تباہی، زندگی کی محرومیاں، تمناؤں کی نارسیدگی اور وہ کڑا درد جو دل کے تاریک شگافوں سے نکلتا ہی نہیں، پروین شیر کی شاعری کا خمیر بنے۔

پروین شیر کی نظموں میں ایک آفاق گیر انسان دوست شاعرہ کا دل دھڑکتا ہے، پوری انسانیت جس بے معنی دکھ کی کمند میں جکڑی ہوئی ہے اس کا بڑا دردانگیز بیان ان کی نظموں میں ہوا ہے۔ بظاہر تو یہی نظر آتا ہے کہ ان کا معاشرتی شعور انہیں ترقی پسند شعراء کی صف میں لا کھڑا کرتا لیکن ان کے یہاں نہ تو انقلاب کی نعرہ زنی ہے نہ اشتراکی یوٹوپیا کے خواب۔ آج کے عام انسان کی طرح پروین شیر کا ذہن بھی ان سفاک حالات کے شکنجے میں جکڑا ہوا ہے جن سے نجات کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا۔ لیکن فن کار کا تخلیقی عمل دم گھونٹنے والی فضاؤں میں گھٹ کر رہ نہیں جاتا۔ تخلیقی عمل خود اُسے نجات کی راہیں سجھاتا ہے۔ پروین شیر عورت بھی ہیں، ماں بھی اور شاعرہ بھی۔ دنیا کی موجودہ صورت حال چاہے اتنی حوصلہ شکن اور مایوس کن ہو اپنے بچوں کی طرف دیکھ کر انہیں قنوطیت اور کلبیت کی تاریک گھٹاؤں میں بھی امید کی کرن کا انتظار رہتا ہے۔ پروین شیر کی دو نظمیں ہیں ایک بیٹی کے نام اور ایک بیٹے کے نام۔ دونوں نظمیں دعائیہ رنگ میں ہیں اور لمحہ بھر کے لیے پروین شیر پُر آشوب دنیا کو بھول گئی ہیں۔ لیکن ان دونوں نظموں سے زیادہ اثر انگیز اور فنی اور فکری اعتبار سے پختہ تر نظم ہے ''اپنے بچوں کے نام''۔ اس نظم میں دور جدید کی اس المیہ صورت حال کا پُر درد بیان ہے جس میں بچے بڑے ہو کر ماں باپ سے دُور ہو جاتے ہیں۔ اردو زبان میں خواتین شاعرات کے یہاں خاندانی رشتوں کی شکست اور اس کے نتیجہ میں عورت کی بے سروسامانی پر نظمیں لکھی گئی ہیں ان میں پروین شیر کی یہ نظم ایک ممتاز درجے کی مستحق ہے۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ مجموعے میں اس نظم کے فوراً ہی بعد ایک نظم ہے ''دارالضعفا'' یعنی بوڑھوں کا گھر جو جدید تمدن کے چہرے کا بدنما داغ ہے کیونکہ روزگار کی تلاش میں نوجوان اپنے بوڑھے ماں باپ کو ''دارالضعفا'' میں داخل کرا کر دور دراز ملکوں کو نکل جاتے ہیں اور بوڑھوں کے اس گھر کی دیواروں کو تنہائی کا زہر چاٹتا رہتا ہے۔ شاعرہ اس گھر کی ملاقات لیتی ہے اور بوڑھی آنکھیں ایک خوبصورت و جواں وجود کو درمیان دیکھ کر اپنی رگوں میں ایک نیا جلتا ہوا احساس محسوس کرتے ہیں اور نوجوان شاعرہ سے وعدہ لیتے ہیں کہ وہ دوبارہ یہاں ضرور آئے گی۔ لیکن شاعرہ کے دل میں تو یہ خدشہ پیدا ہو گیا ہے کہ کل کو اٹھ کر خود اس کے بڑھاپے کا انجام بھی ایسا نہ ہو۔ ''میں لوٹ آئی اپنے آنے والے کل کو دیکھ کر''۔ اس سیدھے سادے لفظوں میں نا قابلِ پیش بینی مستقبل کا کیسا خوف اور اندیشہ بھر گیا ہے۔ اگر یہ خوف حقیقت بن جائے تو وہ اپنے بچوں سے کیا توقع رکھیں گے۔ اس کا اظہار اس سے قبل کی مذکورہ نظم اپنے بچوں کے نام میں اس طرح ہوا ہے۔

مرے عزیز، مرے پیارے لاڈلے بچے
تمہیں اڑنے کو سات آسمان ملے لیکن
میں خشک بانہوں کی آغوش اپنی وا کر کے

تمہاری راہ میں پلکوں کو ہوں بچھائے ہوئے
چراغ آنکھوں کی دہلیز پر جلائے ہوئے
اور اپنے ہاتھ دعا کے لئے اٹھائے ہوئے
اسی امید کو دل میں ہوں میں بسائے ہوئے
اگر ذرا سی بھی مہلت کبھی جو تم پاؤ
تو تھوڑی دیر کو دم لینے گھر کو لوٹ آؤ۔

نظمیہ شاعری میں زندگی کے ٹھوس حقائق، واقعات اور تجربات کا بیان ہوتا ہے۔ نظمیہ شاعری کا اظہار بیان اگر جزرس، لچک دار اور تخلیقی حربوں سے آراستہ نہ ہو تو شاعری کے سپاٹ نثری بیانات بن جانے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ پروین شیر نے اپنی نظموں میں تشبیہہ، استعارہ، علامت، طنز، تضاد، قولِ محال کا نہایت خوش اسلوبی سے استعمال کیا ہے۔

پروین شیر کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ گو ان کی شاعری سماجی، سیاسی، اخلاقی مسائل کا ذکر کرتی ہے لیکن انھوں نے نہ تو انقلابی مکھوٹا پہنا نہ ہی سرِ منبر دانائے راز کا وعظ پڑھا۔ ان کے یہاں معلّمِ اخلاق کا وہ ندائیہ لہجہ بھی نہیں ہے جو مخاطبین کو یہ کرنے اور وہ نہ کرنے کی تلقین کرتا ہے۔

یہ صفات پروین شیر کو آسانی سے حاصل نہیں ہوئیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ان کا ناقدانہ ذہن ان کی تخلیقی ذہن کی برابر نگہداشت کرتا رہا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں سادہ لوحی اور سادہ گفتاری کی جگہ احساس و بیان کی پیچیدگی نے لے لی ہے جس کی ایک عمدہ مثال ان کی نظم ''حل'' ہے۔ لاحاصلی اور مایوسی کے آخری نقطے پر پہنچ کر زندہ رہنے کے لیے زندگی سے مفاہمت، شکست خوردگی کے زرد چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ ثبت کر کے اس میں Tragic Irony کا تاثر پیدا کرتا ہے۔

کوئی چارہ نہیں باقی
ادھورے پن کو ہم تکمیل کہہ کر زندگی جی لیں

''المیہ'' مختصر سی نظم ہے اور تضاد کے ذریعے ایک طنزیہ صورتِ حال پیدا کرتی ہے۔ اونچی مغرور عمارت وقت کی آندھی کی زد میں آ کر تاش کے پتوں کی طرح بکھر جاتی ہے جب کہ چھوٹے گھروندے بچ جاتے ہیں۔

تیر رہی ہے کاغذ کی نازک سی کشتی
ڈوب گئے ہیں آہن کے مضبوط جہاز

تضاد، شعر و ادب کی نہایت ہی کارگر تخلیقی صنعت رہی ہے اور پروین شیر نے اس سے اچھے کام نکالے ہیں۔ ''آگاہی''، ''سراب''، ''رٹائرمنٹ'' اس صنعت کی نمائندہ مثالیں ہیں۔ ''آگاہی'' تضاد کا عمدہ نمونہ ہے اور یہ ان چند نظموں مین سے ہے جن میں اس کرب کا بیان ہے جو ایک مہاجر اجنبی وطن میں محسوس کرتا ہے۔ مغرب میں زندگی کے بہتر مواقع تلاش کرنے والے لوگوں کا سب سے بڑا مسئلہ اجنبیت، بے جڑی اور تنہائی کا ہے۔ نوسٹالجیا یعنی اس زندگی کی یادیں جو آبائی وطن میں آبائی مکان میں بتائی گئی ہے ایسی نظموں کا لازمی جزو ہوتا ہے۔ نظم میں مغرب یا اپنے اقدام پر طنز سے زیادہ کسی چیز کے ہمیشہ کے لیے کھو جانے کا روح فرسا احساس کارفرما ہے۔ اپنے وطن کی سیدھی سادی زندگی، رشتہ داروں، اڑوس پڑوس اور دور کے شناساؤں کی بے لوث محبت کی زندگی کا تضاد پردیس کی متمول لیکن محبت کے جذبات سے عاری زندگی سے پر اثر ڈھنگ سے اُبھر کر آیا ہے۔

''سراب'' میں عورت مرد کے رشتے کو پانی اور سنگِ مرمر کے پیمانے کے تضاد کے ذریعہ معنی خیز انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ پانی یعنی عورت سنگِ مرمر کے پیمانہ میں ہر رنگ اور روپ ڈھل جاتی ہے جب کہ پتھر، پتھر رہتا ہے۔ پانی زندگی کا مظہر ہے جب کہ پتھر زیست سے ناواقف۔

''رٹائرمنٹ'' ملازمت کے مصروف رنگا رنگ زمانوں اور رٹائرمنٹ کے بعد کی بے کیف بیکار زندگی کے تضاد کو پیش کرتی ہے۔ ملازمت اور رٹائرمنٹ دونوں کا تعلق وقت سے ہے جس کی علامت گھڑی ہے جو ابھی پانچ بجائے گی اور ملازمت کا زمانہ پورا ہو جائے گا۔ رٹائرمنٹ کا پورا ڈرامہ وقت کے تناظر میں کھیلا گیا ہے جو بہت دلچسپ اور معنی خیز ہے۔

اتنے سب فنون میں مہارت اور شہرت رکھنے اور ایک متمول خوش حال زندگی گذارنے کے باوجود پروین شیر کو زندگی کے بطن میں رہے غم کے ہیرے کی اہمیت کا گہرا شعور ہے جس کے سبب ان کی شاعری میں صداقت اور خلوص کی چمک پیدا ہوئی ہے۔ غم کا بیان ان کے یہاں غزلوں میں کم اور نظموں میں زیادہ ہوا ہے جو غم کے روایتی نہ ہونے اور شخصی ہونے کا ثبوت ہے کیونکہ غزل میں تو غم پسندی کی ایک طویل روایت میر سے لے کر فانی تک پھیلی ہوئی ہے۔ نظموں میں غم شخصی بھی ہے اور وجودی بھی۔ پروین شیر کو یہ احساس ہو گیا ہے کہ غم زندگی کی سرشت کا لاینفک جزو ہے۔ شخصی غم میں رومانی حسیت کو اتنا دخل نہیں جتنا کہ زندگی کی تلخ حقیقتوں کا احساس۔ اس احساس کو شدید تر بناتا ہے خود کے مہاجر ہونے کا تجربہ۔ دکھ اپنی ہی سرزمین اور اپنے ہی لوگوں میں بٹ کر گوارا بن جاتا ہے اور اجنبی انجان فضاؤں اور لوگوں میں غم گساروں کی کمی کا احساس دلاتا ہے۔ زمین سے بچھڑنے، ساتھیوں سے جدا ہونے، تنہائی کے ناپید کنار سمندر میں اکیلا مستول پر بیٹھا پرندہ اس دردناک کیفیت کا پر اثر استعارہ ہے۔ نظم کا عنوان ہے ''بے بسی'' ملاحظہ کیجیے۔

اک تنہا پنچھی مستول پہ بیٹھا بیٹھا
تھک سا گیا ہے
حدِ نظر تک چاروں طرف ہے نیلا پانی
خشکی کا کچھ پتہ نہیں ہے
نقلِ مکانی کے ساتھی سب دوسرے پنچھی
اس سے بچھڑ کر

راہ بدل کر
جانے کس اگلی دنیا میں پہنچ چکے ہیں
بار بار اڑتا ہے لیکن
اک دو چکر آس پاس کے ہی اس کا
مقدور ہے شاید
کچھ بھی نہ پا کر
تھکے پروں کی سکت گنوا کر
مایوسی میں لوٹ کے پھر مستول پہ آ کر
بیٹھ گیا ہے

وہ گھٹن جو بند تابوت میں ہوتی ہے وہ غم جو عمر گریزاں کا ہے وہ رنج جو شامِ زندگی میں عورت کے بے سہارا رہ جانے کا ہے اور جس میں وہ ماں کی نرم آغوش اور سریلی لوری کو ترستی ہے یا بیٹے کے ہاتھوں کا سہارا ڈھونڈتی ہے اس بھکارن اطالوی لڑکی کا غم جس کے خوبصورت چہرے پر آنکھیں بے پایاں آلام کا زہر پی کر بوڑھی ہوگئی ہیں۔ اس شہر کا غم جہاں

سرنگوں گنبد و محراب شکستہ ایواں
آتش دحوں کے ہیں پیوند ردائے شب پر

غرض اتنے غم جھیلے ہیں شاعرہ نے کہ دل غم کا خوگر ہو گیا ہے۔

دل پرخوں کی ایک گلابی سے
عمر بھر ہم رہے شرابی ہے

غم کیسے ایک قرینۂ حیات بنتا ہے اس کا اظہار پروین شیر کی ایک نظم میں ہوا ہے جس کا عنوان ہے ''تشنہ لب آنچل'' یہ نظم اپنے موضوع اور طرز بیان دونوں میں منفرد اور بے مثال ہے اور اسی نظم پر میں اپنے اس مختصر سے مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

ایک مدت سے مرا آنچل ہوا ہے تشنہ لب
آنسوؤں کا ایک قطرہ بھی نہیں ملتا اسے
ایک مدت ہوگئی، میں نے دوپٹے میں
ستارے اشک کے ٹانکے نہیں
یہ دوپٹہ جھلملاتا تھا کبھی ان آنسوؤں کے
شبنمی قطروں کی آب و تاب سے
یہ سلگتی جان میری
اپنے اس ہمدم دوپٹے کو ہی دم بھر اوڑھتی تھی
اور پاتی تھی سکوں
کیا ہوا گر یہ کناں آنکھوں کے اس سیلاب کو
اشک کے سارے سمندر دل میں ہی غرقاب
کیسے ہو گئے
کیا مرے رونے کے دن اب سو گئے
کیا میں جتنا بھی مرا مقدر تھا مرا۔ وہ رو چکی
کیا کہوں
اس چلچلاتی دھوپ کی حدّت تھی مجھ کو
آنسوؤں کی بھیگی بھیگی اوڑھنی کی
ٹھنڈی چھاؤں یاد آتی ہے بہت

☆

''پُرکھوں کا گھر''

سہا سہا ہر اک چہرہ منظر منظر خون میں تر
شہر سے جنگل ہی اچھا ہے چل چڑیا تُو اپنے گھر

تم تو خط ہی لکھ دیتی ہو گھر میں جی گھبراتا ہے
تم کیا جانو کیا ہوتا ہے حال ہمارا سرحد پر

بے موسم ہی چھا جاتے ہیں بادل تیری یادوں کے
بے موسم ہی ہو جاتی ہے بارش، دل کی دھرتی پر

آ بھی جا اب جانے والے کچھ ان کو بھی چین پڑے
کب سے تیرا رستہ دیکھیں چھت، آنگن، دیوار و در

جس کی باتیں امّا ابّو اکثر کرتے رہتے ہیں
سرحد پار نہ جانے کیسا ہوگا وہ پرکھوں کا گھر

جتندر پرواز
(پٹھان کوٹ، بھارت)

''نہالِ دل پر سحاب جیسے''

ستیہ پال آنند
(یو۔ایس۔اے)

اس کتاب میں جو کارنامہ پروین شیر نے کر دکھایا ہے' اس کی اردو میں مثال ملنی ناممکن ہے۔ اپنے زمانے میں جب مولانا حالی اور محمد حسین آزاد نے دلّی سے لاہور جا کر ''انجمن مصنفین'' کی بنیاد رکھی تو اس انجمن کے ماہانہ مشاعروں میں بجائے مصرع طرح کے ایک 'موضوع' کا انتخاب کیا اور شعراء کو دعوت دی کہ وہ اس موضوع پر طبع آزمائی کریں۔ یہ سلسلہ ایک یا ڈیڑھ برس تک چلا اور پھر منقطع ہو گیا لیکن یہ ایک بے حد دلیرانہ قدم تھا۔ 1899 عیسوی کے شملہ کے مشاعرے کی روداد اب بھی پرانی لائبریریوں میں موجود ہے جس میں موضوع 'بہار' تھا۔ یہ بات عام فہم ہے کہ کچھ انگریزی دان منچلوں نے ابتدائی انیسویں صدی کے انگریزی کے رومانی دور کے نمائندہ شعرا ورڈزورتھ اور کالرج کی کچھ نظموں' خصوصی طور پر Odes کا ترجمہ اردو میں کیا تھا اور لاہور میں یہ تراجم ان دونوں بزرگوں کی نظر سے گذرے تھے۔ اور وہ topic-based poem کی تکنیک سے واقف تھے۔ بہرحال مجھے یہ تاریخی واقعہ اس لیے درج کرنے کی ضرورت پیش آئی کہ یہ بات خط کشیدہ الفاظ میں کہی جائے کہ اب تک اردو میں ایک ہی موضوع پر کسی بھی شاعر نے اتنی تعداد میں نظمیں نہیں لکھیں جتنی کے پروین شیر نے ''ماں'' کے آفاقی موضوع پر لکھی ہیں اور پھر یہ کمال بھی کر دکھایا ہے کہ ان نظموں میں repetition کی قباحت نظر نہیں آتی۔

خود کو دہرانے کی حد تک تجنیس و تکرار شاعری کی گرامر میں کسر اعشاریہ کہلاتی ہے اور عظیم شاعروں میں بھی یہ گنبد کی آواز کی طرح پائی جاتی ہے۔ اسلوب و آہنگ میں اسے جائز قرار دیتے ہوئے بھی موضوعاتی سطح پر اور لفظیات کے حوالے سے اسے 'بازنوشتی' تسلیم کیا گیا ہے اور حشو و زوائد یا بکرات و مرات سمجھ کر اساتذہ نے اس سے احتراز کرنے پر زور دیا ہے۔ پروین شیر کلاسیکی نوعیت کی شاعرہ نہیں ہیں تو بھی ان کی زیر تبصرہ نظموں میں یہ نقص نہیں ہے۔ اس کی بڑی وجہ شاید شاعرہ کے طریق کار میں ہر نظم کے لیے ایک الگ مرکزی استعارے کی تخلیق ہے جو نظام قدرت سے یا روزمرہ کی زندگی سے مستعار لیا گیا ہے اور اس پر اپنا انحصار رکھتی ہوئی آخری سطروں تک پہنچ کر اسے ماں کی گوناگوں صفات سے منسوب کر دیتی ہے۔ یہ شعری صفت بہت کم شاعروں کے ہاں موجود ہے اور اگر ایک اوسط درجے کے شاعر کو درجن سے زیادہ نظمیں ایک ہی موضوع پر لکھنے کا چیلنج دیا جاتا تو تجنیس و تکرار سے بچنا اس کے لیے مشکل ہو جاتا۔

مثال کے طور پر کچھ نظموں کا ذکر یہاں اس حوالے سے مناسب رہے گا کہ ان کا مرکزی استعارہ کیسے پہلی سطر سے چل کر نظم کے متن میں مختلف مراحل کو طے کرتا ہوا آخری دو تین سطروں میں خود کو تکمیل کے مرحلے تک پہنچاتا ہے۔

'سفید کپڑوں میں اک مسیحا' جس پر ایک پینٹنگ بھی اس مجموعے میں شامل ہے' صرف ایک لفظ یعنی 'مسیحا' کی مناسبت سے ماں کا ہیولیٰ ایک بصری منظر کی صورت میں پیش کرتی ہے۔

سفید بُرّاق' ایک چادر سے ڈھانپ کر اپنے زخم سارے
تُو چل پڑی تھی ان اونچے نیچے سے راستوں پر
تُو سوگواری کی دردانگیز اوڑھنی میں
بلائے جاں' دلخراش صدموں کو سہتے سہتے
تھی اپنی بچی کی ایک ضامن!

اور تب قاری آخری دو سطروں میں یکا یک ایک نئی سچائی سے آگاہ ہوتا ہے' کہ بچی کی ماں صرف ماں نہیں تھی' بلکہ۔۔۔

سفید کپڑوں میں اک مسیحا
تُو باپ بھی تھی' اور ایک ماں بھی!

ماں اور باپ دونوں کی ذمہ داریاں خود میں سموئے ہوئے یہ خاتون ایک مسیحا کیسے بنی؟ اس سوال کا جواب متن میں پہلے وارد ہوئی تین سطروں میں موجود ہے۔

ضرور کچھ سانحہ ہوا تھا
کہ جس نے تیری شبیہہ' ملبوس' شکل و صورت کو
ایک لمحے میں کچھ سے کچھ کر کے رکھ دیا تھا!

ان سطور سے یہ مترشح ہے کہ مرکزی استعارہ درخت کے ایک تنے کی طرح ہے جو شاعرہ کے ذہن میں ایک نرم و نازک سے پودے کی طرح پہلے معرض وجود میں آتا ہے' پھر اس پر تمثالوں یا امیجز کی پے در پے شاخیں اگنے لگتی ہیں۔ ان شاخوں کا وجود تنے سے منسلک بھی ہے لیکن وہ دھوپ اور ہوا سے بھی اپنی زندگی تر و تازہ رکھتی ہیں۔ آخری سطور میں ان سب کی خالق شاعرہ جب ان شاخوں (تمثالوں ۹ کے بنیادی structural رشتے کی organic unity (نامیاتی وحدت) کو پیٹر کے تنے کے ساتھ برقرار رکھتے ہوئے جیسے اپنی تخلیقی قوت کی کارکردگی کے طلسمی پٹارے سے' مضمون میں جواب تک ''دو طن شاعر'' تھا' نکالتی ہے اور کھٹاک سے آخری سطروں میں جڑ دیتی ہے تو قاری کو یکا یک یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاعرہ ساری نظم میں اپنی تمثالوں' پیکروں اور امیجز سے مجھے یہی تو بتانے کی کوشش کرتی آ رہی تھی۔ کچھ دیر نظموں سے بھی یہ طریق

کا رواضح کیا جاسکتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر نظم کو ایک کلیے کی طرح زیر بحث لایا جائے۔ صرف ایک بند کہیں بیچ میں سے لے کر اس کا یہ بظاہر نادیدہ لیکن بباطن نامیاتی رشتہ آخری سطروں سے منسلک ہوجانے کا عمل دکھایا جا سکتا ہے۔

'کشش ثقل' جس کا انگریزی ترجمہ بھی موجود ہے اس اشارے کو زادِراہ کی طرح ساتھ لے کر چلتی ہے کہ ماں کا رشتہ اپنے بچے کے ساتھ یا بچوں کے ساتھ وہی ہوتا ہے جو ایک سورج کا اپنے گرد اپنے اپنے مداروں میں گھومتے ہوئے سیاروں سے ہوتا ہے۔ وہ اس کشش ثقل کی وجہ سے اپنے راستے پر قائم ودائم رہتے ہیں اور بھٹکتے نہیں۔

عالم آب وگل کی کشش' یہ زمیں
ایک ماں کی طرح
اپنے سینے سے سب کو لگائے ہوئے
دے رہی ہے لوازم سبھی زندگی کی بقا کے لئے

اسکے بعد اس بیانیے کے objective correlative کے طور پر نباتات' پودوں' پرندوں' آبی جانوروں' حیوانوں اور انسانوں کا ذکر ہے اور پھر ایک سطر وارد ہوتی ہے جو قاری کو انگلی پکڑ کر ساتھ لے چلتی ہے' یعنی یہ سارے ذی روح۔۔۔

مامتا کی کشش کی پناہوں میں ہیں

اب شاعرہ کائنات سے اپنی ذات کی طرح رجوع کرتی ہے۔ انگریزی میں تنقید کی زبان میں اسے Poetic backtracking کہتے ہیں۔ اب (جس کا اردو ترجمہ 'شعری پسپائی' کیا جاسکتا ہے لیکن راقم الحروف کو یہ پسند نہیں ہے!) نظم میں تین چار بار 'میرا' یا 'میں' یا 'مجھے' (اسم ضمیر) آتا ہے جو اس عمل کو پورا کرتا ہے' کہ شاعرہ کا سفر کائنات سے ذات تک کا ہے اور آخری سطریں اس پر finality کی مہر ثبت کر دیتی ہیں:

اب میں بے خانماں ہوں'
وطن سے نکالی ہوئی
اس زمین پرکشش اب میسر کہاں
جو مجھے تھام لے
جانے کب تک خلاؤں میں بھٹکوں گی میں

یہ کہا جاسکتا ہے کہ شاعرہ میں صراحت کا عنصر نمایاں ہے اور وہ رمز یا اشارہ یا کنایہ یا علامت کو پردے کے پیچھے پوشیدہ نہیں رکھتی اور آہستہ آہستہ رمزیت کے اس پردے کو کھسکاتی رہتی ہے اور آخر میں فیڈ آوٹ کرنے سے پہلے پورا پردہ ہی اٹھا دیتی ہے' لیکن اس سے صرف اس کے طریق کار کا پتہ چلتا ہے' اس کے فن پر کوئی حرف نہیں آتا۔

'سکوت' (انگریزی ترجمہ: Stillness) بھی آفاقی استعارے کو ایک اگلی منزل تک لے جاتی ہے۔ اس میں نظم کا واحد متکلم ہی ایک سیارہ فرض کر لیا گیا ہے جو اپنے محور کے خلاء میں کھو جانے پر خود اس پس وپیش میں مبتلا ہے کہ وہ اب کیا کرے۔ بنیادی طور پر اس نظم میں اس کے اکیلے پن کو مختلف امیجز سے نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن ہر امیج میں ''سیارے'' یعنی ''واحد متکلم'' کی انسانی شبیہہ کھُل کر سامنے آتی ہے جسے Personification کہا جاسکتا ہے:

یہ سیارہ
سناٹے کی چادر تانے
گم صم ہے
چپ چاپ کھڑا ہے
اس کی سانسیں
تھم تھم کر چلتی ہیں جیسے
رک جائیں گی

اور یوں اس کی انسانی صورت ان امیجز مثلاً 'چادر تانے'، 'سانسیں'، 'شریانوں میں درد کا دریا' وغیرہ میں جب اس کی جسمانی اور ذہنی کیفیت کا احاطہ کر لیتی ہیں تو آخری سطریں' پنچ لائن' Punch Line کی صورت میں وارد ہوتی ہیں۔

یہ سیارہ
اب کتنا بے جان ہے جب سے
تم نے اس کو تیاگ دیا ہے

مگر ہو تم' جس پر ایک پینٹنگ بھی اس کتاب میں موجود ہے' بے حد خوبصورت سطروں میں شروع ہوتی ہے جن میں ایک بصری منظرنامہ ہے۔ اس متحرک سین میں بیٹی کا سر بوڑھی ماں کی گود میں ہے اور وہ اس کو بالوں کے سہلا رہی ہے۔

تمہاری گود میں اب بھی مرا سر ہے
مری آنکھیں تحفظ کے سہانے' روح پرور
خواب میں ڈوبی ہوئی ہیں اور
تمہاری انگلیاں اب بھی
مری الجھے ہوئے بالوں
کو سلجھاتی ہیں شفقت سے!

اس ایک بند میں ''اب بھی'' دوبار آیا ہے جو اس بات کا احساس دلاتا ہے، کہ ماں کے دوسری دنیا میں اٹھ جانے کے باوجود بھی' بیٹی جو اَب ایک ننھی بچی نہیں رہی ہے' اس شفقت بھرے ماحول کے منظرنامے کو ایک 'خواب'

کی صورت میں اپنے ذہن میں متشکل کر رہی ہے۔ 'خواب' کا صرف ایک بار ان سطروں میں آ جانا وہ کنایہ ہے' جسے اردو کے شاعر اکثر و بیشتر استعمال میں لاتے ہیں۔

کچھ نظمیں جن کا انگریزی میں ترجمہ بھی کتاب میں موجود ہے' ان میں ''شمس و قمر'' کے عنوان سے ایک خوبصورت نظم بھی ہے' جس میں ایک بار پھر آفاقی استعاروں چاند اور سورج کو پیش کیا گیا ہے۔ اس میں بھی 'سورج' ماں ہے اور 'چاند' بیٹی۔۔۔

لیکن اس کا ساتھی سورج
ہاتھ چھڑا کر
جب رخصت ہو جاتا ہے
تھک کر دھرتی کے پنہائی میں
گر کر چھپ جاتا ہے
چاند کا جھلمل کرتا چہرہ
بجھ جاتا ہے

اور شاعرہ نے یوں نظم کی اختتامی سطروں میں سورج اور چاند کے اس رشتے کو ماں اور بیٹی کی شکل میں ڈھال کر یہ نتیجہ پیش کیا ہے' کہ

اس کی رگ رگ میں جو نور بھرا ہے
سورج نے خود اپنا آپ جلا کر
اس کو بخشا تھا۔

گویا اس نے ماں کی بچوں پر 'صدقے جاؤں' کی دعا کو سورج اور چاند کے استعارے میں ڈھال کر ایک آفاقی سچائی کو متشکل کر دیا ہے۔ حالانکہ یہ تینوں نظمیں ہی سورج' چاند' ستارے' سیارے' دھرتی وغیرہ کے آفاقی منظرنامے کو پیش کرتی ہیں' تو جیسا کہ شروع میں کہا گیا ہے' ان میں کہیں ترجیح و تجنیس نہیں ہے۔ ہر بار ایک تازہ بہ تازہ' نو بہ نو طریقے سے استعارے کی تشکیل کی گئی ہے۔

میرے خیال میں اگر اس ''کافی ٹیبل بک'' پر پروین شیر کا نام نہ بھی ہوتا تو اہل نظر کو یہ پہچاننے میں دشواری نہ ہوتی کہ یہ نظمیں انہی کی تحریر کردہ ہیں۔ لہجے کی نرمی' ہلکی ہلکی آگ کی تپش اور اس پر مستزاد یہ کہ لو دیتی ہوئی' شمع جذبات کی رو جو اپنی نسائی حدود میں رہتے ہوئے اپنی بات ماں کے حوالے سے کہتی ہے۔ شاید کوئی بیٹا اپنی ماں کے حوالے سے استعاروں کو زندگی کی آفاقی قدروں سے منسلک کر کے یہ نظمیں لکھتا تو وہ بات پیدا نہ ہوتی جو ایک بیٹی کے قلم کی روشنائی سے پیدا ہوئی ہے۔

کچھ اور نظموں میں ایسی سطریں جو نہ صرف قاری کے وجود میں ازل سے موجود ''زچہ اور بچہ'' کے مقدس جذبے کو تحریک دیتی ہیں اور جو شاید تادیر ذہن کو بشارت دیتی ہیں، یہ ہیں:

زمیں کے سینے پہ
خوبصورت جو رنگ پارے
سنور گئے ہیں
زمیں شناسو!
انہیں بھی پھولوں کا نام مت دو
یہ میرے آنسو ہیں جن کی خوشبو
زمیں کے اندر اتر کے اس کی
تلاش میں ہے
وہ جانے کتنی تہوں میں مٹی کے
کھو گئی ہے!
(وہ میری آنکھیں' یہ میرے آنسو)

''اے میرے ساتھیو'' کے زیر عنوان نظم میں شاعرہ کے ساتھی قدرت کے مظاہر ہیں جو اس کی طرح ہی غم زدہ ہیں۔ چاند' سورج' ستارے' آسمان' چاند کی ایک کرن' سحر' افق' ندی' ہوائیں' بھٹکتے ہوئے ابر پارے' سرسبز پیڑوں کے پتے۔۔۔۔ ان سب سے شاعرہ پوچھتی ہے کہ وہ بے چین اور نڈھال کیوں ہیں رو کیوں رہے ہیں اور آخر میں خود ہی اپنے سوال کا جواب دیتی ہے کہ جدائی کا جو غم اسے ہے' وہ شاید انہیں بھی ہے۔

ہائے' کچھ تو کہو
وہ تو مجھ کو گئی ہے یہاں چھوڑ کر
درد تنہائی میں
یاد تم کو بھی اس کی ستاتی ہے کیا؟

غالب نے کہا تھا:

سب کہاں' کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

پروین شیر بھی سوچتی ہے کہ ماں نہ جانے کن مظاہر قدرت میں تبدیل ہو گئی ہو گی۔

اب تم دھرتی کی بانہوں میں
جھلمل کرتا اک جھرنا ہو
جس کے میٹھے میٹھے نغمے
شور سے گھائل میری سماعت
کا مرہم بنتے رہتے ہیں۔
اب تم چاروں سمت ہوا میں
اڑتا ہوا اک درخشاں جگنو ہو
میری پلکوں کی شاخوں پر

جو کرنوں کے پھول کھلا کر
میری یادوں کے غرفے میں
شمعیں روشن کر دیتا ہے

(دھنک ستارہ)

خود کو کلیتاً اپنی ماں کے سانچے میں ڈھال لینا شاید ان بیٹیوں کی قسمت کا نوشتہ ہے، جو ماں کے ہوتے ہوئے بھی اور اس کے جانے کے بعد بھی اسی Persona میں لپٹی رہتی ہیں۔ شاعرہ اپنی نظم ''میں ہوں یا تم'' میں جسم کو ایک نگر سمجھتی ہے اور اس کی شاہراہوں کو اپنی نسیں اور شیریانیں' جن میں اس کی ماں خون کی گردش کے ساتھ چلتی رہتی ہے۔ وہ اس کی آنکھوں کی سوکھی مٹی کو قطرہ قطرہ امرت رس میں بھگو کر نم دیتی ہے۔ وہ اس کی دل کی دھڑکن میں مدھر لوری کی طرح آتی ہے' اس کے سماع کے آرٹ گیلری کو اپنی آواز کی تصویروں سے سجاتی ہے' پیروں کی جنبش میں رقص کی حرکت بھی وہ ہے اور اس کے سنگھار دان کے آئینے میں بھی ہمہ وقت موجود ہے۔ اور آخری سوال جو شاعرہ پوچھتی ہے' وہ یہ ہے:

سوچ رہی ہوں
یہ میں ہوں یا تم ہو' امّی !!

اس کتاب کی شاید سب سے اچھی نظم ''بوڑھی بچی'' ہے۔ اس نظم میں سن رسیدگی کو ایک ذہنی کیفیت کا نام دیا گیا ہے۔ یہ کانسپٹ نیا نہیں ہے اور اردو شاعروں نے اسے بار ہا برتا ہے لیکن جس انداز سے پروین شیر نے اسے اس نظم میں استعمال کیا ہے وہ نیا اس لیے ہے کہ اس میں واحد متکلم کے لیے اسم ضمیر کے طور پر' بجائے ''میں'' کے ''وہ'' استعمال کیا گیا ہے' اس سے یہ نظم ذات سے کہیں اوپر اٹھ کر کائنات کا احاطہ کرنے لگتی ہے۔ میں صرف آخری چار سطروں کا حوالہ دوں گا' امید ہے سے اس کو خود غور سے پڑھیں گے۔

مگر دیکھو
کہ جب سے تم گئی ہو چھوڑ کر اس کو
میری امّی
وہ بچی سن رسیدہ ہو گئی ہے کچھ دنوں میں ہی!

حال اور مستقبل دونوں کو Personify کر کے انہیں ایک شخصیت کے خال وخد دے دینا اپنے آپ میں کوئی بڑی بات نہیں ہے لیکن ایک اور نظم بعنوان ''مقید ہیں'' میں یہ آزاد رہرو جو اپنی راہوں پر آزادی سے رواں تھے اب ہتھ کڑیوں میں جکڑے ہوئے ہیں اور انہیں یہ پتہ نہیں چلتا کہ کہاں جائیں۔ یہ ایک مختصر نظم ہے لیکن بھرپور اثر چھوڑتی ہے۔

بہت آزاد تھے دونوں
مگر اپنی ہی دھن میں
جا رہے تھے اپنی اپنی راہ پر
دونوں الگ منزل کی جانب بے دھیانی میں!
مگر اب دونوں ہتھ کڑیوں میں جکڑے
تک رہے ہیں کس طرف جائیں

کہ جب سے تم گئی ہو' ماں
یہ اب ماضی کے زنداں میں مقید ہیں
یہ دونوں جو مرے
اچھے برے حالات میں میرے نگہباں تھے
یہ میرے حال و مستقبل!

یہ نہیں کہ ساری کی ساری نظمیں سوگوار بیٹی کی جانب سے ہی یا تو مرحومہ کے نام مکتوب ہیں جو ملک عدم کو بھیجے گئے ہیں یا اس سوگواری کی کیفیت کی تصویر کشی ہے جو اس کے دل و دماغ پر طاری ہے' کم از کم ایک نظم میری نظر سے ایسی بھی گذری جو ماں کی اپنی سوچ کی عکاس ہے کہ بیٹی کی پیدائش پر اس نے کیا محسوس کیا تھا۔ اس نظم کی آخر سطریں پیش کرنے پر ہی اکتفا کرتا ہوں۔

وہ کس قدر تھی حسیں ساعت
رحیم ساعت' کریم ساعت
کہ جب مرے دامن دعا میں
عطا کیا تھا تجھے خدا نے!

ایک بات جسے کہنے کی ضرورت ہے وہ ''پنچ لائن'' کی تکنیک ہے۔ اس دولت کو اپنی پوٹلی میں سنبھال کر کفایت سے خرچ کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ یقیناً ایک ایسی نشے کی سی طلب ہے جو میں نے بہت کم شاعروں میں دیکھی ہے۔ میں خود اس کا گرویدہ ہوں اور میری بیشتر نظمیں ساری نظم کے رس کو نچوڑ کر آخری ایک دو سطروں میں ڈائنامائیٹ کی طرح بھر دیتی ہیں' اس لیے مجھے پروین شیر کی یہ کاوش اچھی لگی' لیکن جیسا کہ میں نے کہا کہ اس خوبی کو بدرجۂ احسن نبھانے کے لیے اسے کفایت سے استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔ پروین شیر نے گنجلک استعاروں سے پرہیز کیا ہے۔ اس کے ہاں ملفوفیت نہیں ہے اور رمزیت بھی صراحت میں بدل کر تحلیل ہو جاتی ہے۔ احساس کے کرب کی شدت بھی سہل ممتنع (جو سہل زیادہ ہے اور ممتنع کم) کے اسلوب میں ڈھل جاتی ہے۔ اس کے اظہار کے انداز میں اور الفاظ کے انتخاب میں خوش سلیقگی ہے اور مفہوم کی ادائیگی براہ راست بھی ہے اور رمز و علامت کے حوالے سے بھی ہے۔ جو بات اظہر من الشمس ہے وہ یہ ہے کہ کہیں بھی شعریت سے عاری درشت یا کھردرا لہجہ نہیں ہے۔ دوسری طرف پروین شیر کو لفظوں کو سنوارنے یا چمکانے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی کیونکہ یہ خود ہی تخلیقی بصیرت کے بہاؤ کے ساتھ بہتے چلے آتے ہیں۔

''کٹھن راہوں پہ چلنے کا ہنر''

انور سدید

(لاہور)

پروفیسر افتخار اجمل شاہین نے کینیڈا میں مستقل طور پر مقیم ایشیائی آبادکارہ پروین شیر کی خوبصورت کتاب ''کرچیاں'' مجھے کراچی سے بھیجی تو انھوں نے مجھے ایک طرح کی خوشی سے سرفراز کیا۔ اس کتاب کو دیکھ کر میرے ذہن میں پاکستان کے بے مثال اور لازوال مصور عبدالرحمٰن چغتائی کا سراپا ابھرا اور میں نے مسرت کی اس لہر کو بھی بازیافت کیا جو میں نے چغتائی کے افسانوں کی دو دستخط شدہ کتابیں ''کاجل'' اور ''لگان'' ملنے پر محسوس کی تھی ''نقش چغتائی'' اور ''عمل چغتائی'' کی جو میرے لیے ''جنت نگاہ'' کا درجہ رکھتا ہے۔ لیکن میں اس حقیقت سے ناشناسا تھا کہ فراغت کے بعد کے لمحوں میں چغتائی افسانہ نگاری بھی کرتے تھے۔ اب واقعہ یہ ہے کہ چغتائی صاحب کو افسانہ نگار دیکھ کر جو حیرت جاگی تھی، کچھ اس قسم کا تحیّر پروین شیر کو جو ایک فطری شاعرہ ہیں، مصور دیکھ کر پیدا ہوا اور حقیقت یہ ہے کہ ان کی بنائی ہوئی تصویریں دیکھنے میں ایسا محو ہوا کہ کچھ وقت کے لیے ان کی شاعری جسے زمانی حقیقت اور مکانی واقفیت نے جنم دیا ہے کچھ وقت کے لیے پس منظر میں چلی گئی۔ جب میں اپنی دنیا میں واپس آیا تو اس مسرت دوگونہ سے سرشار تھا کہ پروین شیر نے اپنی شاعری کو خود مصور کیا تھا۔ غور کیا تو ایسی متعدد مثالیں ذہن میں ابھریں جن میں نامور مصوروں نے مختلف تخلیق کاروں کے اشعار کو معنوی طور پر اپنی تخلیقی شخصیت میں جذب کیا اور پھر اپنے احساس کا عکس تصویر میں اتار دیا۔ شاعرہ پروین شیر شاید پہلی مصورہ ہیں جن کی شخصیت میں قلم اور برش لفظ اور رنگ باہم اکٹھے ہو گئے ہیں اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ان پر نظم پہلے اتری تھی یا تصویر کے خیال نے پہلے جنم لیا اور کینوس پر اپنا نقش اتارا تھا۔ ان کی شاعری اور مصوری دونوں میں موسیقی کے عناصر نمایاں محسوس ہوتے ہیں۔ اس کتاب نے یہ انکشاف بھی کیا کہ پروین شیر موسیقی میں بھی دسترس رکھتی ہیں۔

مصوری اور موسیقی پروین شیر کے فن کے اختصاصی زاویے ہیں، انھوں نے مصوری کی تربیت مینی ٹوبا یونیورسٹی میں فائن آرٹس کے پروگرام میں شمولیت کر کے حاصل کی لیکن شاعری اور موسیقی مبدائے فیاض کا عطیہ معلوم ہوتی ہے۔ ترقی پذیر ممالک کی سیاحت نے انھیں اہل دنیا کے متضاد رویوں، دوہرے معیاروں اور سماجی انصاف کے غیر مساوی پیمانوں سے متعارف کرایا اور ان کے باطن کو اس درد سے بھر دیا جو صرف ایک مشرقی عورت کے دل میں ہی پیدا ہو سکتا ہے جو بیک وقت بیٹی اور بہن بھی ہے جس کا سراپا ماں کے فرض میں لپٹا ہوا ہے۔ پروین شیر نے خود اپنا تجزیہ کیا تو لکھا:

> ''یہ دنیا تجربہ گاہ ہے جس میں ہم ہر گھڑی نت نئے تجربات کرتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی حالات کے تیزاب سے احساسات کے جسم مجروح ہو جاتے ہیں شیشے کا پیمانۂ دل سنگ حقیقت سے ٹکراتا ہے تو اس کی کرچیاں دور دور تک بکھر جاتی ہیں۔ انھیں سمیٹنے کے لیے مجھے میرے تین ہم سفروں نے ہمیشہ سہارا دیا۔ میرا قلم، موئے قلم اور ستار، میرے یہ تین ساتھی میرے ذہن کو منجمد ہونے اور سوچوں کو منتشر ہونے سے بچاتے ہیں۔ جب بھی احساس کے آنچل کو دل کی انگلیوں نے تھام لیا اور خوابوں کے گلاب شاخِ مژگاں پر کھل اٹھے تو سچائی نظموں اور غزلوں کی شکل میں سامنے آ گئی۔ کینوس پر رنگوں کی دنیا ئیں ابھر آئیں ''کرچیاں'' میرے تجربوں کا آہنگ ہے.....''

چار سطروں کی ایک دردناک نظم ''بے چارگی'' یوں ہے:

منزلوں کی جستجو میں آبلہ پا
چل رہا تھا کب سے وہ دشت بلا میں
آنسوؤں کی ٹھنڈی چادر میں سمٹ کر
اب سلگتی ریت پر بے سدھ پڑا ہے

پروین شیر مہاتما بدھ کے دیس میں پیدا ہوئیں، بہت چھوٹی عمر میں وہ بدھ کی سرزمین ''گیا'' (بہار) کو چھوڑ کر مغربی ممالک میں چلی گئیں، انھوں نے زندگی کے زہر آلودہ مناظر دیکھے اور ''نروان'' کی تلاش میں انھوں نے فعال زندگی کو ترک کیا اور نہ جوگی کا روپ دھارا بلکہ شاعری، مصوری اور موسیقی سے عرفان حیات حاصل کیا اور اب ہمارے سامعہ اور باصرہ کو بیدار کر رہی ہیں۔ ان کی کتاب ''کرچیاں'' اس بیداری کا ہی وسیلہ ہے۔ اس کا انتساب ان بے سروسامان بچوں کے نام ہے جو کسی کی انگلیاں تھامنا چاہتے ہیں۔ یہاں شاعرہ، مصورہ اور موسیقار پروین شیر ایک ''جگت ماں'' کی صورت میں سامنے آئی ہے۔ یہی اس کا حقیقی روپ ہے جو بے حد خوبصورت ہے۔

میں نے پروین شیر کو دور سے بھی نہیں دیکھا، مجھے ان سے بالمشافہ گفتگو کرنے کا موقع بھی نہیں ملا۔ وہ بارک اوباما کے صدارتی دور میں کینیڈا میں ایک ہندوستانی تارکِ وطن کی حیثیت میں آباد ہیں اور کبھی لاہور نہیں آئیں، میں جنرل (ر) پرویز مشرف کا جابرانہ دور گزار کر اب آصف علی زرداری کے صدارتی زمانے میں جمہوری آمریت کے ذائقے چکھ رہا ہوں اور ان ادیبوں اور شاعروں میں شامل نہیں ہوں جن کی ''لابی'' امریکا میں موجود ہے اور جنہیں امریکا کا ''غیر تارک شہری'' بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ میں پروین شیر کی نظمیں پڑھتا اور تصویریں دیکھتا تو یوں محسوس کرتا کہ وہ میری محلے دار ہیں اور میرے گردوپیش کو مشرقی آنکھ سے دیکھ کر نظم اور تصویر میں منعکس کر رہی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی جب یہ حقیقت

اپنے پر کھولتی کہ پروین شیر تو کینیڈا میں آباد ہیں، تب بھی مجھے مایوسی نہ ہوتی کیوں کہ تارکِ وطن کی حیثیت میں بھی انہوں نے اپنی ذات کو وطن کے لمس سے محروم نہیں کیا اور وہ شاعری اور مصوری کے فنی تقاضوں کو بھی ایک مشرقی تخلیق کار کی حیثیت سے ادا کرتی ہیں۔ان کے یہ دونوں عمل مشاہداتی ہیں لیکن جب فن کا پیکر اختیار کرتے ہیں تو الہامی نظر آتے ہیں۔اوران کا موازنہ آذر زوبی، شمزا، شاکر علی اور زبیدہ جاوید سے کرنا اس لئے ممکن نہیں کہ انہوں نے برش سے شاعری تو کی ہے لیکن فکر وخیال کو موئے قلم سے ادا نہیں کیا۔وہ چغتائی اور صادقین سے اس لحاظ سے مختلف ہیں کہ ان دونامور مصوروں نے اپنے باطن میں جھانکنے کی بجائے دوسرے بڑے شاعروں کے داخل کو ان کی شاعری سے بازیافت کرنے کی کاوش کی ہے۔ پروین شیر نے تخلیقی اظہار کے دوتاریک براعظموں کو منور کیا۔ایک میں لفظوں سے نیرنگی پیدا کی اور دوسرے میں رنگوں کے امتزاج سے تاثرات کی نئی گرہیں کھولیں۔لیکن خوبی کی بات یہ ہے کہ انہوں نے جمالیاتی اظہار کی دو وسیع تر کائناتوں کا ایک مشترکہ مدار تشکیل دیا ہے جس میں تصویر شعریت پیدا کرتی ہے اور نظم نہالِ دل پر سحاب بن جاتی ہے۔

پروین شیر کی شاعری اور مصوری کی نئی کتاب کا مرکزی موضوع ''ماں'' ہے جس کی موضوعی وسعت آفاقی ہے لیکن جس کے حقیقی اسرار زمینی عمل اور سماجی رشتوں سے آشکار ہوتے ہیں لیکن بالعموم اظہار کی راہ نہیں پاتے۔ پروین شیر کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے اس دنیائے فانی سے اپنی ماں کی رحلت کا سانحہ اپنی جاگتی آنکھوں سے دیکھا، اس کا درد خون رِستے دل سے محسوس کیا لیکن پھر ان کی تیسری آنکھ بیدار ہوگئی۔انہوں نے ماں کو عالمِ گیتی پر موجود دیکھا اور اپنا سران کے قدموں میں رکھ کر نغمہ خواں ہوگئیں:

''وہ کس قدر تھی حسین ساعت
رحیم ساعت، کریم ساعت
کہ جب مرے دامنِ دعا میں
عطا کیا تھا، تجھے خدا نے''

لیکن اسی لمحے پروین شیر پر جو دکھ یلغار کر دیتا ہے وہ اپنی ماں سے محرومی کا دکھ ہے اور یہی وہ دکھ ہے جس نے غمِ مسلسل کی صورت اختیار کی، کبھی آنسو بن کر پلکوں پر نمودار ہوگیا اور کبھی یہ قطرۂ خون بن کر دل میں سما گیا لیکن دوسرے لمحے لفظوں کی آبشار نظم کی صورت میں ڈھلنے لگی۔اس قسم کے مقامات پر پروین شیر نے ذاتی محرومیوں کا اظہار رثائی انداز میں کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے غمِ محرومی جاوید کو وسعت دے کر عالمگیریت عطا کر دی ہے اور اپنے غم کو پورے عالم کا غم بنا دیا ہے۔ پروین شیر نے ''ماں'' کو دھرتی کی علامت کے طور پر قبول کیا ہے جس کی ذرخیزیاں برگ وبار لاتی ہیں اور مخنی دانے کو ثمر دار درخت بنا دیتی ہیں لیکن پھر عمروں کے خرابے میں ''ماں'' کا وجود گم ہو جاتا ہے۔ اس وقت دھرتی بانجھ تو نہیں ہو جاتی بلکہ کئی ماؤں کے روپ میں منقسم ہو جاتی ہے۔کائنات کا ارتقائی عمل جاری رہتا ہے۔لیکن وہ ماں جس نے پروین شیر کو جنم دیا ہے، اپنا انوکھا وجود رکھتی ہے اور اس کتاب میں پروین شیر نے ان منفرد زاویوں کو لفظ اور رنگ میں پیش کیا ہے جن کے اسرار ان پر اپنی ماں کی وفات کے بعد کھلے۔اب انہیں احساس ہو رہا ہے۔ بلاشبہ اس احساس میں دنیا کی ہر عورت شامل ہے۔

''اے ماں میں تو
اک بے مایہ چھوٹا سا دانہ تھی، جس کو
تو نے اونچا پیڑ بنا کر
اپنی شفقت سے پروان چڑھا کر
میرے سر کو آسمان تک پہنچایا ہے۔'' (اے ماں)

''میں نے تیری انگلیوں کو تھام کر
ان کٹھن راہوں پہ چلنے کا ہنر
ایک دن سیکھا تھا، تجھ سے میری ماں
جب میں گرتی تھی، تو تجھ کو تھام کر
اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کا فن
مجھ کو تجھ سے ہی ملا تھا، میری ماں'' (ماں)

''اُمڈ کے رحمت ابر جیسے
پیاسی سوکھی زمیں پہ برسے
سلگتے صحرا میں ٹھنڈے سائے کی ایک چادر بچھائے
جیسے شجر ہو کوئی
اندھیری راتوں میں کوئی روشن
چراغ جیسے
جھلستے پتھر کو سرد ہاتھوں میں بھر کے جیسے
کوئی ندی اپنی تہہ میں رکھ دے
دہکتی لو کی تپش میں ٹھنڈی
ہوا کے جھونکے کا لمس گالوں کو گدگدائے
پناہ لینے کو جنگلوں میں ہو ایک کٹیا
یہی تو ہر درد کا ہے درماں
یہی تو ماں ہے۔'' (یہی تو ہے وہ)

اور ماں کے وجودی پیکر سے محروم ہو جانے کے بعد جسم وجاں کی حالت اس اقتباس سے عیاں ہے:

''مگر دیکھو
کہ جب سے تم گئی ہو چھوڑ کر اس کو

میری امّی
وہ بچی سن رسیدہ ہوگئی ہے، کچھ دنوں میں ہی!''
لیکن اس سن رسیدہ بچی کو احساس ہے کہ اس کے سر پر اس کی ماں کی ردا ہے اور اس چادر کی بخیہ و بُن بھی۔

''رگوں میں اب تمہاری خوشبو
کا خوں رواں ہے
ہر ایک تاگے میں ابھی تک
وہی حرارت
جو مجھ کو اپنی گداز آغوش میں چھپا کر
مرے ٹھٹھرتے ہوئے بدن کو
جمود کی موت سے بچا کر
محبتوں کی لطیف گرمی سے ڈھانپتی ہے۔'' (تمہاری چادر)

یہاں ماضی کی قوس، حال کے دائرے سے منسلک ہوگئی ہے اور اس دائرے کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا، بلکہ یہ مستقبل کی طرف بڑھ رہا ہے۔

''یکا یک اک روپہلی صبح کے جھلمل اُجالوں میں
لچکتی جھومتی ڈالی پہ ایک رنگیں شگوفہ لہلہا اُٹھا
گلابی نرم ریشم سا
یہ کیسا معجزہ ہے؟ خود سے جیسے پوچھتی ہوں میں
نئی دنیا میں کھوئی اپنی بانہوں میں
سمیٹے رہنے دل کش پھول کو وہ مسکراتی ہے
بہت نازاں سی
اپنی زیست کا مقصد سمجھ کر
اب نئے جذبات کی شبنم میں بھیگی کھلکھلاتی ہے۔'' (تکمیل)

یہ زندگی کا نیا دائرہ ہے۔ اسے اوّل الذکر محرومی کا مداوا بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس دائرے کی ہر قوس متحرک ہے۔ اس میں حرارت بھی ہے۔ نمو کی داخلی قوت سے یہ دائرہ نشو ونما پا رہا ہے۔ لیکن اسے فنا سے مفر نہیں بلکہ یہ حقیقت کا بیانیہ بھی ہے کہ

''اجل، اجل ہے کہ آئینہ دار ہستی ہے''

پروین شیر کی خوبصورت یک موضوعی نظموں کی کتاب ''نہالِ دل پر سحاب جیسے'' بظاہر ماں سے محرومی کی سلسلہ در سلسلہ تمثال ہے لیکن درحقیقت یہ زندگی کا اثبات بھی کرتی ہے اور پروین شیر کی فکری رجائیت کی آئینہ دار بھی ہے جس کی مصور صورتیں تصویروں میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ ڈاکٹر ستیہ پال آنند نے درست لکھا ہے کہ

''اس کتاب میں جو کارنامہ پروین شیر نے کر دکھایا ہے، اس کی اردو میں مثال ملنی ناممکن ہے''۔

۔ بقیہ ۔
براہِ راست

مصوری کو منظور یا رد کیا کرتا تھا۔ آج مجھے خود ہی یہ پروقار عہدہ حاصل ہے۔ اس سو (۱۰۰) سال سے زیادہ پرانی آرٹ سوسائٹی کا ممبر بننے کے لیے کئی امتحانات سے گزرنا اور کامیاب ہونا پڑتا ہے۔ اگر پاکستان یا ہندوستان میں مجھے مصوری میں یہ پذیرائی ملتی تو اس کو بھی شاید شخصیت اور مالی حیثیت سے ملوث کیا جاتا۔ ایسی بچگانہ ذہنیت پر غصہ بھی کیسے آئے؟ یہ تو قابل رحم صورت حال ہے۔ ایسے عجیب وغریب خیالات رکھنے والوں کا سامنا کبھی نہیں ہوا سوائے اردو دنیا کے۔ میری کچھ شاعری پچیس سال قبل رسالوں میں شائع ہوئی تھی لیکن کتاب کی اشاعت کا خیال اس لیے آیا کہ مصوری کی طرح شاعری سے بھی فلاحی کام کرسکوں ایک منفرد کتاب سے جس میں مغرب ومشرق دونوں گلے مل رہے ہوں۔ یوں گھر سے باہر نکلی اور اردو دنیا کے گورکھ دھندے' چھل کپٹ دیکھ کر چکرا گئی۔ اتنی پستیاں دیکھیں جو ناقابل یقین ہیں۔ اب حیران نہیں ہوں رفتہ رفتہ عادی ہورہی ہوں اور اپنی حساسیت کے جاذب گھڑے کو چکنا گھڑا بنانے کی ناکام کوشش کر رہی ہوں شاید کامیاب ہوجاؤں۔ کہنے والوں کے منہ میں گھی شکر کہ سچ مچ کروڑوں کی مالکن بن جاؤں۔

☆ مشاہدے کی بات ہے کہ سمندر پار مقیم اہلِ قلم کو برصغیر کے بڑے اور جغادری ادیب بطور Tool اپنے مفاد کے لیے استعمال کرنے سے کبھی دریغ نہیں کرتے مگر اُن کی فنی حیثیت کا کھلے دل' دماغ سے اعتراف بھی نہیں کرتے۔ ہمارے سوال میں خوبصورت و پرکشش خواتین اہلِ قلم کو استثنیٰ حاصل ہے؟

☆☆ مجھے اس سے اختلاف ہے۔ میرا خیال ہے بہت کھلے دل ودماغ سے اعتراف کیا جاتا ہے اگر آپ کا کہنا سچ بھی ہو تو خوبصورت اور پرکشش خواتین اہل قلم کو اس سے استثنیٰ کیوں حاصل ہو؟ یہ ادب کی دنیا ہے فلم نگری تو نہیں۔

☆ ہمارا آخری سوال آپ سے یہ ہے کہ آپ مغرب بالخصوص کینیڈا میں اردو سرگرمیوں سے کس طرح کی توقعات رکھتی ہیں اور اُن میں بہتری لانے کے لیے آپ کے ذہن میں کیا تجاویز ہیں؟

☆☆ میں بدقسمتی سے اردو سرگرمیوں سے دور دراز ایک شہر میں مقیم ہوں۔ اگر اُن میں شامل ہوتی تو صورت حاصل پر نظر ڈالتی اور سوچتی۔ کچھ واقفیت کی بناء پر یہی کہہ سکتی ہوں کہ یہاں ادب میں سیاست اور گروہ بندی کو ختم کرنا ہی چاہیے۔

''دیواریں حائل ہو رہی ہیں''

پروفیسر قمر رئیس

(●)

برسوں پہلے جب کناڈا کے چھوٹے سے خوبصورت شہر ونی پیگ میں پروین شیر سے ملا تو پہلی نظر میں ہی لگا کہ ایسی موہنی شخصیت سامنے ہے جس کا ظاہری حسن' اس کے داخلی حسن وزیبائی کی پراسرار پرچھائیوں سے منوّر ہے جس کی نگاہوں کی نرمی اور محزونی میں انسانی دکھوں کا کرب پنہاں ہے۔ احمد فراز نے لکھا ہے کہ پروین یونانی دیومالا کی کوئی دیوی ہے۔ جسے انسانوں کے دُکھ درد کی آگ مضطرب رکھتی ہے۔ شاید یہی وہ آگ ہے جس نے اُن کے ہاتھ کو قلم' موءِ قلم اور مضراب تینوں کی اختراعی توانائی بخش دی۔ انہیں رنگوں اور انسانی جذبوں کی خوشبوؤں کا عرفان عطا کیا۔ سنگیت کی دلربا لہروں سے اُن کے وجد کو معمور کر دیا۔ انہیں ایک ایسی نگاہ دی جو مصور کی طرح کائنات کے جلوۂ صد رنگ کو دیکھتی' اور شاعر کی طرح اس سے محبت کرنے کا جنون پالتی ہے۔ پروین شیر سے ملنے اُن سے باتیں کرنے اور اُن کے سوچتے ہوئے احساس میں شریک ہونے کا تجربہ کم وبیش ایسا ہی ہوتا ہے جیسے ان کی شاعری اور صورت گری سے ہوتا ہے۔ مجھے یاد نہیں کہ ستار پر میں نے ان کے نغمے سنے ہوں لیکن اُن کے وہ نازک گیت ضرور سنے ہیں جو الفاظ اور رنگوں کے ساز پر وہ گاتی ہیں۔ اور دونوں کے موضوع' معنی اور آہنگ میں ایک ایسے اشتراک کی طرح داری کو بھی دریافت کیا ہے جسے تخلیقی حسن میں ڈھلی ہوئی اُن کی شخصیت کا کرشمہ ہی کہا جا سکتا ہے۔

''کرچیاں'' میں شامل اُن کی بیشتر تخلیقات ایسی ہیں جن کے بارے میں یہ کہنا مشکل ہوتا ہے کہ اُن کا حسن اور اُن کی معنویت رنگوں میں زیادہ نکھر کر سامنے آئی ہے یا الفاظ کی نغمگی میں ڈھل کر زیادہ سحر انگیز ہو گئی ہے۔ آرٹ کا جو ہر ایسے امیج یا تمثال کی تخلیق ہے جو انسانی فکر وتخیل اور احساسِ جمال کو بیک وقت متحرک کر سکے اور ساتھ ہی اُس کے دل میں انسان کے لیے دردمندی کا احساس پیدا کر سکے۔ پروین کی ان گنت Compositions میں ہمیں اس ہنر کی کارفرمائی صاف نظر آتی ہے۔ ایک چھوٹی سی نظم ''عراق'' کے یہ اشعار قاری کے وجود میں جن چنگاریوں کو ہوا دیتے ہیں وہی تاثر زیادہ شدت لیے اُن کی اس عنوان کی پینٹنگ میں محسوس ہوتا ہے۔

چار سو پھیلے ہوئے موت کے گہرے سایے
شہر بے خواب' در وبام سیہ پوش وملول
سرنگوں گنبد و محراب' شکستہ ایواں
ہر طرف ملبے میں ٹوٹی ہوئی دیواروں کے
آتش وخوں کے ہیں پیوند' ردائے شب پر
ہر طرف سیل بلا' ڈوبتی سانسوں کی کراہ
درد کی دھند میں ڈوبی ہیں فضائیں ساری
شعلے لہراتے ہوئے اٹھے چمن زاروں سے
شاخساروں کے جھلسنے کی صدا آتی ہے
اور فلک دیکھتا رہتا ہے بہ چشم حیراں
ابن آدم کے زمیں زاد کرشمے جن کا
رنگ بدلا ہے نہ بدلیں گی روایات کبھی

عراق کی لہولہو سرزمین کا یہ محاکاتی بیان نظم اور پینٹنگ دونوں کا جوہر ہے۔ پروین کی تخلیقات کے موضوعات میں وہی تنوع اور نیرنگی ہے جو ایک حساس اور روشن ضمیر انسان کے تجربات میں ہوتی ہے۔ انہوں نے دنیا کے ان گنت ملکوں کی سیر کی ہے۔ قدرت کے کھیلوں اور انسانی سرشت کے جھمیلوں کو ہر رنگ میں دیکھا ہے۔ ان ناطق رنگوں کی زبان کو سمجھا ہے۔ انہیں اپنی روح میں بسایا ہے۔ اس دھرتی کے سب سے حسین پھول یعنی بچے اور دکھوں اور محرومیوں کی بھاری فصلیں اٹھائے ہوئے بوڑھے پروین کے مستقل کردار ہیں۔ آسمان کا نیلا رنگ جو امن' شانتی' سکون اور آسودگی کی علامت ہے' اُن کا محبوب رنگ ہے جو ان کے تخلیقی عمل میں بار بار در آتا ہے۔ جو ان کی اندورنی بے چینی اور بے بسی کے کرب کو اظہار واقرار کی نئی راہیں دکھاتا ہے۔ پروین کا تعلق بہار کی سرزمین سے ہے۔ سدھارتھ کی زمین' جہاں ایک گھنے پیڑ کی چھاؤں میں انہیں نروان حاصل ہوا تھا۔ کبھی کبھی تو پروین کی نظمیں پڑھتے ہوئے خیال ہوتا ہے کہ وہ بھی شہزادے سدھارتھ کی طرح دکھوں بھری انسانیت سے اپنا تشخص پانے اور انسانی دکھ درد سے نجات کا راستہ ڈھونڈنے مغرب کے خیابانوں میں نکل پڑی ہیں۔ وہاں انہیں انفرادی اور اجتماعی طور پر ہجرت کے عذاب کا اپنی دھرتی اپنی تہذیب کی چھاؤں سے دور ہو جانے کا تجربہ بھی ہوا۔ اور یہ سارے تجربے کہیں راست اور کہیں علامتوں اور تمثیلوں کے بلیغ پیکر میں ان کے فن میں سمٹ آئے ہیں' اس تخلیقی اظہار نے انہیں یقیناً ایسا انمول سکون بخشا ہوگا جو کسی دوسرے مشغلہ سے حاصل نہیں ہوتا۔ بے بسی' تابوت' شہرِ خموشاں' سب سے بڑا دکھ اور ریزے جیسی نظموں میں اُداسی اور محزونی کا احساس ذات کے نقطہ سے پھیل کر ساری کائنات کو محیط ہوتا نظر آتا ہے۔ یہاں شاعرہ کچے شیشے کی کرچیاں اور سوکھے پھولوں کی پتّیاں چنتی نظر آتی ہے۔ یہی احساس ان کے الم انگیز تجربوں کی شرح کرتی تصویروں میں بھی ہوتا ہے۔ وہ تنہائی کا عذاب بھی اس طرح سہتی ہیں جیسے خود اپنے لہو میں نہا رہی ہوں۔ آزارگی' غم دیدگی اور تنہائی کا یہ کرب زا ماحول پروین کی نظموں میں ہی نہیں

غزلوں کے اشعار میں بھی حاوی نظر آتا ہے۔ جیسے

سرِ جادہ ہی کبھی' کوہ گراں پاتی ہوں
کبھی منزل پہ بیاباں کا سماں پاتی ہوں

چار سو دیواریں حائل ہو رہی ہیں
واپسی کا راستہ گم ہو رہا ہے

دل کا دروازہ شکستہ اور اکیلا
کس کی دستک کے لیے اب رو رہا ہے

جلا کے خاک نہ کر ڈالے روزگار کی دھوپ
کہ اب تو سر پہ ترے غم کا سائباں بھی نہیں

وہاں تلاش ہے خورشید کی زمانے کو
جہاں گھروں میں کسی شمع کا گمان بھی نہیں

وہ بے حسی کا تھا عالم ذرا خبر نہ ہوئی
کہ روشنی تھی سرِ رہ گزر کہ سایے تھے

شاعری میں اکثر دکھوں کا احساس زندگی کی سچائیوں کا عرفان بن کر نمودار ہوتا ہے۔ پروین کی شاعری اور مصوری دونوں میں انسانی دکھ درد کی حقیقت پسندانہ پیکر تراشی سے ہی احساس جمال کی دولت ہاتھ آتی ہے۔ درد بھرے نغمے حظ و مسرت بخشتے ہیں۔ لیکن یہ پروین کی پناہ گاہیں نہیں ہیں۔ حقیقت پسندی انہیں اس سے آگے کے سچ کا راستہ دکھاتی ہے۔ وہ اپنے وطن میں انسان کی مظلومی اور محرومی کے دردناک مناظر دیکھتی تھیں لیکن ہجرت کر کے جب وہ نئی دنیا میں پہنچتی ہیں تو وہاں بھی انسان کی پامالی اور اس کے استحصال کے منظر ہی انہیں نظر آتے ہیں۔

بہت اُمید لے کر گھر سے نکلی تھی
میں سمجھتی تھی نئی دنیا بہت ہی خوبصورت ہے
میں سمجھتی تھی اندھیروں سے نکل کر زندگی کا نور پاؤں گی
میں رنجوریاں اپنی بھلاؤں گی
مگر میں نے وہاں دیکھا
وہ بتلانے سے قاصر ہوں
وہاں بھی رات کے سایے اجالوں پر مسلط تھے
نئی دنیا میں جا کر مجھ کو گھر کی یادیوں آتی رہی جیسے
خزاؤں میں گلابی موسموں کے رنگ یاد آئیں

نئی چمکتی ہوئی دنیا سے مایوسی کے نوحے دوسرے نظموں اور اشعار میں بھی ملتے ہیں لیکن پروین کے آرٹ میں دو پہلو قابل توجہ ہیں۔ اوّل یہ کہ مخزونی اور احساس غم کے باوجود وہ اس سیاہ سمندر میں ڈوب نہیں جاتیں اور نہ ہی تنہائی کا آسیب اُن کی متحرک اور مضطرب ذات کو اپنی گرفت میں لے پاتا ہے۔ یہ صحت مند عناصر اُن کی شاعری اور مصوری دونوں میں اپنا جلوہ دکھاتے ہیں۔ چند اشعار دیکھئے:

اس ریگ زارِ تپیدہ میں کئی راستے ہیں ہرے بھرے
اسی خارزار سے قافلے گل و نسترن کے گزرتے ہیں

ہونے نہ پائے پھولوں کا محتاج گلستان
دل کے ہزار زخم ہمیشہ کھلایئے

تاریک ہو نہ پائے کبھی دامن فلک
پلکوں سے تابہ صبح ستارے جلایئے

آرزومندی اور امید کی روشنی اُن کے یہاں اس لیے تابندہ ہے کہ وہ کائنات کے ازلی حسن، فطرت کے بے ساختہ اور سدا بہار تبسم اور انسانی رشتوں کے تقدس پر ایمان رکھتی ہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ زندگی اُن کے یہاں سلسلۂ خیال نہیں' سلسلۂ عمل ہے۔ جمود نہیں تحرک ہے۔ تعطل نہیں تفاعل ہے۔ اس لیے اُن کی اکثر تصویروں میں جو منظر ابھرتے ہیں ٹھہرتے ہوئے نہیں متحرک ہیں۔ ان میں بے قراری کا وفور ہے۔ مثلاً ایک تصویر Serene میں پاٹ دار دریا کی لہریں ' کنارے کے جنگل اور پودے اور شاخیں سب ڈولتی ہوئی اور متحرک ہیں زندگی کی علامت ہیں۔ اسی طرح ایک دوسری تصویر Meditation میں ایک بزرگ عبادت میں مشغول ہیں اور اُن کے گرد فطرت کے سارے مظاہر' دریا' اس کی لہریں' پرندے دھیمے دھیمے انداز سے گویا اسی عبادت کے عمل کا ایک جاندار حصّہ نظر آتے ہیں۔ تصویر کے سنگین اور متین رنگ بھی عبادت کی حرمت کا احساس دلاتے ہیں۔ میں فن مصوری کا پارکھ نہیں ہوں اس لیے ان تصویروں کی فنی باریکیوں کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا البتہ اس فنکار نے اپنی شعری Compositions میں اپنے فکر و تخیل کی اداس اور المیہ دُنیا کو جس اُجلے فارم میں رچا بسا کر پیش کیا ہے اور اس عمل میں جس ہنرمندی کا ثبوت دیا ہے اسی تخلیقی محویت سے اس نے کینوس پر رنگوں اور لکیروں کا جادو جگایا ہے اور شاید اُن کے نغموں اور ستار کے مدھر جھالوں کے زیر و بم میں بھی اسی حسن آفریں تخلیقی وجدان کی کارفرمائی رہی ہوگی۔ پروین کی ذات کو بلاشبہ قدرت کے بے اماں تخلیقی حسن کے فیضان کا انعام ہی کہا جائے گا۔

''اب کسی سے محبت نہ کرنا''

عبداللہ جاوید
(کینیڈا)

ایک مرتبہ کسی نے فون پر پوچھا۔''آپ پروین شیر کو جانتے ہیں؟ جرمنی سے سوال کرنے والے نے یہ سوال کینیڈا کے حوالے سے کیا تھا۔''

''اللہ نے بچایا ہے۔''میں نے شیر کے حوالے سے جواب دیا۔

''کیا مطلب؟''سوال کرنے والے نے ہنستے ہوئے مزید سوال کر دیا۔

''سیدھی سی بات ہے۔میں شیروں سے ڈرتا ہوں۔''میں نے جواب دیا۔

احمد فراز نے پروین شیر کی ''شیری'' سے قطع نظر کر لیا لیکن خونخواری سے قطع نظر نہ کر سکے چنانچہ پروین شیر پر ان کے تاثرات میں دو تین مقامات پر ''خون'' کا تذکرہ ملتا ہے اوّلین فقرے میں ''خونِ جگر'' کا حوالہ ہے اور ایک فقرہ کچھ یوں ہے''ان سب میں شعر کہنا جان جوکھوں کا کام ہے۔میرا تجربہ ہی نہیں بیشتر تخلیق کاروں کا یہی خیال ہے کہ جب تنِ شاعر میں سیروں خون صرف ہوتا ہے تب کہیں ایک مصرع تر کی صورت نظر آتی ہے۔'' آپ نے دیکھا احمد فراز سیروں خون کے صرف کی بات کر رہے ہیں۔ایک مصرع تر کی تخلیقی میں سیروں خون صرف ہو تو ایک دیوان کی تخلیق پر کتنا خون صرف ہوتا ہوگا؟ اس ضمن میں فراز اپنے ہم عصر سینئر شاعر ناصر کاظمی کا مندرجہ ذیل شعر درج کر دیتے تو خو ن تولنے کی علّت سے محفوظ رہتے

پہروں آنکھیں نم رہیں دل خوں ہوا
تب کہیں اک شعرِ تر موزوں ہوا

گفتگو پروین صاحبہ کے نام کے ساتھ ''شیر'' کے لاحقے پر ہو رہی تھی اس لاحقے نے میرے خیال کو اپنے محبوب شاعر کیٹس تک پہنچا دیا اس نے اپنی محبوبہ کو چیتے سے تشبیہہ دی تھی۔جب ''چیتے'' کی شبیہہ میری آنکھوں کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی تو مجھے کیٹس پر بے حد بے پیار آیا تھا۔میں نے اس کی محبوبہ کا تصور کرنے کی بہت کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا البتہ میرے ذہن میں حُسنِ قاتل (Fetal Beauty) کا نظریہ اجاگر ہو گیا۔

ہمیں اس سے قطعی انکار نہیں کہ ''شیر'' پروین کے میاں ہوں گے۔ ہوں گے کیا صد فی صد ہیں۔احمد فراز نے پروین شیر کو یونانی ضمیمات کی دیوی قرار دیا ہے۔جس کا ایک دل، دو آنکھیں اور چار ہاتھ ہیں۔ہمیں یقین ہے کہ احمد فراز نے پروین کو ایک دل محض اس خوف سے دیا ہے کہ اگر وہ ایک سے زائد دلوں کی بات کرتے تو ان کے شوہر وارث شیر کو برا لگ سکتا تھا اور شیر تو پھر شیر ہی ہوتا ہے۔حمایت علی شاعر نے جب یہ دیکھا کہ فراز نے یونانی دیومالا پر ہاتھ مارا ہے تو انہوں نے دیوی پروین کو مقامی رنگ دینے کے لیے سنکھ پھونکا۔سنکھ کا پھونکنا ہی تھا کہ پروین شیر کے جسدِ خاکی میں دیوی سرسوتی حلول کر گئیں۔جو علم اور موسیقی کی دیوی ہیں۔اب میں شاعر صاحب کی بات کو اس منطقی آغاز تک لوٹا کر یہ جتانا نہیں چاہوں گا کہ سرسوتی اپنی اصل میں دریا ہے،نندھو دریا اور دریا بھی وہ جو مہادیو کی جٹاؤں سے پھوٹا تھا۔اس طرح سرسوتی دیوی سورگ سے وارث شیر کی دنیا میں براجمان ہو گئیں۔

ہمیں جناب وارث شیر کا ممنونِ احسان ہونا پڑے گا کہ موصوف نے پروین شیر کے معاملے میں روایاتی شوہر کا رویہ اختیار نہیں کیا اور وسعتِ ذہنی و قلبی کا ثبوت دیتے ہوئے ان کو شعر و ادب،فن اور موسیقی سے جوڑے رکھا۔ظاہر ہے اس ضمن میں ان کو اپنے قیمتی وقت کی قربانی دینی پڑی ہوگی۔اگر وہ ایسے نہ ہوتے جیسے وہ ہیں تو اردو شعر و ادب ایک عظیم شاعرہ سے اور دنیا ایک بڑی مصوّرہ سے محروم وہ جاتی۔

پروین شیر پر زبان کھولنے میں یا قلم طرازی کرنے میں بڑی دشواری کا سامنا ہے۔ایک جانب ان کی ایک سے بڑھ کر ایک شاہکار تصاویر ہیں جن میں خطوط، دائرے اور نیم دائرے رقصاں ہیں اور رنگ بول رہے ہیں، دوسری جانب حرف و مو، ذہن و دل کی دامن کش ہیں۔''کہاں چلا ہے اپنی بصارتوں اور سماعتوں کے لیے ہوئے؟ زندہ لفظوں کی خلاقی،مصوری اور نغمگی۔ سب کچھ یہاں موجود ہے یہ پروین شیر کی شاعری ہے جس میں لفظ ہی تجسیم کرتے ہیں اور لفظ ہی تجرید۔'' تیسری جانب آرگنی اور ستار نغمہ سرا ہیں۔مغربی ساز جو مغربی موسیقی کی فضا تشکیل دے رہے ہیں تو خالص مشرقی ساز، ستار جو امیر خسرو سے منسوب ہے مشرقی یا یوں کہیے ہندو پاک سنگیت کا رنگ جما رہا ہے۔بقول حالی:

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب دیکھئے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں

ان کی بنائی ہوئی تصاویر اور مرقع جات پر،ان کی ساز نوازیوں پر یا ان کی شاعری پر۔اُن پر لکھنے والوں نے ان کے تینوں شعبہ ہائے تخلیق پر لکھا ہے لیکن میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اس نشست میں ان کی شاعری پر زیادہ توجہ دوں کیونکہ بصورت دیگر مجھے خدشہ ہے کہ میں ادھر کا رہ سکوں گا اور نہ اُدھر کا۔

پروین شیر اس معاملے میں تو قسمت کی دھنی ہیں کہ جناب وارث شیر نے ان پر شوہریت کا بوجھ نہیں ڈالا اور ان کو اظہار اور ابلاغ کی مکمل آزادی دی۔انہوں نے اس آزادی سے فائدہ اٹھا کر صوت و حرف،قرطاس و قلم،خطوط و دوائر و نیم دوائر،موئے قلم و رنگ و لوان اور ان کے علاوہ ساز و آواز کے تعاون سے اپنی حسی شخصیت،تخلیقی کرب کی جمال آفرینی،اور فنی مہارت کی کرشمہ سازی

کو امکان کی ارفع سے ارفع سطحات تک پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور ہنوز معروفِ تگ وتاز ہیں۔ دوسری جانب ان کو وقت زیادہ سازگار نہیں ملا۔ ان کی تقدیر اس معاملے میں یاور ثابت نہیں ہوئی۔ میرے ایک پسندیدہ شاعر جان کلیئر کے بارے میں وضاحت کرتے ہوئے ہیرولڈ بلوم لکھتا ہے ''جان کلیئر ایک بڑا شاعر تھا لیکن اس کی بڑائی بلیک، ورڈس ورتھ، کولرج، بائرن، شیلے، اور کیٹس سے زمانی قربت میں گم ہوگئی۔'' اسی طرح پروین شیر کو بھی عجیب وقت ملا۔ ان کے وقت اردو شاعری کی چند جانی مانی بڑی نسوانی آوازیں اپنی پوری فکری، صوتی اور آہنگی توانائی کے ساتھ موجود تھیں اور ہیں۔ پروین شیر کے ساتھ ایک مشکل اور بھی تھی۔ اس کی ادبی زندگی کے عین آغاز کے سے اس کی ہم نام شاعرہ پروین شاکر جو عمر اور تجربے میں اس سے بڑی تھی اہلِ ذوق کے ذہنوں اور دلوں پر راج کر رہی تھی۔ وقت کی ان مشہور شاعرات اور خاص طور پر پروین شاکر کے سامنے پروین شیر اور اس کی شاعری پر کون توجہ دیتا۔ پروین شیر پر اپنے مضمون مطبوعہ ''سیپ'' کراچی (خاص نمبر شمارہ ۷۴، ۲۰۰۵ صفحہ ۹۰) میں یہ خیال ظاہر کر چکا ہوں کہ وہ علامہ اقبال کے بعد شاعروں کے صف اوّل میں شامل ہوسکتی ہے اور شاعرات میں تو وہ صفِ اوّل میں بھی مقامِ اوّل کی حقدار معلوم ہوتی ہے۔

پروین شیر کا اگر پروین شاکر سے تقابلی مطالعہ کیا جائے (جو ناگزیر بھی ہے) تو حیرانی کے ساتھ یہ نتیجہ نکالنا پڑتا ہے کہ پروین شیر نے پروین شاکر کے اقلیم شعر سے اپنی زمینِ سخن کو علیحدہ رکھا۔ جب میں اس طرح کی کوئی بات کرتا ہوں تو اس اعتماد کے ساتھ کرتا ہوں کہ میرے قارئین میرے ایسے کسی فقرے سے یہ مطلب اخذ نہیں کریں گے کہ پروین شیر نے شعوری طور پر ایسا کیا۔ یوں بھی شاعری کا رشتہ شعور سے واجبی سا ہے اور اس کا واجبی سا رہنا ہی شاعر اور شاعری دونوں کے لئے غنیمت ہے۔ میں نے پروین شیر کے وقت کے بارے میں بات کی لیکن مجھ سے یہ چُوک ہوگئی کہ وقت کے ساتھ مقام کا ذکر نہیں کیا۔ دراصل ان دنوں میں اس خوش فہمی میں زیادہ مبتلا رہنے لگا ہوں کہ میرے قارئین میری سابقہ تحریروں کو ذہن میں تازہ رکھتے ہوں گے چنانچہ اگر میں مقام اور وقت کی جگہ صرف وقت لکھوں بھی تو بغیر کسی صراحت کے میرے قارئین تک میری بات پہنچ جائے گی۔ میرے قارئین اس حقیقت سے آگاہ ہوں گے کہ مکاں کے بغیر زماں کا قیاس ناممکن ہے۔ پروین شاکر اور پروین شیر کی شخصیات میں امتیازی فرق کا باعث دونوں کے مابین مکان وزماں کا فرق ہے۔ پروین شیر نے پٹنہ، بہار، ہندوستان کی دنیا چھٹپن میں چھوڑی۔ (والد کا ساتھ بھی بہ سبب وفات نو عمری میں چھوٹا) کراچی، پاکستان کی دنیا کو ٹین ایج (اوائل شباب) بلکہ یوں کہنا چاہیے مغربی محاورے کے مطابق سویٹ سکسٹین (میٹھے سولہویں سال) میں خیر آباد کہا۔ ان کے میاں وارث شیر ان سے بہت پہلے نہ صرف کینیڈا میں آباد ہو گئے تھے بلکہ مقامی تہذیب وثقافت میں پورے طور پر ڈھل چکے تھے۔ پروین شیر تو یہ تک کہتی ہیں کہ ان کو واپس نیم پاکستانی اور نیم بہاری رنگ میں لانے کا کارنامہ بھی موصوفہ ہی نے انجام دیا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ پروین شیر کی دنیا پروین شاکر کی دنیا سے بلکہ بیشتر شاعروں اور شاعرات کی دنیا سے یکسر مختلف رہی۔ اس نے اس یکسر مختلف دنیا میں اپنی شاعری، مصوری اور ساز نوازی کی بساط بچھائی جو پاکستان اور ہندوستان کی ایسی بساطوں سے مختلف تھی یہاں میرے قاری یہ سوال اُٹھا سکتے ہیں کہ جب وہ غزلیں کہتی اور ستار بھی بجاتی ہے تو اس پر یہ قول کس طرح صادق آسکتا ہے۔ اس کے جواب میں یہ عرض کروں گا کہ اس نے ستار سے رشتہ جوڑا تو آرگن سے ناطہ کب توڑا۔ وہ اگر غزلیں کہتی ہے تو ان کے مقابل میں نظموں کے انبار لگا دیتی ہے۔ نظموں میں کتنی نظمیں انگریزی نظموں کی بو، باس سے خالی محسوس ہوں گی؟ پہلی نظم ''ماں'' میں ہندوستان اور پاکستان کی نہ تو ماں ہی اور نہ ہی بیٹی ملتی ہے۔ اس کا موضوع انسان پر وقت کا جبر واستبداد ہے۔ اس نظم کی بیٹی کوئی ننھی معصوم بچی نہیں ہے بلکہ ایک عورت ہے، تھکن سے چور عورت جس کا بدن گردشِ دوراں کی زد میں ٹوٹ پھوٹ کر بوسیدہ ہوگیا ہے۔ ٹی، ایس، ایلیٹ کے (Hollow man) ''ہالومین'' کھوکھلے آدمی کی تانیث کھوکھلی عورت جس کو ماں کی طلب ہے محض اس لیے کہ وہ ایک ایسی شاعرہ کی تخلیق ہے جو قنوطیت سے اپنا دامن بچانے میں لگی ہے ورنہ ایک سرسری انداز سے پڑھنے والا قاری بھی سمجھ سکتا ہے کہ اس بیٹی کو کس ''ماں'' کی ضرورت ہے۔ ذرا اس بیٹی کو دیکھئے تو:

زندگی کے دور کتنے آچکے
گردشِ دوراں سے جی بیزار ہے
آبلہ پائی اور لمبا سفر
جاں بہ لب ہوں، اب تھکن سے چُور رہوں
دیکھ اِک بوسیدہ پیکر میں چھپی
ہوں۔۔۔۔

اس نظم کے فوراً بعد ''تجربہ گاہ'' ہے۔ اس کے پہلے مصرعے سے لے کر نظم کی پوری ساخت اور برتاؤ آپ کو کیسا لگتا ہے؟ رہی مصوری تو یہ کہنا درست ہوگا کہ پاکستان اور ہندوستان کی مصوری سے اس کا تعلق ہوگا بھی تو محض نام کا۔

پروین شیر کو پروین شاکر سے فطری طور پر جدا کرنے والا ایک بہت بڑا فرق (اگرچہ ذاتی اور نجی نوعیت کا ہے) وارث شیر سے متعلق ہے۔ پروین شیر کو وارث شیر میسر ہیں جب کہ پروین شاکر کی ساری زندگی میں کسی مرحلے پر کسی وارث شیر کے وجود کی تام تحریر نہیں ملی۔ اس صراحت کے باوجود ایک حیران کن حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ پروین شاکر کی مانند پروین شیر بھی اچھی خاصی قبول صورت کے برخلاف عاشق ہیں۔ معشوق نہیں۔۔۔۔

کوئی چاہے نہ تمہیں میری طرح
اب کسی سے نہ محبت کرنا

اوراس سے نہ رہی کوئی طلب
بس مرے پیار کی عزت کرنا

پروین شاکر

جو تم نے سنگ اُٹھائے ، وہ ہم کو پھول لگے
مری وفا بھی تمہارے لئے جفا ٹھہری

پروین شیر

بہت شدید سزا پائی اپنے قامت کی
میں جھک کے بھی نہ سما پائی اس کی نظروں میں

پروین شیر

پروین شاکر نے اپنے مکان وزماں کو اپنے اشعار میں زنجیر کیا ہے اور پروین شیر نے اپنے مکان وزماں کو۔ یوں تو پروین شیر نے کینیڈا کی نئی دنیا میں آدمی کو بے شمار ایسے عذابوں میں مبتلا دیکھا جو پرانی دنیا میں عام ہیں۔ یہ وہ دکھ ہیں جو کسی نہ کسی معاشرتی جبر کے ضمرے میں آتے ہیں اور کمی بیشی کے فرق کے ساتھ پوری دنیا میں موجود ملتے ہیں۔ پروین شاکر بیسویں صدی کی شاعرہ ہیں۔ جب کہ پروین شیر اکیسویں صدی کے عشرۂ اوّل کو پار کر رہی ہے لیکن اس کی شاعری، مصوری اور موسیقی مزاجاً بیسویں صدی سے متعلق ہے۔

بیسویں صدی کا سرسری جائزہ یہ بتاتا ہے کہ وہ انسانی تاریخ کی ایک اہم صدی تھی۔ تاریخی وقت کے حساب سے وہ دوسرے اور تیسرے ہزارے کے درمیان کھڑی تھی۔ وہ بے حد متنوع، تیز اور ہنگامہ پرور وقت کا استعارہ کہلانے کے لائق ثابت ہوئی۔ دوسرے عشرے کے نصف اوّل کو پہنچتے پہنچتے وہ پہلی عالم گیر جنگ عظیم کے عذاب سے دوچار ہوئی یا دنیا کو دوچار کرتی ہے پھر پانچویں عشرے کے نصف کو چھو کر وہ دوسری عالم گیر جنگ سے گزرتی یا گزارتی ہے اس جنگ کا خاتمہ جاپان کے دو شہروں۔ ہیروشیما اور ناگاساکی۔ کی جوہری بموں سے خوفناک اور دیرپا تباہی پر۔ دو سپر طاقتوں اور ان کے مابین ایک طویل سرد جنگ اور بالآخر ایک سپر طاقت کے قیام واستحکام پر ہوتا ہے جو پوری دنیا کو اپنے فوج بوٹوں تلے روندرہی ہے۔ بیسوی صدی کا ادبی منظر سرسیّد اور راجا رام موہن رائے کی اصلاحی اور سماجی تحریکوں سے وابستگی سے تشکیل پاتا ہے اور آگے چل کر ایک انتہائی طاقت ور اور مقبول تحریک ''ترقی پسند ادب'' کی تحریک پر منتج ہوتا ہے۔ ترقی پسند ادب کی تحریک اردو، ہندی، بنگالی، پنجابی، سندھی زبانوں میں نفوذ کرتی ہے۔ پاک وہند کی دوسری زبانوں پر اس کا اثر واجبی سا ہوتا ہے۔ پروین شیر کی ذہنی وفنی بلوغت کا زمانہ اس مقبول عام تحریک کا دم آخر ہے۔ اس کی رخصتی کا نقارہ بج چکا ہے۔ مشاہیر ترقی پسند اکابرین یا تو وفات پا چکے ہیں یا اپنا ادبی اعتبار کھو چکے ہیں۔ یہاں یہ سوال نہ اُٹھا لیجیے کہ پروین شیر نے خود تحریری اعتراف کر رکھا ہے کہ ممتاز ترقی پسند اکابر علی سردار جعفری کے آشیر واد اور ہمت افزائی نے ان کو شاعری کا سفر جاری رکھنے پر اکسائے رکھا اس میں کوئی شک نہیں کہ علی سردار جعفری جیسے کٹر ترقی پسند نے ان کی پیٹھ ٹھونکی اور سر پر ہاتھ رکھا ہوگا لیکن پروین شیر کی شاعری سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ مرحوم نے ان کی ترقی پسند تحریک کے اساسی یا کسی ثانوی منشور پر بیت لی تھی۔ ان کی شاعری فکری یا حسّی اعتبار سے کسی بھی ترقی پسند شاعر سے متاثر نہیں معلوم ہوتی۔ اور تو اور ان کی شاعری میں مقصدیت بھی اتنی نہیں ملتی جتنا یہ خود ڈھونڈورا پیٹتی ہیں۔ جہاں تک میں نے پڑھا اور سمجھا ہے پروین شیر کی شاعری بیسوی صدی کی ''جدیدیت'' کی اس صورت سے متاثر معلوم ہوتی ہے جو انگریزی اور فرانسیسی شعروادب میں منعکس ہوئی۔ ان کا دل لاکھ مشرقی سہی لیکن ذہن مغربی ہونے کی طرف مائل نظر آتا ہے ان کی مصوری کا بھی یہی حال ہے۔ پاکستان اور ہندوستان کی مصوری سے اور خاص طور پر اس کی جڑوں سے مجھے کوئی رشتہ دکھائی نہیں دیتا۔ البتہ اس کی شاعری کو ''مابعد جدیدت'' یوروپی وجودیت اور دیگر تحریکات سے جوڑا نہیں جاسکتا۔ یہ اور بات ہے کہ یہ ساری تحریکات کچھ گڈمڈ سی ملتی ہیں۔ بین السطور میں متضاد فکری اور حسّی ابلاغ بیسویں صدی میں عام چلتا ہے اس معاملے میں رابرٹ فراسٹ تو پڑھنے والے کو حیران کر کے رکھ دیتا ہے۔ لطف کی بات تو یہ ہے کہ آپ بین السطور پر دھیان نہ بھی دیں تو نظم میں تشنگی کا احساس نہیں ہوتا رابرٹ فراسٹ کے بین السطور کو نظر انداز بھی کیا جاسکتا ہے میں ان مسائل کا سرسری ذکر کرنے پر اس لیے مجبور ہوں کہ پروین شیر کا زمانہ سچی بات ہے، ''مابعد جدیدیت'' سے زیادہ لگا کھاتا ہے اس کا زیادہ تعلق جنگوں سے ہے۔ چنانچہ کچھ ناقدروں نے اس کا آغاز ۱۹۱۴ء سے بتایا ہے دوسرے لفظوں میں جنگ عظیم اوّل سے ''جدیدیت'' انسان کو فرد اور معاشرے کے تعلق کو سمجھنے کی ترغیب دیتی ہے زندگی میں جدید معنویت کی تلاش پر مامور کرتی ہے۔ بدلتے ہوئے حالات کے مطابق ایک نئے نظام فکر کی طالب ہوتی ہے جبکہ ''مابعد جدیدیت'' ایسی ہر تلاش کی نہ صرف نفی کرتی ہے بلکہ اس کو حماقت قرار دیتی ہے وہ زندگی کے ہر نظام کو لایعنی قرار دیتی ہے۔ ''مابعد جدیدیت'' کے مبلغ لیوٹارڈ کا جیک دریدا اور بودلیر کے نظریات ظاہر میں منطقی اور وزن دار لگتے ہیں لیکن مابعد جدیدیت نے دنیا کو بڑا ادب نہیں دیا بہرحال اپنی جگہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب دنیا کے حالات ایسے ہوں کہ قدیمی اقدار کو باہر نکال دیا گیا ہو اور ان کی جگہ کسی طرح کے اقدار نے نہ لی ہو تو وجودی نظریات، تشکیک، مابعد جدیدیت کی لایعنیت کے ماسوا، ادیب، شاعر اور فنکار کے پلّے اور کیا رہ جاتا ہے۔

اس صورت حال کو پروین شیر کچھ اس طرح بیان کرتی ہیں۔ ''میٹیر یلزم'' جنگ اور Power کی دنیاؤں کے تجربے۔ جہاں Power کو بے بسی کے آنسوؤں سے خریدا جاتا ہے۔ کچھ جانے اور کچھ انجانے میں جہاں صرف Me & My Self جیسے الفاظ سنائی دیتے ہیں اپنے سوا کچھ نظر نہیں آتا'' پروین شیر کی سوچ سے آپ واقف ہوگئے۔ اب آپ ہی یہ بتایئے کہ یہ سوچ

اس کو کدھر لے جا رہی ہے۔ پروین شیر جب بھی سوچتی ہے ایک آدمی کی مانند سوچتی ہے جو دل دردمند کا مالک ہے اور وہ دل سے سوچتا ہے اسے کسی بھی نظامِ فکر سے کچھ لینا دینا نہیں۔ اپنی منظومات میں یا کسی اور مقام پر اس نے یہ بھی اعتراف کیا ہے کہ اس کے سر میں بھی ایک دل ہے۔ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ اس کو پڑھنے والا اس کی شاعری میں ایک چھپا ڈھکا فکری نظام محسوس ضرور کرتا ہے۔ میں نے بھی ایسا ہی محسوس کیا۔ اس کی شاعری کے اس نظام کے دو محور ہیں۔ ایک کو میں ناگزیر جبریت کہوں گا اور دوسرے کو دردمندی (Pathos) کا نام دوں گا اس کی کتاب ''کرچیاں'' لفظ، لفظ، فقرہ، فقرہ اور ورق، ورق ناگزیر جبریت کے احساس اور دردمندی کی خلش سے معمور ہے۔ کتاب کی اولین نظم میں ناگزیر جبریت اور دردمندی کا مشاہدہ ہم پہلے ہی کر چکے ہیں۔ دوسری نظم ''تجربہ گاہ'' کے اہم محور یہی دو ہیں۔ اس وقت میں چاہتا ہوں کہ آپ اس کا تقابلی مطالعہ شیکسپیئر کی مشہور زمانہ نظم (گیت) سے کریں۔ ''تجربہ گاہ'' کا مصرع اوّل ہی اس مماثلت کی نشاندہی کر دیتا ہے ''یہ دہر ایک لیب ہے'' (پروین شیر) ''ساری دنیا ایک سٹیج ہے'' (شیکسپیئر) دونوں تخلیقات کو مقابل کر کے پڑھیں اور پروین کو داد دیں۔ البتہ غالبؔ کے شعر کو مقابل نہ ہی لائیں تو بہتر ہوگا۔

بازیچۂ اطفال ہے، دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

اس نظم میں چہرے کی تبدیلی کا مسئلہ اٹھایا گیا ہے۔ ایک چہرے پر کوئی دوسرا چہرہ یا کئی چہرے چڑھانے کا معاملہ تو اردو شاعری میں پروینؔ شیر کے زمانے تک ایک کلیشے کی صورت اختیار کر چکا لیکن زندگی یا عمر گزراں کی زد میں چہرہ گنوانے کا تجربہ اور اس کی ناگزیریت کا موضوع عام نہیں ہوا تھا۔

جیسے جیسے پروینؔ شیر کی شاعری میں ناگزیر جبریت اور دردمندی کے عناصر سے دوچار ہوتے جائیں گے آپ بھی میری مانند یہ سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ یہ فکر اور حسّیت بیسویں صدی کی مغربی فکر اور حسّیت ہے جو شاعری اور فکشن میں ہمارے مشاہدے میں آتی ہے پروینؔ کی نظم ''تجربہ گاہ'' میں اگر میں یہ کہوں کہ ٹی۔ ایس ایلیٹ کی ''ویسٹ لینڈ'' اور ''ہالومین'' دونوں کا لمس ملتا ہے تو آپ ضرور محسوس کر کے دیکھئے۔ کیا پتہ آپ میرے ہم خیال ہو جائیں۔

اوپر تقابلی مطالعے کی بات کر ہی دی تو یہ بھی عرض کرنا لازم آتا ہے کہ حسن بیان و ابلاغ کے معاملے میں پروین کی نظم شیکسپیئر کی نظم کے آگے مبتدیانہ نظر آتی ہے۔ تاثر کے معاملے میں بھی بے حد کمزور ہے۔ ایسا ہونا عین فطری ہے۔ کیا پروینؔ کا برش اور اس کے رنگ اور الوان یکساں معیار کی تخلیقات پر منتج ہوتے ہیں؟ جہاں تک میں نے غور کیا ہے اس نظم میں فکری مشمولات اور حسی مشمولات میں توازن برقرار نہیں رہ سکا۔

ایک بار پھر کہوں گا کہ پروینؔ شیر کی شاعری تقدیر کی ناگزیر جبریت (جب یہ جبریت قوموں کے تناظر میں ظاہر ہوتی ہے تو تاریخ کی جبریت کہلاتی ہے) اور پیتھاس کی شاعری ہے۔ زندگی یا تقدیر کی ناگزیر جبریت اس کے مشاہدے کے راستے اور پیتھاس (دردمندی) جذبے کی برانگیختگی کے راستے اس کی شاعری میں داخل ہوئے ہیں۔ یہی اس کی شاعری کا تانا بانا ہیں جن سے اس کی شاعری کے وژن (بصیرت) کی بنت ہوئی ہے۔ اس بصیرت کے ابلاغ کے سلسلے میں وہ مختلف النوع امیجنریز یا تصاویر کا سہارا لیتی ہے۔ یہی وہ ٹیکنیکی افق ہے جس پر اس کی شاعری اور مصوری دونوں ہم آہنگ ہو کر کارِ تخلیق میں اس کا ہاتھ بٹاتے ہیں، رہا سازینہ تو وہ اندر سے ابھر کر اس کی شاعری اور مصوری کے صوت اور رنگ میں رچ جاتا ہے۔

سائنسی ''تجربہ گاہ'' سے گزر کر اس کی بصیرت کا منظر نامہ کسی تپتے ریگستان میں پھنسے ہوئے پیاسے انسانوں پر مشتمل ہو گیا ہے جو آپ کے دھوکے میں سراب کی جانب بڑھتے ہیں اور ریت چبا کر پیاس بجھانے کی اور زندہ رہنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ اس کو شاعرہ نے ''خود فریبی'' کا عنوان دیا ہے ہندوستانی فکر یا ہند آریائی فکر کے تحت یہ سب اور بہت کچھ ''مایا'' ہے (یہاں ہند اسلامی فکر سے بھی حوالہ دیا جا سکتا ہے) یہ نظم بھی ''ناگزیر جبریت'' کے تصور سے زیادہ دور نہیں ہے اور پیتھاس سے خالی بھی نہیں ہے کیونکہ مشیت جابر ہو تو ہو، شاعرہ جابر نہیں۔ بھاپ انجمن (جس پر ایک کلیسا کے پادریوں نے سنگ زنی بھی کی تھی) کی ایجاد سے آدمی کی دنیا میں ''صنعتی انقلاب'' آیا۔ ہندوستان کے پنڈت چانکیہ کی آتما نے میکیاولی کے شریر میں ایک نیا قالب پایا اور پھر وہ ہوا جس کو میں نے کسی جگہ یوں بیان کیا ہے۔

''راجا کا پرانا محل گرتا ہے، نیا بنتا ہے بڑھیا اپنے برتن بھانڈے (پرانی اقدار) اٹھالے''۔ پرانی اقدار گئیں۔ ان کے جانے کے ساتھ حکمت کی پرانی باتیں، خرد افروزی اور دانش کی کہاوتیں اور ضرب الامثال بھی اپنی معنویت سے تہی ہو گئیں۔ ان ہی میں سے ایک کی شکست پروینؔ کی نظم ''مثل بمصداق'' کی اساس ہے جبرِ مشیت کی ناگزیری اور دردمندی اس سٹائر میں بھی موجود ہیں۔ یہ جو میں ہر بار ناگزیر جبریت کے ساتھ پیتھاس (دردمندی) پر اصرار کرتا جا رہا ہوں تو میرا مقصد یہ ہے کہ پڑھنے والے پروینؔ شیر کی شاعری میں پیرے ڈاکس (Paradox) کے عنصر کی ماہیت سے آگاہ ہو جائیں۔ یہی وہ عنصر ہے جو پیتھاس (دردمندی) کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے لیکن کہیں کہیں طنز سے آگے بڑھ کر سٹائر کی شکل بھی اختیار کر لیتا ہے۔ اگر میرا کوئی قاری پروینؔ شیر کو کسی بحث میں پڑے بغیر ''دُکھ'' کی شاعرہ کا نام دے تو میں اس سے اتفاق کروں گا۔ جدائی کا دکھ، رفیقوں سے بچھڑ جانے کا دکھ، تنہا رہ جانے کا دکھ، توقعات کی عدم تکمیلی کا دکھ اور جانے کون کون سے واضح اور مبہم دکھ اس کی شاعری، مصوری اور شاید سازینوں میں سسکیاں لیتے ہیں۔ یہ دکھ ہی تو ہیں جو ذہن کو ناگزیر جبروں کا وجدان اور قلب کو دردمندی کا احساس عطا کرتے ہیں۔ اس ضمن میں اس کی نظموں ''بے بسی''، ''آخری اسٹیشن''، ''تابوت''، ''سبھی

رستے معطل ہیں''، ''بے چارگی''، ''تنہا ہاتھ'' کا مطالعہ ضروری ہے۔اس کی نظم ''اندھیرا'' شاعرانہ انصاف کے نظریے کے برخلاف سچ کی شکست اور جھوٹ کی فتح پر مبنی ہے۔''شہرِ خموشاں'' میں موت سے کس کو رُستگاری کے تصور کی جگہ موت کو رستگاری کا ذریعہ بتایا گیا ہے۔''رت بدلی ہے'' بڑھاپے کے موضوع پر ہے اور ساتھ ہی زندگی کی یکسانیت ''روٹین'' کے عذاب کا بھی ایک اشارہ ہے۔''پچھتاوا'' مصنوعی زندگی اور دکھاوے کی زندگی

سو کر میں جب صبح اُٹھی
ماسک لگانا بھول گئی

''کٹھن سوال'' میں سب سے سچا سب سے اچھا، دوست بتاؤ؟

''عراق'' میں ابنِ آدم کے زمیں زاد کرشمے۔''تشنہ لب آنچل'' میں یہ سوال کیا میں جتنا بھی میرا مقدور تھا وہ روچکی؟ سروائیول میں۔ یہ میرے ان گنت چہرے سب ادھورے اور ''قدآور آدمی کا دکھ میں:

حقیقت میں وہ قیدی اپنی ہی قدآوری کی تھی
پئے امکان سیرابی
جھکی تو پھر وہ جھکتی ہی گئی، اس آخری حد تک
جہاں اب ٹوٹنے کے ماسوا چارہ نہ تھا کوئی۔

اور بوڑھے ہونے کے دُکھ کے موضوع پر ''واپسی'' ایک عجیب نظم ہے۔اسی طرح زندگی سے خوشی کی رخصتی پر ایک اچھی نظم ''تلاش گم شدہ'' ہے۔ ''ایک بھکارن بچی کے اس پھول سے تازہ چہرے پر۔ٹھنڈی سی بجھی بجھی سی آنکھیں''۔''سب سے بڑا دکھ'' کے عنوان کے تحت درج شدہ نظم ہے۔

میں نے پروین شیر کی رومانوی اور نیم رومانوی نظموں سے چشم پوشی مناسب خیال کی ہے کیونکہ یہ اس کی شاعری کے مرکزی دھارے سے ہٹی ہوئی ہیں اور ہیں بھی بہت کم۔شاعرات کا ایک پسندیدہ موضوع ہے' مرد برتری اس موضوع پر پروین شیر نے کم ہی کہا ہے لیکن سوچنے کی بات ہے کہ فہمیدہ ریاض یا کشور ناہید کا منھ چڑھانے سے کیا بات بن جاتی ہے؟ سارہ شگفتہ کا ذکر اس لئے نہیں کیا کہ پروین شاکر نے اس سلسلے میں دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہے۔ (ملاحظہ ہو''سیپ'' کراچی خاص نمبر شمارہ 74، 2005ء صفحہ 55-56)

پروین شیر نے ''نسائیت'' اور ''مرد فوقی معاشرے'' کے علاوہ ''مرد و زن''، تعلق پر کم لکھا ہے لیکن اپنے ہی انداز میں لکھا ہے۔اس کی نظموں ''ڈسپوزایبل''، ''بس یہی عشق ہے''، ''سراب''، ''قتل''، جُل ان موضوعات پر حقیقت پسندانہ' جرأت مندانہ لیکن شعری ابلاغ کی توانائیوں سے بھرپور ہیں۔

پروین شیر نے بطور شاعرہ اپنی جگہ بنالی ہے۔لیکن اس کا تخلیقی سفر ختم نہیں ہوا قیاس کرتا ہے کہ وہ اردو شاعری کو مزید بہت کچھ دینے پر تلی ہوئی ہے۔اس نے دنیا کو جیسا پایا ہے وہ زیادہ روشن ہے اور نہ رنگین۔سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ انتہائی سرعت سے اور مسلسل بدل رہی ہے اس کے پیروں تلے زمین کھسکنے کے ساتھ اتھل پتھل بھی ہو رہی ہے۔اس کے سر کے سائبان تو سائبان، آسمان بھی اُڑا جا رہا ہے۔شیشہ دان، کرچی کرچی ہے، بچوں کے کھلونے ٹوٹے پڑے ہیں اور بستے جلے ہوئے۔اس نے آدمی کو جنگ، بربریت، دہشت، طبقاتی معاشرت، سیاسی، تاریخی اور مشینی جبر سے نڈھال، زندگی اور عمر کے رائیگاں سفر میں مصروف پایا اور دردمندی کے ساتھ اپنے لفظوں، اپنے خطوط، نیم دوائر اور رنگوں میں پیش کیا۔پھر اس نے موسیقی کی لہروں کو متحرک کر کے فضاؤں کو اپنا شریک بنالیا۔پروین شیر کی شاعری' مصوری اور موسیقی اس کے عصر کی ایسی بازیافت ہے جو عصریت کو آفاقیت کا راستہ دکھا رہی ہے۔

☆

بقیہ: نیلا لفاف

زندگی کی گاڑی غیر محسوس طور پر چلتی رہی۔شب و روز گزرتے رہے۔ اور آج.....ایک سال بعد.....میرے ہاتھوں میں ابھی ابھی وطن سے آیا ہوا یہ نیلا لفاف کانپ رہا ہے۔مجھے بے چارگی اور بے کسی کے جال میں جکڑ رہا ہے۔یہ خط دکھ اور اُداسی کا لہریں لیتا ہوا ایک سمندر ہے جس میں میرا وجود ڈوبتا جا رہا ہے۔میری آنکھیں نم ہیں۔بے بسی اور ندامت کے اندھے کنویں میں گرتی جا رہی ہیں۔اک خلش نے دل و دماغ کو نڈھال کر دیا ہے۔اس خط سے اُس عمر رسیدہ سوختہ جاں کی بوڑھی آنکھیں جھانک رہی ہیں جو مجھے میرا وعدہ یاد دلا رہی ہیں۔وہ مضطرب اور پریشان باپ اسپتال میں زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہا ہے۔میرے بہلاوے کے وعدے کی اُمیدیں اُس کو مرنے بھی نہیں دیتیں۔اپنے بیٹے کو ایک نظر دیکھنے کو موت سے لڑ رہا ہے۔مجھ سے پھر التجا کی ہے کہ اُس کے بیٹے کو ڈھونڈ نکالوں اور اُسے بتاؤں کہ اُس کا باپ اُسے آخری بار دیکھنے کو بے چین ہے۔طویل عرصے تک اُس کا انتظار کرتے کرتے اسپتال میں دم توڑ رہا ہے۔نیلے لفاف سے جھانکتی ہوئی آنکھیں جن کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہیں' اندر دھنسی ہوئی ان کی گہرائیاں میری بے بسی کا مذاق اُڑا رہی ہیں۔اُسکا شکن آلود پتلون، قمیض کا پھٹا ہوا کالر، پیوندگی ہوئی آستین، بڑھے ہوئے شیو، پریشان زلفیں چیخ چیخ کر مجھے مجرم ہونے کا احساس دلا رہے ہیں۔

باہر آندھیوں کا زور کچھ اور بڑھ گیا ہے۔اُس درخت کی ننگی کمزور ٹہنیاں شاخوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہی ہیں۔اُجالے کچھ اور ملگجے ہو گئے ہیں۔فضا بہت بے کل ہے باہر۔اور میرے اندر..... ندامت، پچھتاوے اور شرمندگی کے دکھ کا طوفان مجھے توڑ کر بکھیر رہا ہے۔ بے بسی، مجبوری اور لاچاری چیخ رہی ہے۔کہاں ڈھونڈوں میں اُسے؟

☆

بشر پہلو میں دل رکھتا ہے

محمد علی صدیقی
(کراچی)

پروین شیر صاحبہ ''خصوصی اعزاز کی مستحق خاتون'' کا انعام حاصل کر چکی ہیں جو ان کی ادب وثقافت کی خدمات کے لیے کینیڈا کے شہر ونی پیگ میں دیا گیا۔ وہ ایک ایسی پاکستانی نژاد شاعرہ اور مصورہ ہیں جنھوں نے یورپ اور ترقی پزیر متعدد ممالک کے دورے کیے اور ان کی مصوری کی نمائش کینیڈا، امریکہ، انگلینڈ، فرانس اور انڈیا میں ہو چکی ہیں اور مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ ان کی تخلیقات کا ہر جگہ خیر مقدم کیا گیا ہے اور انھوں نے نہ صرف اپنے لیے بلکہ پاکستان اور کینیڈا کے لیے نام کمایا ہے۔ وہ ایک شاعر کا تخیل، ایک مصور کا برش اور ایک موسیقار کی مضراب کا دلاویز سنگم ہیں اور اگر ہم شاعری اور مصوری کی دنیا پر نگاہ دوڑائیں تو ان جیسے ہمہ جہت فنکار بہت کم، بہت ہی کم نظر آئیں گے۔

میرا خیال ہے کہ اردو شاعری کی حد تک یہ اعزاز پروین شیر صاحبہ ہی کے پاس ہے کہ وہ شاعری کے ساتھ ساتھ مصوری اور موسیقی کے شعبوں میں بھی اپنی دلچسپی اور مہارت تسلیم کروا چکی ہیں۔

اونٹوریو کالج آرٹ، ٹورنٹو کی وائس پریذیڈنٹ ڈاکٹر سارہ ایم میکنن اپنے ملک کی نامور مصورہ ہیں اور ان کی طرف سے پروین شیر صاحبہ کے لیے یہ خراج عقیدت ہر لحاظ سے پاکستان کے لئے خراج عقیدت ہے کہ پروین شیر ''ایک باطنی وژن کی فنکارہ ہیں اور ان کے موضوعات بہت ہی نجی لیکن سیاسی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں''۔

غالباً یہ اشارہ اُن نظموں اور مصوری کے شاہکاروں کی طرف ہے جن کے پس پشت ایک سیاسی احساس یگانگت دنیا کے مجبور اور بے بس کشتگانِ خاک کے لیے ہے جو اس کرۂ ارض کے طاقت ور اور مضبوط طبقے کے زیر دست ہیں۔ ان کی نظم ''سب سے بڑا دکھ'' حزن وملال میں بھی حسن کی تلاش ہی کا نام ہے۔ ''سچے دوست'' بھی اسی قبیل کی شاعری ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک سچا فنکار کبھی انسانیت سے ہمدردی کا اظہار اور اپنے فن کو ان کی مقیم حالت کے سدِ باب کی نذر کیے بغیر حقیقی فنکار نہیں پا سکتا۔ مولانا حالی نے کہا تھا:

بشر پہلو میں دل رکھتا ہے جب تک
اسے دنیا کا غم کھانا پڑے گا

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ پروین شیر صاحبہ کی صلاحیتوں کا اعتراف کم ترقی یافتہ ممالک کے حساس دانشوروں نے بطور خاص کیا ہے۔ شاعری اور مصوری کے اس مجموعہ میں جسے ''کرچیاں'' کا نام دیا گیا ہے، حساس ذہنوں کے لیے دعوت فکر ہے اور جیسا کہ میرے ساتھی مقرروں نے اپنے مضامین میں ارشاد فرمایا ہے پروین شیر صاحبہ کی شاعری اور مصوری میں ہمارے غور وفکر کے لیے بہت کچھ ہے بس ایک حساس دل چاہیے جو اس فنکارہ کے زرخیز ذہن کی کارفرمائیوں کے اندر رقص کناں تخیل کی اڑانوں کو محسوس کر سکے۔

پروین شیر ایک حیران کن شخصیت کی مالک ہیں۔ وہ ایک ایسی شاعر ہیں جو انسانیت اور فطرت کے حساس جذبوں کو بہت اچھی طرح سمجھتی ہیں۔ ایک شاعر کی حیثیت سے ان کا تعلق ایک ایسی تصوراتی دُنیا سے ہے جو ہر طرح سے مکمل ہے۔

اُن کے پہلے شعری مجموعہ ''کرچیاں'' جو کہ انگریزی ترجمہ اور اُن کی پینٹنگز کے ساتھ شائع ہوا نے مجھے ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ جو کمال اُنھیں شاعری میں حاصل ہے وہی مہارت وہ پینٹنگز میں بھی رکھتی ہیں۔ اُن کی شاعری اور پینٹنگز کے عمدہ امتزاج نے اُردو ادب اور فنون کے بڑے تنقید نگاروں کو بھی متوجہ کیا ہے۔

اُن کا دوسرا اُردو شعری مجموعہ ''Rain drops on parched'' نے اُن کے پہلے مجموعہ کی طرح ہی مقبولیت حاصل کی۔ وہ ایک قابل قدر آرٹسٹ ہیں جن کے الفاظ اور رنگ دونوں اپنے اندر لاتعداد پیغامات لیے ہوتے ہیں۔

مجھے خوشی ہے کہ اُن کا تعلق فنکاروں کے اُس قبیلے سے نہیں ہے جو اپنے آپ کو زندگی کی حقیقتوں سے دور رکھنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ اُن کا تعلق اُس گروہ سے ہے جو جدیدیت کو معاشرے کی تمام ناانصافیوں کے خلاف استعمال کرنے پر یقین رکھتے ہیں۔ یہ ناانصافی چاہے مذہب کی ہو یا جنس کی یا ترقی کی، وہ ہمیشہ مظلوم کا ساتھ دیتی دکھائی دیتی ہیں۔ یہی خصوصیت اُن کی شاعری اور آرٹ کو اُونچائی کا درجہ دیتی ہے۔

کم سے کم الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ پروین شیر صاحبہ کی شاعری اور مصوری ہمیں حیران بھی کرتی ہے اور اعتراف کمال پر مجبور بھی۔

☆

''خوبصورت دنیا کی تشکیل''

رے ڈِرکس (کناڈا)

(کریئٹر ڈائریکٹر مینونائٹ ہریٹج سینٹر مَنی ٹوبہ)

- ترجمہ -

پروفیسر عبدالحمید خان

(اورنگ آباد بھارت)

پروین شیر سے میری ملاقاتیں بہت کم رہی ہیں پھر بھی مجھے ہمیشہ یہ محسوس ہوتا رہا ہے کہ ہم دونوں کی راہیں قطعی طور پر ایک ہیں۔ گزشتہ بیس برسوں سے میں خود بھی ایک ادیب، فنکار اور فوٹو گرافر کی حیثیت سے زندگی کی حقیقتیں دریافت کرنے کی سعی میں مشغول رہا ہوں۔ یہ حقیقتیں اُن مقامات سے وابستہ ہیں جنہیں مغرب ہمیشہ سپاٹ یا ایک مقررہ شکل میں ہی دیکھتا آیا ہے۔ ہماری کوشش رہی ہے کہ ہم ایسی سچائی کو سامنے لا سکیں جو مغرب کی نظر سے اوجھل رہی ہے۔

پروین شیر کی شاعری اور مصوّری کے بارے میں میرے خیالات اُن چند نکات پر مبنی ہیں جو اُن کی تخلیقات کا غائر مطالعہ کرنے کے دوران مجھ پر منکشف ہوئے ہیں۔ میں یہ بھی عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ نہ صرف یہ کہ پروین شیر ایک اچھی مصوّرہ، اور شاعرہ ہیں بلکہ وہ اک بے حد انسان دوست اور ایک اچھی ماں اور بیوی بھی ہیں۔

میں چوں کہ اردو زبان نہیں جانتا ہوں اور تراجم میں شاعری کی بہت سے لطافتیں اور نزاکتیں غائب ہو جاتی ہیں اس لیے میں ان کی پینٹنگز پر اپنے تاثرات پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔ مگر پھر بھی میں کبھی کبھار ان کی شاعری کے متن پر سرسری نظر ڈالتا رہتا ہوں اس طرح ان کے فن میں پوشیدہ روح مجھ پر عیاں ہو جاتی ہے۔

شیر کے فن کے مطالعے کے بعد سب سے پہلے میرے ذہن میں جو بات آئی وہ یہ تھی کہ وہ ایک کینیڈین ہیں۔ کینیڈین ہونے کا مطلب ان کی ستائش کرنا ہے کیونکہ اکیسویں صدی میں ایک کینیڈین ہونے کا مطلب کئی تہذیبوں اور ثقافتوں کو ایک ساتھ جینا ہے۔ پروین شیر ایک ساتھ کئی نئی اور پرانی اقدار اور تہذیب کی نقیب ہیں۔ اگرچہ وہ انڈیا میں پلی بڑھی ہیں مگر ان کا برش کینیڈین لینڈ اسکیپ سے پوری طرح مانوس ہے۔ مثلاً ''کالنگ سائیلینس'' میں انھوں نے کینیڈا کے گھاس کے وسیع اور گھنے میدانوں کو پیش کیا ہے۔ اسی طرح Defeat دیکھتے ہی آپ کے پاؤں کے نیچے سے برف کی خاموش آہٹ ابھرتی ہوئی محسوس ہوگی۔ مگر شیر کے لینڈ اسکیپ چاہے کینیڈین ہوں یا کہیں اور کے، اُنھیں صرف حقیقت نگاری کے نمونوں کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ ان کی شاعری بھی اس بات کی گواہ ہے کہ سپاٹ قسم کی حقیقت نگاری سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اُن کے فن میں احساسات، استعجاب اور تشنہ آرزومندی سب کا ایک امتزاج پایا جاتا ہے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اُنھوں نے رحم دل اور نیک روح کا مقدر ہی یہ بنا لیا ہے کہ وہ ہمیشہ اُن بد نصیب لوگوں کے لیے تڑپتی رہیں جو کرب و آلام کے حصار میں قید ہیں۔

Tears میں ایک ایسے پریشان حال بچے کا چہرہ پیش کیا گیا ہے جس کے پس منظر میں ایک ریگستان ہے اور جس میں چند فوجی پناہ لینے کے لیے کسی محفوظ جگہ کی تلاش میں ہیں۔ اسی کینوس کو جنگ کے خلاف پروین شیر کا بامعنی احتجاج قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ اسی میں اُن لوگوں کی تصویر کشی کی گئی ہے جو جنگ کے دوران سب سے زیادہ صعوبتوں کا شکار ہوتے ہیں۔ ان جنگوں کے ذمہ دار وہ رہ نما ہیں جو دوسرے ممالک کے تئیں تعصب کا جذبہ رکھتے ہیں۔ اس ماحول میں اُن بچوں اور اُن دوسری معصوم و بے گناہ ذی روحوں کو فراموش کر جاتے ہیں جو جنگ کی ہولناکیوں کا بے وجہ شکار ہوتی ہیں۔

پروین شیر کی ایک بے حد اہم پینٹنگ ڈھلتے دن کی روشنی ہے۔ میں اسی کا ذکر خاص طور سے کرنا چاہوں گا اسی پینٹنگ میں نظر آنے والی چھائیاں طویل ہیں اور روشنی جنگل کے گھنے پن کو چیرتے ہوئے ایک راستے پر پڑتی نظر آتی ہے۔ یہاں روشنی اور سایوں کے اسمبلاژ سے پینٹنگ میں بے حد خوبصورت معنویت کا استعارہ قائم ہوتا ہے اسی طرح Desert میں پتھر اور ریت کو آپس میں مدغم ہوتا دکھایا گیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اسطور اور ریت ایک دوسرے میں ضم ہو گئے ہیں۔

تو کیا پروین شیر کی یہ پینٹنگ روشنی میں امید کی کرن تلاش کرتی ہے یا کینوس کے اندھیروں کی لایعنیت میں روشنی کی کھوج میں سرگرداں ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ پروین شیر کا آرٹ ان کے دردمند دل کے نہاں خانوں میں تخلیق ہوتا ہے جس کے سبب وہ ایک بہتر دنیا کی تشکیل کی خواہاں نظر آتی ہیں۔ پروین شیر کو انسان رشتوں سے گہری عقیدت ہے۔ اُن کے بیٹے فیروز کا پورٹریٹ اُن کی بہترین فنکارانہ صلاحیتوں کا نمونہ ہے۔ اس طرح ان کے پنسل اسکیچ ''شیراز'' میں روشنی اور سایوں کا خوبصورت اور پُرمعنی سنگ نظر آتا ہے۔ مگر Homless میں اُن کی مصورانہ تکنیک فیروز اور شیراز سے قطعاً مختلف ہے۔ اسی میں ایک ایسے بچے کے چہرے کو دکھایا گیا ہے جس کی آنکھ بالکل خالی ہے۔

اگر ان کی پینٹنگز کا موازنہ ان کے ایک کینوس Flowers of Paradise سے کر کے دیکھیں تو ہم اسی نتیجے پر پہنچیں گے کہ وہ ایک خوبصورت اور بہتر دنیا کی تشکیل کرنا چاہتی ہیں مگر دُنیا میں انتقام اور تباہ خیزی کا عمل ہی جاری و ساری نظر آتا ہے۔ اس لیے میرے خیال میں ان کا پورٹریٹ Homeless ہی ایک سچی اور حقیقی دنیا کی تصور کشی کرنے میں کامیاب ہے نہ کہ ''جنت کے پھول''۔

باقی صفحہ ۶۱ پر ملاحظہ کیجیے

''روشنیاں بجھتی جاتی ہیں''

(محترمہ پروین شیر کے نظمیہ کلام سے مختصر انتخاب)

اقبال بھٹی (برمنگھم)

شمس وقمر

شب کے پیمانے سے روشن
چاند کی صہبا
چھلک چھلک کر
نور کے ہر قطرے سے سارا
عالم روشن کر دیتی ہے
تاریکی کے افعی ڈر کر
چھپ جاتے ہیں
کرنوں کا شہزادہ چاند فلک پر اپنے
حسن کے جلوے کے جادو پر
نازاں ہو کر ہنس دیتا ہے
لیکن اس کا ساتھی سورج
ہاتھ چھڑا کر
جب رخصت ہو جاتا ہے تھک کر دھرتی کی
پنہائی میں
گر کر چھپ جاتا ہے
چاند کا جھلمل کرتا چہرہ
بجھ جاتا ہے
اس کی رگ رگ میں جو نور کی ندّی بہتی تھی
سورج نے خود اپنا آپ جلا کر
اس کو بخشی تھی!
کرنوں کا شہزادہ چاند تو اک پتھر بے نور تھا جواب
آسمان کے اک کونے میں بجھ کر
اندھیارے کی چادر اوڑھے
پڑا ہوا ہے!
اس کی رگوں میں بہتی ہوئی
سب روشنیاں بجھتی جاتی ہیں
اس کی ساری چمک دمک سورج کی
عطا تھی!
میں تو پتھر کا اک ادنیٰ سا ٹکڑا تھی
اور تم سورج!
تم نے مجھ کو چاند بنایا
لیکن جب سے
تم نے مجھ سے منہ موڑا ہے
چاند تمہارا پتھر ہو کر
گم صم ہو کر
اندھیارے کی گرد میں ڈوبا
اک گوشے میں
پڑا ہوا ہے!

○

نسیان

بے بسی کی رضائی میں منہ کو چھپائے ہوئے
ذہن کے گھپ اندھیرے کی کالی گپھا میں بھٹکتی ہوئی
جیسے خود سے بھی بچتی بچاتی ہوئی
اپنے ہاتھوں سے سر کو سنبھالے ہوئے
چیختی ہے کہ کوئی بتائے اسے
کون ہے وہ؟ کہاں ہے؟ یہ اندھی اندھیری گپھا
کیا یہی ہے نہاں خانۂ حافظے کا محل؟

اپنی آہ و بکا' اپنی سینہ زنی' سوگ کے ماتمی شور میں
ڈوبتی اور اُبھرتی ہوئی
سسکیوں میں ہے ماتم کناں
زندگی کا مرتّب ورق
پرزہ پرزہ جو اُڑتا بکھرتا رہا
سارے الفاظ ایک دوسرے سے جدا ہو گئے
کوئی معنی و مفہوم بنتا نہیں!
زنگ آلود تالے سے جکڑے ہوئے
ذہن کے در پہ دستک کا کچھ زور چلتا نہیں
خون رِستی ہوئی انگلیوں سے کوئی در بھی کھلتا نہیں
یاد کے پرزہ پرزہ ورق
سب اڑا کر کہیں لے گئیں آندھیاں
سارے دروازے جو بند ہیں
اب کھُلیں گے کہاں
گم ہوئیں چابیاں
اے خدا! تُو بتا
کوئی چارہ نہیں؟
کوئی چارہ نہیں!!
کوئی چارہ نہیں!!!

دائرہ چیونٹیاں

ایک خندق کے چاروں طرف
دائرے کی لکیریں کشیدہ ہیں
جن پر قطاروں میں چلتی ہوئی
بھاگتی' کلبلاتی ہوئی چیونٹیاں
ہیں سنبھالے ہوئے اپنی اپنی بقا
اپنا رختِ سفر
راہ میں ہیں کہیں
گلستاں' تتلیاں' پھول' جگنو کہیں
ناگ' آسیب' چمگادڑیں' آندھیاں
خواہ کچھ ہو یہ رکتی نہیں
راہ میں چھوڑ کر
اپنا سرمایہ سب
نفرتیں' چاہتیں' کشمکش' اُلجھنیں
پھر سے واپس وہیں
تھک کے لوٹ آتی ہیں
خستہ جاں' منتشر
ایک تاریک خندق میں گرتی ہیں
یہ چیونٹیاں.....!

○

ایک بوڑھے کی موت

بچہ تھا۔شاداب، گل سوسن سا تازہ
پھر یہ نزاکت
یہ شادابی، یہ رنگینی
خوبرو اور خوش شکل جوانی میں بدلی، تو
چھیل چھبیلا اک گبرو تھا
لیکن بے کل
گھبرایا سا
دائیں بائیں
ایک اُچٹتی، بیگانی بے نور نظر سے
تکتا رہا
شاید وہ، جس کی خاطر اس کا دل اس کے
بچپن سے بے تاب ہے، اک دن مل جائے گی

اس امید پہ جیتے جیتے
ڈھلی جوانی
پیری آئی
اور جب اس کی
عمر کا سورج ڈوب گیا، تو
شہرِ خموشاں کی تاریکی میں جا لیٹا
بوڑھے خواب نے اپنی ساری عمر گنوائی
پر تعبیر نہیں مل پائی!

○

قطرہ اور سمندر

(اپنے بیٹے شیراز کے نام)

میرے شاز و میرے بچے
وہ دن آتا ہے یاد مجھے
پھولوں سی گھڑی نکھرا لمحہ
اس روز کے اُجلے دامن میں
اک حسن کا پیکر اُترا تھا
اور تیری ملائم سانسوں نے
جیون میں مرے رس گھولا تھا
اس دن سے میں اور تم دونوں
آشا کا دامن تھامے ہوئے
بے فکرا کٹھے چلتے رہے
ان لمبی راہ گزاروں پر
ان اونچے نیچے رستوں پر!!
الحمد کہ آج یہ منظر ہے
وہ قطرہ ایک سمندر ہے
اس ساگر کے آئینے میں
جب اپنا سراپا دیکھتی ہوں
تو لگتا ہے جیسے میں خود
اب ساگر سے اک بوند ہوئی
بالوں کی سپیدی کہتی ہے
اب تُو ہے مری پیری کا امیں
ان اونچے نیچے رستوں پر
یا لمبی راہ گزاروں پر
اب تھام کے تیری انگلی مجھ کو
دھیرے دھیرے،
میرے بچے
چلنا ہے تیرے پیچھے پیچھے!!

ریشم کی یہ نازک ڈوری

دل کش رنگیں
نرم و نازک
ریشم کی ڈوری لپٹی ہے
گردش کرتی ریل (Reel) سے جس کا
ایک سرا ہے دھند کے اندر
پوشیدہ ہاتھوں میں جوہر
لحہ اس کو اپنی جانب
کھینچ رہا ہے!
چکّر کھاتی پیچک سے ریشم کی ڈوری

لحظہ لحظہ
کھچ کھچ کر کھلتی جاتی ہے
دھند میں چھپتی جاتی ہے اور
اک دن رقص میں کھوئی پیچک
خالی ہو کر
یک دم ساکت ہو جائے گی!

○

سراب

میں ہوں پانی، تم پیمانہ
مرمر کا سندر پیمانہ
تم میں سما کر میرا سراپا بھی تم جیسا
لگنے لگا ہے
میرا ہیولہ
میرا پرتو
میرا خاکہ
اب تم سا ہے
جیسے تم ہو
ویسی میں ہوں
لیکن.....اب بھی
میں پانی ہوں
زیست کا مظہر
اور تم.....پتھر
زیست ہے کیا
ناواقف اس سے!

○

مکھیاں مکڑیاں

چارسواُڑ رہی ہیں یہاں
بھنبھناتی ہوئی مکھیاں
اپنی اپنی اُڑانوں کی رفتار ہر پل بڑھاتی ہوئی
اور زناٹوں سے
ٹکریں مار کر
زیر کرتی ہیں اک دوسرے کو کہ
بڑھ جائیں آگے سبھوں سے مگر.....

ہر طرف کارناموں میں گم ہیں یہاں
جال بنتی ہوئی مکڑیاں
دائیں بائیں نظر کو گھماتی ہوئی
گھات میں دام اپنا بچھاتی ہوئی!

ایک دھن میں یہ اُڑتی ہوئی مکھیاں
جال میں خود اُلجھتی ہوئی
بس گھڑی دو گھڑی
چھٹپٹاتی ہوئی
ایک زیرک شکاری کے پنجے میں آتی ہیں یہ مکھیاں!
یہ تماشہ جو صدیوں سے جاری ہے
جاری رہے گا سدا.....!!

○

خود فریبی

خشک بیاباں میں لوگوں کا
اک جمگھٹ سا
سوکھے ہونٹ لیے پھرتا ہے
اور پھر آخر.....
آب نہ پا کر
ریت چبا کر
اپنی پیاس کو دھوکہ دے کر
جینے کی کوشش کرتا ہے!

○

پاش پاش

وہ شاخ جو اپنی پتّیوں کو
گُلوں کو خاروں کو
اپنے سینے سے بھینچ کر ان کو سینچتی تھی
وہ آ گئی برق و باد و باراں کی زد میں.....
اور اب
زمیں پہ ٹوٹی ہوئی پڑی ہے
بکھر گئے ہیں سب اس کے بچے
وہ پھول، پتّے
وہ خار سارے
یہ کون جانے
ہوا انہیں اب اڑا کے کس سمت لے گئی ہے!!

افسانہ

نیلا لفاف

پروین شیر

دوپہر اپنی بھرپور تھکن اور اُداسی لیے رینگ رہی ہے۔ بوڑھا وقت کسی ناتواں مریض کی طرح رہ رہ کر کراہ رہا ہے دور درخت کی شاخوں پر سر ٹکائے سورج۔۔۔۔۔

بادلوں کی بوسیدہ پھٹی پرانی چادر اوڑھے تھک کر سو گیا ہے۔ دھوپ نے جیسے آخری سانس لے لی اور اُجالے ملگجے ہو گئے ہیں۔ برسوں سے وہ سامنے کھڑا درخت چپ چاپ کسی سوچ میں گم ہے۔ اس کی سب سے اونچی ٹہنی بالکل تنہا سب ٹہنیوں سے الگ، افسردہ نگاہوں سے آسمان کو تک رہی ہے۔ بے حد اُداس۔۔۔!! اکیلی۔۔۔! اس بند کمرے سے میں نے اکثر اُس درخت کی سرگوشیاں سنی ہیں۔ سسکیاں سنی ہیں۔ اُس کی آنکھوں میں اپنی حیات کی پرچھائیاں دیکھی ہیں۔ باہر یخ بستہ طوفانی ہوائیں ہچکیاں لے کر رو رہی ہیں۔ برف کی سفید چادر نے سارے شہر کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا ہے۔ اس سرد شہر میں ہر سال چھ مہینے تک یہی ٹھنڈی سفیدی چھائی رہتی ہے۔ لوگ موٹی Insulated دیواروں کے اندر قید ہو جاتے ہیں۔ تازہ ہواؤں کے نرم لمس سے محروم۔ میرے چاروں طرف بھی موٹی، مضبوط دیواریں ہیں جیسے میں کسی تابوت میں ہوں۔ بس یہ سامنے والی کھڑکی مجھے زندگی کا احساس دلا رہی ہے۔

بہت دیر سے باہر خلاؤں میں تک رہی ہوں۔ خیالات کی آندھیوں میں میرا وجود خشک پتے کی مانند بھٹک رہا ہے۔ ایک جان لیوا خلش نے دل و دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ غم زدہ سائے میری جانب سرک رہے ہیں۔ شیشۂ دل اندر ہی اندر شکستہ ہو رہا ہے۔ سوچ کے بہاؤ میں تنکے کی طرح بہی جا رہی ہوں۔

میرے ہاتھوں میں ایک نیلا لفاف ہے جو مجھے اس کراں سے اُس کراں تک لیے جا رہا ہے۔ دیارِ غیر میں زمانہ دراز سے اس طرح کا نیلا لفاف وطن کی خوشبو لیے آتا ہے اور روح کو معطر کر دیتا ہے۔ سکون پہنچاتا ہے غریب الوطنی کا احساس کچھ حد تک مٹاتا ہے۔ جسے پا کر ایک عجیب سی طمانیت کا احساس ہوتا ہے۔

لیکن آج۔۔۔۔ وطن سے آئے ہوئے اس خط نے بے چین کر دیا ہے۔ بے چارگی اور بے بسی کے جال میں جکڑ لیا ہے۔ مجھے محسوس ہو رہا ہے جیسے میں سڑک پر پڑا سوکھا ہوا ایک پتہ ہوں اور یہ خط ایک آندھی ہے طوفان ہے جو مجھے حال سے ماضی کی طرف، اس جہاں سے اُس جہاں کی طرف اُڑائے لیے جا رہا ہے۔ سوئی ہوئی کچھ یادیں جاگ رہی ہیں۔ دھند کی پرچھائیاں واضح ہوتی جا رہی ہیں۔ ذہن کے اسکرین پر وقت Rewind ہو کر کسی فلم کی طرح آن ہو گیا ہے۔

یہ دلّی کا پالم ایر پورٹ ہے۔ لوگوں کا جمِ غفیر ہے۔ شور ہے۔ غل ہے میں لاؤنج میں اپنی فلائٹ کے انتظار میں بیٹھی ہوں۔ دل و دماغ بے حد اُداس ہے کیونکہ پانچ سالوں بعد وطن میں چھ ہفتے گزار کر پھر اس پیاری سرزمین سے بہت دور جانا پڑ رہا ہے۔ مانوس ہواؤں سے دور..... بیلے کی بھینی بھینی خوشبوؤں سے دور..... ٹھنڈی چاندنی کے نور میں نہائے ہوئے آنگن سے دور..... اپنی گلیوں اور باغیچوں سے دور..... بچپن کی معصوم فضاؤں سے دور..... اپنوں سے دور..... تنہا تنہا..... جہاں اکیلے پن کا زہر کاٹتا ہے۔ جہاں زندگی ایک بے مقصد سفر معلوم ہوتی ہے۔ جہاں یخ بستہ ماحول میں سوچیں بھی منجمد ہو جاتی ہیں۔ جہاں انسان ایک روبوٹ ہے۔ جہاں ہر پل وطن یاد آتا ہے۔ گھر یاد آتا ہے دراصل اپنوں سے مل کر ہی زندگی مکمل ہوتی ہے ورنہ ایک اکیلا انسان درخت کا وہ پتہ ہے جو اپنی شاخ سے ٹوٹ کر جدا ہو گیا ہو۔ کہیں گم ہو گیا ہو۔ ہوا کے تھپیڑوں کی زد میں آ کر۔ میرا خاندان ایک ہرا بھرا درخت کی طرح تھا۔ وقت کی آندھی نے سارے پتے شاخوں سے نوچ لیے۔ سب اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ دُور دُور..... کوئی مشرق کو کوئی مغرب کو۔ ایک دوسرے سے ہزاروں میلوں کے فاصلے پر۔ ایک دوسرے کے دکھ درد سے الگ، بے خبر اور لاتعلق۔

آج پھر مجھے اپنے وطن سے دور جانا پڑ رہا ہے۔ اپنے مانوس ماحول سے دور..... اپنے سے دور..... میری پلکیں بار بار بھیگی جا رہی ہیں۔ روح پر ایک گونہ گراں ہے۔ دل بے حد اُداس ہے۔ میرے اردگرد سینکڑوں لوگ ہیں۔

ایر پورٹ کا لاؤنج ایک چھوٹی سی دنیا ہے۔ اس دنیا میں اپنی اپنی دنیاؤں کے چھوٹے چھوٹے جزیرے ہیں۔ سب اپنے اپنے جزیروں میں آباد ہیں جس سے وہ باہر نہیں آتے۔ سبھوں کی اپنی اپنی دنیائیں ہیں' اپنے اپنے دکھ ہیں' سکھ ہیں' اپنے اپنے مقاصد ہیں' اپنے اپنے افکار ہیں' اپنے اپنے خیالات ہیں' اپنی اپنی زندگانیاں ہیں' اپنے آنسو اور اپنی مسکراہٹیں ہیں۔ کسی کو کسی سے ملنے کی خوشیاں ہیں تو کسی کو کسی کے بچھڑنے کا درد ہے۔ سسکیاں اور کھنکتی ہوئی ہنسی ہوا کی لہروں پر تیر رہی ہیں۔ حالات کا ایک دھارا ہے، مسلسل بہاؤ ہے جس میں سب کے سب بہے جا رہے ہیں۔

میں ایر پورٹ کے لاؤنج کی اس دنیا کے بارے میں سوچ رہی ہوں کہ ایک آواز مجھے چونکا دیتی ہے۔

''آپ کینیڈا میں رہتی ہے نا؟''

اُس کی نظریں میرے سوٹ کیس پر لکھے پتے پر ٹکی ہیں۔ میں نے دیکھا ایک عمر رسیدہ' مفلوک الحال شخص مجھ سے مخاطب ہے۔

''جی ہاں۔فرمایئے؟''

''بیٹی''.....(مجھے اُنس کا مشفق لہجہ یاد آ رہا ہے)

''میرا ایک بیٹا ہے۔اُس کا نام نریندر ہے۔وہ بھی کینیڈا میں ہی رہتا ہے۔لانبے قد کا ہے۔گھنگھرالے بال ہیں اُس کے۔آج اُس کا خط آئے ہوئے ایک سال ہوگیا۔نہ جانے کیسا ہے۔کس حال میں ہے وہ۔تمہارا بڑا احسان ہوگا اگر میرا اک کام کردو''۔

''کہیے کیا کام ہے؟''

''میرا پیغام اُس تک پہنچا دو تو بڑی مہربانی ہوگی۔تم اُس سے کہنا اب وہ واپس چلا آئے میں اُس کے لیے بہت پریشان رہتا ہوں۔اُس سے کہنا جلد از جلد وہ مجھے خط لکھے اور اپنی خیریت سے مطلع کرے۔جتنی جلدی ہو سکے واپس چلا آئے''۔

اس معصوم باپ کی اپنے بیٹے کیلئے شدید محبت نے میرا دل چھولیا۔اُس کی بے بسی اور بے چینی نے مجھے بے چین کر دیا۔

''آپ کا بیٹا کینیڈا کے کس شہر میں رہتا ہے؟''

''یہ تو مجھے معلوم نہیں۔تم خود ہی پتہ لگا لینا۔اور جلد اُسے واپس بھیج دینا۔اُسے دیکھنے کو آنکھیں ترس رہی ہیں۔اُس کی آواز کو کان ترس رہے ہیں۔اُسے گلے سے لگا لینے کو یہ بانہیں بے چین ہیں۔اس عمر میں اُس کے سہارے کی بہت ضرورت ہے اُس کے بغیر میرا دل نہیں لگتا۔وہ کہہ کر گیا تھا کہ ایک سال میں لوٹ آئے گا۔تین سال ہوگئے اور اب تو اُس کا خط بھی نہیں آتا''۔

میں نے اُس کے خزاں رسیدہ چہرے پر کرب کی بے شمار ننھی ننھی لکیریں دیکھیں۔گویا زندگی نے اُسے صرف شدت غم ہی دیا ہو۔اُس کی بے پناہ تھکی ہوئی ہانپتی ہوئی بے حد اُداس آنکھیں.....جن میں جھلملاتے آنسوؤں سے ایک قطرہ اُس کے شکن آلود، بوسیدہ سوٹ کے دامن پر ٹپک پڑا ہے۔جیسے وہ قطرہ کوئی وزنی پتھر ہو جس نے میرے شیشۂ دل کو چور چور کر دیا۔جھریوں کے اندر چھپی غم کی بے شمار موجیں اُس کے رخ پر عیاں ہیں۔اور اُلجھے ہوئے بالوں میں درد پنہاں کا بیان۔خشک ہونٹوں پر خاموش کراہیں اور زرد چہرے پہ حسرتوں کی راکھ۔اُس کے پپڑیوں والے ہونٹوں سے نکلے ہر ہر لفظ اور ہر جملے میں اپنے بیٹے کی خوبیاں گنواتے سن رہی ہوں۔اپنے بیٹے کے لئے اُس کی شدید محبت کی پکار سن رہی ہوں۔اس باپ کے نرم و نازک' معصوم دل کے بارے میں سوچ رہی ہوں جس نے مجھ سے اتنی اُمیدیں لگا رکھی ہیں۔میں سوچ رہی ہوں انھیں کیسے توڑ دوں؟ کیسے کہہ دوں کہ اس قدر وسیع و عریض کینیڈا میں اس غمگین کے لانبے قد اور گھنگھرالے بالوں والے بیٹے کو کہاں تلاش کرونگی؟ کس طرح بتاؤں اُسے کے اتنے مختصر پتے پر تمہارے بیٹے کو تلاش کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔اس کی اندر دھنسی ہوئی اُداس آنکھوں میں جو موہوم سی اُمید کے دیے جھلملا رہے ہیں' اُنھیں کیسے بجھا دوں؟ اُس کے چہرے پر جو کرب کی لکیریں ہیں اُن میں اور اضافہ کیسے کر دوں؟ اس لیے میں نے اس سے وعدہ کر لیا ہے کہ اُس کے بیٹے کو تلاش کر کے پیغام پہنچا دونگی۔میں نے اُسے یقین دلا دیا ہے کہ اس کا بیٹا بہت جلد اُس کے پاس واپس آ جائے گا۔میری ان باتوں سے اُس کی بوڑھی آنکھوں میں اُمیدوں کے چراغ جگمگا اُٹھے ہیں۔اُس کے خشک ہونٹوں پر مسرتوں کے ایاغ دمک اُٹھے ہیں۔چہرے کی سلوٹیں کم ہو رہی ہیں میرے بہلاوے کے وعدے نے اُس کی دنیا ہی بدل کر رکھ دی ہے اس لئے اُس کو اک آس دلا کر میں نے اپنا پتہ بھی اُسے دیدیا ہے۔اُسکی آنکھیں حسین مستقبل کے سپنے دیکھنے لگی ہیں۔

اچانک مائیکروفون گونج اٹھا ہے۔''فلائٹ نمبر بی۔اے تین سو پچاس تیار ہے پرواز کے لیے۔مسافر صاحبان جہاز میں سوار ہو جائیں''۔

اور اب میں جہاز کے اندر بیٹھی اُس بوڑھے باپ کے خشک ہونٹوں کے تبسم کو یاد کر رہی ہوں جو مرے بہلاوے کے وعدے پر مسکرا پڑا تھا مجھے یاد آ رہا ہے اُس کا سلوٹوں سے پُر چہرہ' بجھی ہوئی آنکھوں میں اُمیدوں کی غیر معمولی چمک جو میری جھوٹی تسلیوں سے پیدا ہوئی تھیں۔

جہاز آہستہ آہستہ سپاٹ سینے والے رن وے پر آگے بڑھ رہا ہے۔گردش کرتے ہوئے پنکھوں سے ایک افسردہ پکار سن رہی ہوں جہاز ایک جس لگا کر' فضا میں بلند ہو کر مغرب کی طرف پرواز کر رہا ہے۔مجھے اس سرزمین سے بہت دور لیے جا رہا ہے جہاں اس محبت کرنے والے باپ جیسے سادہ لوح انسان بستے ہیں۔

رات کے تین بجے ہیں۔ایرپورٹ کی رنگا رنگ روشنیاں دور ہوتی جا رہی ہیں جیسے زمین بھی ایک دوسرا آسمان ہو جہاں ستارے ٹمٹما رہے ہیں۔جیسے میں ستاروں سے آگے جا رہی ہوں۔سب کچھ چھوٹا جا رہا ہے۔دھندلا ہوتا جا رہا ہے.....دُور.....اور دُور..... یہاں تک کے وسیع و عریض ایرپورٹ ایک نقطہ بن گیا۔زمین بہت نیچے چھوٹ گئی۔بادل کے ٹکڑے بہت نیچے آزاد پرندوں کی طرح اپنے نرم سفید پروں کو پھیلائے خلاؤں میں اُڑتے پھر رہے ہیں۔میری کھڑکی پر پورا چاند بھرپور شباب کے ساتھ جگمگا رہا ہے۔مجھے تھام کر میرے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔سب کچھ چھوٹ گیا لیکن یہ چاند ایک سچے ساتھی کی طرح میرے ساتھ ہے۔کھڑکی کی آبگینے کی دیوار میں سرایت کر کے اپنی چاندنی کی بانہوں میں سمیٹ لیا ہے مجھے۔کوشش کے باوجود نیند کا کہیں پتہ نہیں ہے۔رہ رہ کر ایک عجیب سی خلش ستا رہی ہے۔اُس دکھی باپ کی غمزدہ آنکھیں یاد آ رہی ہیں جن سے ٹپکے ہوئے آنسو میرے دل پر پتھر بن کر گرے ہیں۔جس کے معصوم دل نے میرے اُس وعدے پر یقین کر لیا ہے جسے میں پورا نہیں کر سکتی۔اُس کی التجا آمیز نگاہیں مجھے گھور رہی ہیں۔چیخ چیخ کر مجھے میرا وعدہ یاد دلائے جا رہی ہیں۔

وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزرتا رہا۔بہار و خزاں کا چکر چلتا رہا۔

باقی صفحہ ۳۷ پر ملاحظہ کیجیے

''حوصلوں کا امتحاں''

عطیہ سکندر علی
(سکھر)

''سچائی کا عمل''

کرچیاں یقیناً ایک منفرد کتاب ہے جس کی تصنیف و ترتیب میں پروین شیر کے فنی سلیقے نے شعور کے ساتھ ایک نئی بستی آباد کی ہے۔ پروین نے سچائی کے عمل سے اپنے فن کو جلا دی ہے۔ کرچیاں اسی واسطے میرے لیے ایک نہایت سنجیدہ کاوش ہے جس میں پروین نے اپنی روح کو خونِ جگر سے سینچا اور نمایاں کیا ہے۔ میں نہ صرف اس مجموعے کی ترتیب، تالیف وطباعت سے بلکہ پروین شیر کی شاعری اور مصوری دونوں سے حد درجہ متاثر ہوا۔

جہاں تک اُن کی شاعری کا تعلق ہے اس میں عصری شعور اور کربِ تخلیق نے ایک ایسی روح پھونک دی ہے کہ ان کی نظمیں قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ پروین کی شاعری میں جہاں احساسِ تنہائی متاثر کرتا ہے وہاں دیس کو پردیس اور پردیس کو دیس بنانے کا تجربہ بھی ایک ایسے اضطراب کو جنم دیتا ہے جو پروین کی شاعری کی پہچان بن گیا ہے اور اس لیے ان کی شاعری میں جو آواز جنم لیتی ہے وہ ان کے لہجے کے لحن کو حزنیہ بنا دیتی ہے۔ یہ حزنیہ لہجہ بھی پروین کی شاعری کی ایک اور پہچان ہے۔

پروین کی شاعری کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ عام و خاص دونوں قسم کے تجربوں کو سادہ الفاظ میں اس طرح بیان کر دیتی ہیں کہ ان کا تجربہ قاری تک پہنچ جاتا ہے۔ اپنے تجربے کو دوسروں تک پہچانے کا یہ تخلیقی عمل پروین کا کمالِ فن ہے مثلاً ان کی نظم Survival (جس کے لیے ''بقا'' کا لفظ بطور عنوان استعمال کیا جا سکتا تھا) کو لیجیے یا ان کی نظم ''کٹھن سوال'' یا ''تذبذب'' کو پڑھیے تو آپ مجھ سے اتفاق کریں گے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی (کراچی)

''انسانیت کی اعلیٰ قدریں''

پروین شیر اردو کی شاید واحد شاعرہ ہیں جن کا تعلق بیک وقت مصوری اور موسیقی سے بھی ہے۔ وہ اپنے فنِ مصوری کا مسلسل مظاہرہ کرتی رہی ہیں جس کی پذیرائی بین الاقوامی سطح پر ہوتی رہی ہے۔ تخلیق کار اگر مصور بھی ہو اور موسیقی کار بھی تو پھر فن اور آرٹ کی ایک نئی دنیا تعمیر ہو سکتی ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ ہر فن کی غایت ہے کہ شاعری ہو جائے اور شاعری موسیقی میں مبدل ہو جانا چاہتی ہے۔ اس تصور کے تحت پروین شیر کے شعری امکانات اور بھی بڑھ جاتے ہیں۔

میرے سامنے ''کرچیاں'' ہے۔ یہ شاعری اور مصوری کا دلکش مجموعہ ہے۔ ہر صفحے پر مصور پروین شیر نے اپنی مصوری کی جوت جگانے کی کوشش کی ہے۔ ہر تصویر میں زندگی کا کوئی نہ کوئی رُخ سامنے آیا ہے۔ اگر اتنا ہی کچھ ہوتا تب بھی اس کا امتیاز روشن ہوتا لیکن یہاں تو تمام مصورانہ پیکر باضابطہ شاعری کا جامہ پہنے نظر آتے ہیں۔ گویا ہر نظم Illustrated ہے۔ ایسی صورت میں تصویر اور شاعری دونوں ہی کی معنویت اور بھی نکھر گئی ہے۔ خود شاعرہ نے اس کا احساس دلایا ہے کہ وہ اس دنیائے آب وگل کے دوہرے معیار سے عاجز ہیں، ناانصافیاں انہیں کچوکے لگاتی ہیں، مظلوم طبقے کی حرماں نصیبی انہیں اذیت میں ڈالتی ہے۔ وہ چاہتی ہیں کہ استحصال کی ہر شکل مسدود ہو جائے اور انسانیت کی تمام اعلیٰ قدریں استوار ہو جائیں۔ ان کا یہ نصب العین ہی انہیں مصوری کی طرف راغب کرتا ہے اور شعری تجسس پیدا کر کے ایک تخلیقی کائنات سامنے لاتا ہے۔

پروفیسر وہاب اشرفی (پٹنہ بہار)

''یونانی دیومالا کی دیوی''

پروین شیر کی تخلیق میں اُبال اور اظہار کی بہار دیکھ کر میرا وہم یقین میں بدل گیا ہے کہ تخلیقی بہاؤ میں زور اور خونِ جگر میں حدت ہو تو قوسِ قزح کا سماں باندھا جا سکتا ہے۔

پروین شعر بھی خوبصورت کہتی ہیں، موسیقی سے لگاؤ بھی رکھتی ہیں، مصوری کی جادوگری میں بھی اور نہ معلوم حرف و رنگ وصورت کی کیا کیا دنیائیں بناتی رہتی ہیں۔ وہ شاعر کا دل، مصور کی آنکھ اور مطربہ کے ہاتھ رکھتی ہیں۔ ان سب میں شعر کہنا جان جوکھوں کا کام ہے یہ میرا تجربہ ہی نہیں بیشتر تخلیق کاروں کا یہی خیال ہے کہ جب تنِ شاعری میں سیروں خون صرف ہوتا ہے تب کہیں ایک مصرع تر کی صورت نظر آتی ہے۔ معلوم نہیں وہ کون سی اعترافِ شکست کی گھڑی تھی جب میں نے یہ شعر کہا تھا:

ہم آبجو تھے زمانہ سمندروں جیسا
کہاں سے حوصلہ لاتے پیغمبروں جیسا

زندگی سے نبرد آزمائی میں کم حوصلگی کی ایسی ساعتیں آتی ہیں کہ تخلیقی سفر میں دم الجھنے لگتا ہے مجھے حیرت اُن حوصلہ مند فنکاروں پر ہوتی ہے جو چومکھی لڑ رہے ہوتے ہیں اور اس کے لئے خونِ جگر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ ان میں سے کسی فن کے لئے بھی بے پناہ talent ناگزیر ہے۔ خوش قسمت ہیں پروین شیر کہ ان تمام فنون سے انہیں لگاؤ ہی نہیں ان پر دسترس بھی حاصل ہے۔

مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے پروین یونانی دیومالا کی کوئی دیوی ہے جس کا ایک دل دو آنکھیں اور چار ہاتھ ہیں۔ کسی ہاتھ میں کتاب ہے، کسی میں موقلم، کسی میں ساز اور کسی میں مشعل، روشنی رنگ اور خوشبو اور انکا منبع محبت کا وہ نور ہے جو اس کے ہر ہاتھ کی پوروں سے پھوٹ رہا ہے۔ پھر ان تمام کرشمہ سازیوں کے ساتھ ساتھ انسانی دکھ کی آگ جو انہیں مضطرب اور بے قرار رکھتی ہے اور یہی آگ ہے جو فن کار کی تخلیقات کو کندن اور اس کی ذات کو دیوتاؤں کا رتبہ عطا کرتی ہے۔

احمد فراز (●)

''بزمِ چراغاں''

پروین شیر ایسی شاعرہ نظر آئیں جو زندگی کے دکھ کو اپنے وجود میں جذب کر کے نغمے بکھیرتی ہیں۔ پراکرتی کے آنسو ٹپکتے ہیں تو آنسوؤں کے قطرے اکثر پھولوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ شاعرہ کے کلام سے تخلیقی عمل کی جو پہچان ہوتی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کرب کے لمحے کیسے تھے۔ زندگی کو دلفریب اور دلکش دیکھنے کے لیے اور آنے والے کل کے حسن کے تئیں اندر کی یہ پراکرتی کتنی بیدار ہے۔ زمانہ کی شکست وریخت کو شدت سے محسوس کرتے ہوئے اور زندگی کے المیے کو بخوبی جانتے بوجھتے جو بنیادی جمالیاتی رجحان اُبھرتا ہے وہ یہ ہے:

شام ہوتے ہی جو اشکوں کے دیئے جلتے ہیں
ان میں اک بزمِ چراغاں کا سماں پاتی ہوں

شکیل الرحمٰن (گوڑگاؤں، بھارت)

''پیڑ کی چھاؤں میں تجلی''

پروین کا تعلق مہاتما گوتم بدھ کی سرزمین ''بہار'' سے ہے۔ وہ بہت چھوٹی عمر میں اپنے وطن سے دور ہو گئیں اور مغربی ملکوں میں زندگی گزارتی رہیں۔ مہاتما بدھ نے ''گیا'' میں ایک پیڑ کی چھاؤں میں ''تجلی'' دیکھی تھی۔ پروین نے اپنی ذات کے ''گیا'' میں اس تجلی کو دیکھا اور ''فن کی دنیا'' میں سفر شروع کر دیا۔ ایک قلم ایک موءقلم اور ایک ستار۔ وہ اپنے ان رفیقوں کے ساتھ ''تنہا'' سفر کرتی ہیں۔ اس دنیا میں پروین نے اپنے لیے ایک ''اجنتا'' تراشا اور اس کی وادیوں کو امیر خسرو کے ایجاد کردہ ساز ''ستار'' کی نغمگی سے آباد کر دیا۔ میں پروین شیر کے بارے میں سوچتا ہوں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کی شاعری میں رنگ بولتے ہیں اور تصویروں میں الفاظ۔ اور یہ تصویریں ہمیں شاعری کی ایسی دنیا میں پہنچا دیتی ہیں جو پروین کی اپنی دنیا ہے اپنی تخلیق کردہ کائنات۔

احمد فراز نے پروین کو یونانی دیومالا کی دیوی سے تشبیہ دی تھی میں انھیں ہندوستان کی دیوی ''سرسوتی'' سے تعبیر کرتا ہوں جو علم اور موسیقی کی دیوی ہے اور پروین کے وجود میں آ کر رنگوں کی دنیا میں آباد ہو گئی ہے۔

حمایت علی شاعر (کراچی)

''پروین کا کمال''

پروین کی شاعری کے موضوعات کچھ انوکھے یا عجوبے نہیں ہیں۔ موضوعات وہی ہیں جنہیں ہم اور آپ ہر روز دیکھتے سنتے یا پڑھتے ہیں۔ پروین کا کمال یہ ہے کہ اُنہوں نے معمولی موضوعات کو شدت کے ساتھ محسوس کیا اور پھر اُنہیں ایسے لفظی پیکر اور مصوری میں ڈھال دیا جو ہمارے فنون لطیفہ کی عمدہ مثال بن گئے۔ پروین کی ایک مخصوص زبان ہے جہاں الفاظ اور جذبات کا تلاطم ہے۔ دونوں ہی ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور پھر مل جل کر معنی کی ایک دنیا آباد کرتے ہیں۔ جہاں جذبات اور خیالات کا اژدہام ہوتا ہے وہاں فطری طور پر زبان رواں اور سلیس ہو جاتی ہے۔ انہوں نے بھی عام بول چال کے الفاظ سے اپنی نظموں کی عمارت کھڑی کی ہے۔ البتہ اُن کی غزلوں میں زبان کے معاملے میں ایک اہتمام نظر آتا ہے۔ اُن کی نثر ایک شاعری معلوم ہوتی ہے۔

پروفیسر اے ایم پٹھان (حیدرآباد دکن)

''دامانِ نظر''

پروین شیر کی شخصیت میں جو بنیادی تخلیق کار موجود ہے وہ مصوری، شاعری اور موسیقی تینوں جہتوں میں اظہار چاہتا ہے۔ مصوری بڑی حد تک پروین شیر کی شناخت بن سکی اور شاعری کے جو شگوفے پھوٹے تھے وہ اب بھینی بھینی خوشبو بکھیرنے لگے ہیں۔ یہ مہک آسودہ کرنے والی بھی ہے اور دلگرفتہ کر دینے والی بھی۔ پروین شیر اسی خوشبو سے مہک رہی ہیں۔ ملال کی ایک سی لہران کی شاعری میں بھی نظر آتی ہے۔ سارے غم اور سارے دکھ آہستہ آہستہ ایک آسودہ سے ملال میں ڈھل جاتے ہیں۔ یہی ملال ان کی مصوری کی شناخت بنتا ہے اور شاعری کی پہچان بھی۔ پروین شیر کی مصوری کے ساتھ اس کی شاعری کا کچھ چرچا کینیڈا سے پاکستان بھی پہنچا۔ ایک خوشگوار حیرت نے دامانِ نظر کو تھام لیا۔ پروین کی شاعری میں نومشقی کے مسائل نظر نہیں آئے۔ وہ اپنے طرز احساس کے ساتھ ایک تخلیقانہ انداز سے شعر کہتی ہیں جو اظہار وابلاغ کی شرائط پر پورے اترتے ہیں ساتھ ہی ایک درجے کی اثر انگیزی ان کی شاعری کو قابل توجہ اور محبوب بنا دیتی ہے۔

ڈاکٹر پیرزادہ قاسم (کراچی)

''شاعرانہ مصوری''

مجھے افسوس ہے کہ میں نہ مُصوّر ہوں، نہ ہی بُرش اور رنگوں کی کارستانیوں اور اُن کے پیچ وخم سے واقف۔ ہاں مگر صوری تخلیقات کی سَراہنا کرنے اور اُن کے ارتکاز کی کیفیات کا ضرور کچھ نہ کچھ درک رکھتا ہوں۔ پروین شیر جب الہٰ آباد آئیں اور انھوں نے اپنی نظموں اور مصوّری کا مجموعہ ''کرچیاں'' مجھے عنایت کیا تو میں اُسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ہم مدرّسین، درس

وتدریس کے درمیان ''شاعرانہ مصوّری'' کی باتیں تو بہت کرتے رہتے ہیں مگر ایسی مصوّری کی تجسیم ''کرچیاں'' سے پہلے میں نے کبھی نہیں دیکھی۔

پروفیسر سید محمد عقیل (الٰہ آباد، بھارت)

''شعری زبان کا بھرپور اظہار''

پروین شیر صاحبہ ایک ہمہ فن شخصیت ہیں۔ شاعری تو کرتی ہیں لیکن اس کے علاوہ مصوری میں بھی اعلیٰ مقام رکھتی ہیں اور ستار ایسا بجاتی ہیں کہ ''نغمگی کے قد بالا پر قبائے ساز تنگ''۔ پروین شیر اس لحاظ سے ایک استثنا ہیں کہ انہوں نے اپنی کوشش سے پردیس کو دیس بنا رکھا تھا۔ اُن کی مصوری اور موسیقی پر تو میں رائے دینے کا استحقاق نہیں رکھتا کہ ان دونوں فنون لطیفہ کے بارے میں میری معلومات واجبی سی ہیں لیکن مرحوم علی سردار جعفری نے ان کی دونوں خوبیوں کو جس طرح سراہا اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان دونوں میدانوں میں بھی کسی سے کم نہیں۔ جہاں تک ان کی شاعری کا تعلق ہے وہ نہ صرف روایت سے جڑی ہوئی ہے بلکہ اس میں عصری شعور کے ساتھ ساتھ برصغیر میں پیدا ہونے والے شعری رویوں سے بھی بھرپور ہم آہنگی کا احساس ملتا ہے۔ اُن کے ہاں شعری زبان کے بھرپور اظہار میں ایک مخصوص تازگی اور نیا پن ملتا ہے جیسے وہ اردو شعر کو مقامی فضا اور ماحول کی خوشبو میں رچا کر ایک نیا انداز بنانے کی کوشش کر رہی ہوں۔

امجد اسلام امجد (لاہور)

''بشریت کا احترام''

پروین بنیادی طور پر نظم کی شاعرہ ہیں۔ انہوں نے غزلوں سے زیادہ نظموں کے ذریعہ اپنے سوز دروں اور درد و کرب کی ان ٹیسوں اور زمانہ حال کی ان محرومیوں کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے جس سے آج کا انسان دوچار ہے۔ اور جسے ان کے حساس دل نے وہاں وہاں دیکھا ہے جہاں سے عام آدمی کچھ دیکھے بغیر گزر جاتا ہے۔ تجربہ گاہ، بے بسی، آخری اسٹیشن، بے چارگی، اپنا قاتل، نیلا چاند، غمگسار، آئس کریم والا، قتل، المیہ، دارالضعفا، پیدائشی روگ جیسی نظمیں اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔

ان نظموں کے مضوعات اگرچہ بظاہر ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن بشریت کا احترام، زندگی کا تقدس، اعلیٰ قدروں کی تلاش اور محسوسات کی سچی ترجمانی مشترک قدر کے طور پر نمایاں ہے۔

پروفیسر ظل الرحمٰن (علی گڑھ، بھارت)

''اوصاف ثلاثہ کی ملکہ''

پروین شیر اوصاف ثلاثہ کی مالک یا ملکہ ہیں۔ یعنی یہ شاعرہ بھی ہیں، مصوّرہ بھی اور موسیقار بھی۔ سازوں میں ستار ان کا پسندیدہ ساز ہے۔ ان کا پہلا مجموعہ کلام ''کرچیاں'' جب شائع ہو کر منظر عام پر آیا تو لوگ ان کے اِن اوصاف سے واقف ہوئے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے کہ اب تک اتنا خوبصورت گرانقدر اور گراں قیمت مجموعہ کسی اردو شاعر کا شائع نہیں ہوا ہے۔

پروین شیر کی نظموں میں ''ماں، شہر خموشاں، عراق، قد آور آدمی کا دکھ، یہ گھر پھر سے مکان ہے، دارالضعفا، ریٹائرمنٹ، ہم زاد، ڈسپوزایبل، ایلوزن، تابوت، روبوٹ، سراب، اور ایک بوڑھے کی موت پر یہ ایسی نظمیں ہیں جو قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں۔ نظموں کے عنوانات سے بھی ان نظموں کی جدّت اور انکی تازگی کا احساس ہوتا ہے۔

پروفیسر افتخار اجمل شاہین (کراچی)

''شعری مرکز و محور''

پاکستان کے دو شاعروں میں سے احمد فراز نے پروین شیر کو یونانی دیومالا کی دیوی سے تشبیہہ دی ہے۔ حمایت علی شاعر نے ہندوستان کی دیوی سرسوتی سے تعبیر کیا ہے۔ ہندوستان کے دو نقادوں میں سے پروفیسر قمر رئیس نے پروین شیر کی ذات کو بلاشبہ قدرت کے بے اماں تخلیقِ حسن کے فیضان کا انعام کہا ہے اور پروفیسر عتیق اللہ کا خیال ہے کہ پروین کے قالب میں جیسے کسی روح کا ڈیرا ہے جو ہمیشہ انہیں اضطراب میں ڈالے رکھتا ہے۔ ایک مغربی مفکر رے ڈرکس نے کہا کہ پروین کینیڈین ہیں، اکیسویں صدی میں کینیڈین ہونے کا مطلب کئی تہذیبوں اور ثقافتوں کو ایک ساتھ جینا ہے، یہ سارے خیالات مختلف سے لگتے ہیں، اس لئے کہ پروین شیر صرف شاعرہ ہی نہیں ہیں بلکہ مصوّرہ اور موسیقار بھی ہیں، یعنی شاعری کے ساتھ ساتھ فن مصوری اور موسیقی سے بھی گہرا شغف رکھتی ہیں اور یہ تینوں فن اکثر و بیشتر باہم مدغم ہو گئے ہیں اور ان کے امتزاجی انسلاکات اور انجذابی تخلیقی اظہار نے الگ الگ دیکھنے اور محسوس کرنے کے مواقع نہیں دیئے ہیں اور یہ طے کرنا بھی مشکل ہے کہ ان میں اولیت کس کو دی جاسکتی ہے، لیکن میرا خیال ہے کہ پروین بنیادی طور پر شاعرہ ہیں۔ وہ خام تانیث یا روایتی ترقی پسندی سے اوپر اُٹھ کر انسانیت اور تخلیقیت کی ایسی دلکش اور متاثر کُن تصویر پیش کرتی ہیں کہ جس کے اثر سے بچنا ممکن نہیں۔

ڈاکٹر علی احمد فاطمی (الٰہ آباد، بھارت)

''رنگوں بھرا تصویری جامہ''

مرزا غالب کے کلام کو تصویری پیکر عطا کرنے کے لیے عبدالرحمان چغتائی اور صادقین جیسے وقت کے عظیم فنکاروں کی کوشش صرف ہوئی اور یقیناً وہ فن مصوری کا شاہکار ہیں لیکن پروین شیر نے اپنے الفاظ و جذبات کو رنگوں بھرا تصویری جامہ پہنا کر جتنی خوبصورتی سے حقیقت کا اظہار کیا ہے اس اعتبار سے پروین شیر کی یہ کاوش، بہت ہی (Unique) ہے ساری پینٹنگس اپنے عنوانات اور نفس مضمون سے انصاف کرتی ہوئی نظر آتی ہیں ان کی مصوری میں اکثر چہرے ایک انمٹ دکھ، گہرے حزن و ملال اور خاموش اذیت کی عکاسی کرتے ہیں ان کے مجموعہ کلام کی پہلی تصویر میں عورت اپنے پورے وجود کے ساتھ جل رہی ہے دھواں دھواں بن کر فضاء میں تحلیل ہو رہی ہے مگر اپنے وجود کو گھلا کر بھی

وہ کائنات میں روشنی بکھیر رہی ہے ایسا لگتا ہے برش سے غم نکل نکل کر رنگوں کا روپ دھار رہے ہیں۔

نیئر جہاں (یو۔ایس۔اے)

''رفاقت کا احساس''

پروین شیر ہمارے عہد کی شاعرات کی عمومی آوازوں سے بہت حد تک مختلف ہیں۔ ان کی شاعری ہمارے دور کی اس عمومی شاعری سے بھی ایک علیحدہ رنگ و آہن رکھتی ہے۔ پروین کی شاعری ہمیشہ مکالمے کی ایک راہ روشن اور کشادہ رکھتی ہے۔ اس سے مکالمہ کرتے وقت کسی قسم کی مغائرت کا کوئی احساس حائل نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ اپنے قاری سے حجاب کرتی اور محبوباؤں ایسی بے پروائی کی موجب ہوتی ہے بلکہ اپنی بہترین کوشش میں پروین ہمارے اردگرد کی بھُربھُری مٹی ہی سے لوئی بناتی ہیں اور اسے ایک خاص سانچے میں ڈھالتی ہیں۔ اس طور پر نظم کے اندر اور باہر کی جو شکل اُبھر کر سامنے آتی ہے اس میں رفاقت کا مانوس احساس ہمارے دامن گیر ہو جاتا ہے۔

پروفیسر عتیق اللہ (دہلی، بھارت)

''محاورات کی چاشنی''

پروین کی غزلوں اور نظموں میں استعاراتی نظام کا خوبصورت استعمال ہے اور یہ عمل غزل اور نظم دونوں میں نظر آتا ہے۔ محاورات کی چاشنی لطف انگیز ہے اور سب ہوتے ہوئے بناوٹ نہیں بلکہ اوریجنل بازگشت ہے جو دل کی گہرائی سے ذہن کے اُفق پر چھا جاتی ہے۔ دوستی، وفا اور بے وفائی وغیرہ اردو شاعری کے اہم لیکن گھسے پٹے مضامین ہیں۔ اس صحرا نوردی میں نئے مضامین باندھنا اور بات کا برتنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ کتنی عمدگی اور سچائی سے پروین نے اس راستہ کو طے کیا۔ کسی قدیم شاعر نے حنا کے پس جانے کو ایک محنت کش مثبت اقدام جان کر مضمون تراشا لیکن جب یہ خیال پروین نے باندھا تو مضمون بالکل جدا رہا۔ کہیں ستائش ہے اور کہیں سرزنش ہے اور اسی کا نام شاعری ہے۔

ڈاکٹر سید تقی عابدی (کینیڈا)

''اپنی شناخت''

پروین کے طریقۂ اظہار میں ان کی اپنی شناخت موجود ہے جو ان کے سماجی شعور اور آگہی کو نمایاں کرتی ہے۔ انہیں کرب اور احساس کا اندازہ ہے کہ ان کی کیا شناخت ہے جو معاشرے کے عام آدمیوں کی زندگی کے مسائل کا احاطہ کر سکے جنہیں وہ اپنی تصویروں کے ذریعہ نمایاں کر سکیں۔ یہ بات بھی بہت اہم ہے کہ پروین کی تصاویر کے تار پود (Texture) میں مشرق کے تہذیبی ماحول کا عکس ہے اگرچہ ان کا مستقل قیام مغرب میں ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ اپنے فن سے گہرے طور پر وابستہ ہیں ان کی سوچ کی جڑیں مضبوطی کے ساتھ مغربی سرزمین کو پکڑے ہوئے ہیں۔ ان کا فن اختراعی نہیں ہے بلکہ ان کی تصویریں اپنی سوچ کے تحت ان کی تہذیب کے گوشوں کی وضاحت کرتی ہیں جس سے اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔ ان کی تصاویر کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ ان کے یہاں خیال اور نقوش میں ربط ہے جس سے ان کی اعلیٰ ذہنی دسترس کا پتہ چلتا ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پروین شیر کی مصوری کا شعور ایک وسیع دائرے میں شہاب ثاقب کی طرح ابھر رہا ہے! یہ احساس خوش آئند ہے کہ اس کے پس منظر میں محبت کی جنوں خیزی کے ساتھ متانت بھی ہے جس سے جذبوں کی شادابی کے علاوہ ان کے تجربوں و اکتسابات کی کیفیات واضح ہوتی ہیں۔

عشرت رومانی (کراچی)

''تکمیلِ حسن''

''کرچیاں'' میں جو نظمیں شامل ہیں، ان میں نیلا چاند، خود فریبی، تین گھنٹوں کی موت، تذبذب، اعتراف، ہم زاد، شہر خموشاں، میرے بیٹے شیراز تمہارے لیے، میری بیٹی صہبا تمہارے لئے، روبوٹ، خوبصورت خواب سا گھر، اور ایک بوڑھے کی موت پر وغیرہ بیحد اہم تخلیقات کی ذیل میں آتی ہیں، جی تو یہی چاہتا ہے کہ ان تمام نظموں کو یا پھر ان کے کچھ حصوں کو پیش کروں اور اپنے قارئین کو بتا دوں کہ یہ احساسات اور فکر کی تمازت اور بلوغت کی شاعری ہے، اس شاعری کو منظر عام پر لا کر پروین شیر نے ادب کی دنیا میں اپنی موجودگی کا احساس دلایا ہے۔ یہی چیز ہماری شاعری کی کامیابی کی دلیل ہے، اب آیئے تھوڑی دیر ان کی غزلوں سے متعلق گفتگو کر لیں، دراصل اس بات کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے کہ پروین شیر بحیثیت نظم نگار اول مقام پر ہیں یا پھر انہیں نظم نگاری سے زیادہ غزل گوئی میں ید طولیٰ حاصل ہے یا پھر دونوں حیثیوں سے الگ ان کی مصوری انہیں بلند مقام فائز کرتی ہے۔ ہمارا موقف یہ ہے کہ ان کی تینوں حیثیتیں ایک دوسرے کی تکمیل اور حسن میں اضافے کا باعث ہیں۔

محمد ایوب واقف (ممبئی، بھارت)

''رنگ و نور کی دنیا''

پروین شیر نے شاعری کو صرف وقت گزاری اور تفریح کا ذریعہ نہیں بنایا بلکہ دیگر قلم کاروں کو بھی اس موضوع کی طرف راغب کرنے کے لئے اس صحرا میں قدم رکھا ہے تا کہ یہاں دھنک دھنک پھول کھلیں۔ رنگ و نور کی دنیا سجے اور اشعار کی آمد کا دروازہ کھلے۔ یوں پروین شیر کی شاعری ایک تحریک بھی ہے جو نامساعد حالات میں نہ صرف فکر و نظر کے نئے زاویوں کی تلاش کے لیے ابھارتی ہے، بلکہ نظم میں تغزل کا رنگ سموتی ہے۔ تغزل جو محبت کا ہی ایک انوکھا روپ ہے۔ اور محبت کہ جس کے بغیر اس کائنات کے وجود میں آنے کا بھی کوئی جواز نہیں۔ یہ محبت ہی ہے کہ محبوب سے بچھڑ جانے کے بعد اس کی یادیں اس کی نشانیوں سے لپٹی رہ جاتی ہیں اور کبھی جدا نہیں ہوتیں۔

سلطانہ مہر (یو۔کے)

''پیکر تراشی کا عمدہ نمونہ''

پروین شیر اردو شاعرات میں اپنی انفرادی شناخت رکھتی ہیں۔ انھوں نے روایتی اسالیب اور موضوعات سے یکسر انحراف کرتے ہوئے ایک نئی شعری کائنات تخلیق کی ہے۔ ''کرچیاں'' کی نظموں میں انھوں نے تمثیل کا پیرایہ فن کاری کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ ان نظموں میں موضوعات کا بڑا تنوع ہے۔ حزن و یاس کی کیفیت ان کی شاعری میں زیریں لہر بن کر رواں دواں ہے۔ ان کی بعض نظمیں پیکر تراشی کا عمدہ نمونہ ہیں جن میں تجسیم و تشخص کے علاوہ کہیں متعلقات فعل اور کہیں صفات کا استعمال توجہ کو کھینچتا ہے۔ یہ نظمیں چلتی پھرتی تصویریں بن جاتی ہیں اور پڑھنے والوں کے حواس کو جگا دیتی ہیں۔ خود پروین شیر نے نظموں کو مصور کر کے ان میں روح پھونک دی ہے۔

مغنی تبسم (حیدرآباد دکن)

''دل و ماغ کی کشادگی''

پروین شیر کی کرچیاں (Fragments) ایک ایسی مصنفہ جس کی تصنیف کا مطالعہ پہلے نہیں کیا گیا ہو، تبصرہ نگار کے لیے اس کی کتاب ایک چیلنج ہے۔ اس کام کے لے دل و دماغ کی کشادگی لازم ہے۔ اس ضمن میں پروین شیر کی معرکتہ لآرا کتاب ''کرچیاں'' خاص طور پر توجہ طلب ہے چونکہ ہمارے پیش نظر ان کی شاعری کے علاوہ ان کی مصوری کے شاہکار بھی ہیں جو اس کتاب میں شامل ہیں اور جن کے اجزا کی بنیاد ان کی فکر رسا اور تخلیقی تحریک ہے۔ وہ بیک وقت ذہنی نقشہ کی اور سوچ و فکر کی پرواز کا کثیر الجہت انداز دونوں کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ ان کی کتاب سے محظوظ ہونے کے لیے قاری کو مکمل طور ان کے تخلیقی کاموں میں منہمک ہونا پڑتا ہے۔

ڈاکٹر عروج اختر زیدی (کینیڈا)

''استثنائی مثال''

پروین شیر کی تخلیقات کو ان کی مصوری سے علیحدہ کر کے بھی پڑھا اور ان کی معنویت کو دریافت کیا جا سکتا ہے چنانچہ ایک اہم بات جو قدرے حیران کن بھی ہے وہ یہ کہ موجودہ دور میں جبکہ تمام دنیا اور برصغیر کی اردو دنیا میں خواتین شعراء بالعموم اپنے تشخص کی جستجو Empowerment اور ہم جنسوں کے حقوق کی حفاظت کی جدوجہد میں تخلیقی طور پر نہایت سرگرم ہیں، پروین شیر کی غالباً استثنائی مثال ہے کہ وہ Gender sepecific موضوعات پر لکھنے اور صرف اپنی ذات کے نہاں خانوں تک محدود رہ کر کائناتی حقائق کو اجزاء کے بجائے ایک کلیت میں دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کرتی ہیں۔ وہ تمام دنیائے انسانیت کے آلام کو اپنی ذات میں سمیٹ کر ہر چھوٹے بڑے درد سے اپنا رشتہ استوار کرنے کی آرزو کرتی ہیں۔

قاضی عبیدالرحمٰن (دہلی، بھارت)

''حوصلوں کا امتحاں''

پروین ایک شاعرہ ہیں، مصورہ ہیں اور موسیقار ہیں۔ گویا یہ اپنے جذبات، خیالات اور محسوسات کا ابلاغ تین ذرائع سے کر سکتی ہیں یعنی قلم، بُرش اور ساز۔ اگرچہ ان تینوں کا رشتہ بہت قریبی ہے لیکن میرے خیال سے اردو شاعری میں ایسی ہمہ صفت ہستیاں خال خال ہی ملیں گی۔

یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

پروین شیر نے اپنی ایک غزل میں کیا خوب کہا ہے:

ہوا کی زد پہ جیسے شمع کی لَو
میں اپنے حوصلوں کا امتحاں ہوں

میں اس امتحان میں ان کی کامیابی کے لئے دعا گو ہوں۔

ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ معین قریشی (کراچی)

''انسانیت کی علمبردار''

پروین شیر دراصل انسانیت کی علمبردار ہیں، وہ انسانی زندگی کی فلاح و بہبود کی خواہاں ہیں، ان کے سینے میں ایک دردمند دل ہے جو کبھی جنگ کی ہولناکیوں پر خون کے آنسو روتا ہے کبھی نسلی عصبیت کا شکار ہوئے لوگوں پر ماتم کناں نظر آتا ہے، کہیں طبقاتی کش مکش کے خلاف، کبھی گمراہ حکمرانوں کی ڈکٹیٹرشپ کے خلاف آواز بلند کرتا ہے۔

پروین شیر کی شاعری اور مصوری دونوں عالم امن کے لئے فضا تیار کرتی ہیں، جگہ جگہ احتجاجی صورت دیکھنے کو ملتی ہے، انسانیت کے حق میں ان کا یہی مثبت رویہ ان کی شاعری کو آفاقیت بخشتا ہے۔

ڈاکٹر اسلم الٰہ آبادی (بھارت)

''بین الاقوامی آواز''

پروین شیر شاعرہ ہیں، مصوّر ہیں، موسیقار ہیں۔ شاعری کا شوق بچپن سے ہے۔ آپ نے نظمیں بھی کہی ہیں اور غزلیں بھی۔ پینٹنگ کی تو باقاعدہ یورپ میں تعلیم حاصل کی ہے۔ اس لئے آپ کی شاعری اور پینٹنگس میں ایک نئی فضا، نئی آواز محسوس ہوتی ہے۔ جب بھی آپ کا قلم یا بُرش کینیڈین لینڈ اسکیپ پر نقش و نگار اُبھارتا ہے تو ان کی حیثیت بین الاقوامی ہو جاتی ہے۔

پروین شیر کی شاعری میں استعارات اور علامات کا ایک نپا تُلا اور متوازن استعمال ہے جس میں کِنایات اور اشارات بھی در آتے ہیں اور لفظی سطحوں سے نیچے اترتے ہوئے قاری کو ان معنوی گہرائیوں کا احساس ہونے لگتا ہے جو بظاہر اس کی دسترس سے بعید تھیں۔

پروفیسر افراہیم (علی گڑھ، بھارت)

''تہذیب و ثقافت کی پروردہ''

برصغیر ہندو پاک کی مردم خیز سرزمین اور اردو تہذیب و ثقافت کی پروردہ، پروین شیر سات سمندر پار یہاں شمالی امریکہ کے ایک الگ تھلگ شہر ونی پیگ، میں آباد ہیں، جو شعر و ادب کے مسلّمہ مراکز سے دُور واقع ہے، اس لیے وہاں بسنے والی شاعرہ کو وہ ماحول وار مواقع حاصل نہیں جو کسی شاعر کی تربیتِ فن

اور شاعرانہ شخصیت کی تکمیل وتشکیل میں ممد ومعاون ثابت ہوتے ہیں، ایسے دُور افتادہ علاقوں میں رہنے والے شاعر جیسا کہ پروین شیر ہیں، اگر ناساز گار فضاء کے باوجود اُبھر کر سامنے آتا ہے اور اپنا فنی سفر ایک خاص استقامت کے ساتھ طے کرتا ہے تو اس کا اپنی شاعرانہ صلاحیتوں پر غیر معمولی اعتماد ہونا ازبس ضروری ہے، اسی لیے پروین شیر کی غزل کی تہہ میں انانیت کا سرکش جذبہ ایک موجِ تند خو کی صورت میں بار بار اُبھرتا ہے، وہ اس کلی کی مانند ہیں جو خود اپنے زورِ نفس سے کھلتی اور پھول بنتی ہے۔ روحِ عصر کی تپش نے انہیں روشن کر دیا ہے۔

تسلیم الٰہی زلفی (کینیڈا)

''وسیع تر کائنات''

پروین شیر کا شعری اسلوب پیچیدہ نہیں ہے نہ ہی وہ ابہام زدہ طرز اظہار کی قائل ہیں۔ کہیں کہیں پر انہوں نے اپنی بات نامکمل چھوڑ دی ہے تو اس سے تاثر میں اضافہ ہی ہوا ہے۔ اُن کی زبان عام فہم سادہ اور سلیس ہے۔ اضافتیں اُن کے یہاں کم کم ہیں اور پرشکوہ بھاری بھرکم لفظوں سے انہوں نے اجتناب برتا ہے۔ کہیں کہیں فارسی ترکیبیں معنی کو روشن کر کے بات کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتی ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے میراجی، مجید امجد، وزیر آغا یا خلیل الرحمٰن اعظمی و محمد علوی کے رنگ وآہنگ سے ناطہ جوڑا ہے۔

اُن کے موضوعات زندگی کی طرح متنوع ہیں۔ اپنی ذات اور اس کے مختلف پہلوؤں کو نشان زد کر کے انھوں نے وسیع تر کائنات کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے۔ موجودہ سیاست کے جبر اور نادار قوموں کے حال زاد پر بلا واسطہ یا بالواسطہ انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ عصر حاضر کی خون آلودہ نوآبادیاتی تاریخ کے ایک بڑے حصے کو رقم کر کے ہمیں اپنی اوقات بتا رہا ہے۔ اپنے عہد کے اضطراب کا عکس ان کے قلم اور موقلم سے مصور ہو کر ہمیں بھی لہولہان کر رہا ہے۔ میں اُن کی ترقی پسندی، جدیدیت یا مابعد جدیدیت کے خانوں میں رکھ کر نہیں دیکھ سکتا کہ ان کی تخلیقات کا دامن بہت وسیع ہے۔ انہوں نے اپنے گردوپیش کو کھلی آنکھوں سے دیکھا ہے اور اسے پیش کرنے میں کسی رعایت سے کام نہیں لیا ہے۔

ارمان نجمی (پٹنہ، بہار)

''انوکھی اور توجہ طلب آواز''

پروین شیر عہدِ حاضر کی اردو شاعری میں ایک بالکل انوکھی اور توجہ طلب آواز بن کر ابھری ہیں۔ فنی اسالیب، لفظوں کے برتنے کا انداز، امیجری کی خصوصیت، داخلی کیفیات کو فطرت کی ٹھوس اشیاء میں منتقل کرنے کا آرٹ اور اس طرح کی دوسری بہت سی خوبیاں ہیں جو پروین شیر کو آج کے شعری منظر نامے میں معزز مقام عطا کرتی ہیں۔ بنیادی طور پر مصور اور شاعرہ کی دوہری شخصیت پروین شیر کے فن میں الگاؤ پیدا نہیں کرتی بلکہ یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے معاون بن کر ان کی تصویروں کو شعری حسن عطا کرتی ہیں اور ان کی شاعری میں تصویرات کے رنگ وروغن بھر دیتی ہیں۔

علیم اللہ حالی (گیا، بہار)

''انتہائی خوبصورت غزلیں''

پروین شیر کی شاعری کی شناخت ان کی نظموں سے کی جاتی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے انتہائی خوبصورت غزلیں بھی کرچیاں میں شامل کی ہیں۔ وہ اپنی نظموں میں جو موضوعات اور فکری تانے بانے پیش کرتی ہیں ان پر کسی ایک شاعر کی اثر آفرینی نہیں نظر آتی ہے، پروین شیر نے اپنی دلگداز شعریات میں مصوری اور موسیقی کے جوہرات کو مدغم کر کے ہماری ثقافت کے کینوس پر اک ایسا نقش پیدا کیا ہے جس کی ندرت ہمیشہ باقی رہے گی۔

اطہر رضوی (کینیڈا)

''احساسات کا وسیع کینوس''

پروین شیر کو اگر نابغۂ روزگار شخصیت کا مالک کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا اس لئے کہ وہ بیک وقت شاعرہ بھی ہیں اور مصورہ بھی۔ سونے پر سہاگا نغمہ ساز کی دھنی بھی۔ اس طرح اُن کی شخصیت دو (۲) آتشہ ہی نہیں سہ آتشہ بھی ہے۔ اُن کی شاعری احساسات کا ایسا وسیع کینوس ہے جس کے شفق رنگ حروف رباب فکر کے تاروں کو چھیڑنے اور ذہن میں جل ترنگ کی لہریں پیدا کرتے ہیں۔ اُن کی نظموں میں چھپے رموز ومعانی نگاہ کے سامنے تصویر کی شکل میں اُبھرتے ہیں تو اُن کی پینٹنگز (Paintings) میر وغالب کی غزلوں کی طرح دعوتِ فکر دیتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

کوثر صدیقی (بھوپال، بھارت)

''ماں کا تصور''

پروین شیر کا نام مصوری اور شاعری کی دنیا میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ اُن کا ضخیم شعری مجموعہ (کرچیاں) ادبی دنیا میں کافی عزت کی نظروں سے دیکھا جا رہا ہے۔ کتاب کی خوبصورت بناوٹ، سجاوٹ اور اشعار کے ساتھ مصوری، قاری کو اپنی طرف متوجہ کر رہی ہے۔ اُن کے اس مجموعے کی خوبی یہ ہے کہ اُنھوں نے اپنی ہر تخلیق میں زندگی کا کوئی نہ کوئی نیا رخ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس مجموعے کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ اس میں ساری نظمیں اور غزلیں انگریزی میں ترجمہ کی گئی ہیں، اس سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ اُن کی تخلیقات اب صرف اردو دنیا ہی تک محدود نہیں ہیں بلکہ انگریزی کی دنیا میں بھی لوگ اُن کے احساسات کی ترجمانی کو سمجھ سکتے ہیں۔ اُن کی شاعری میں ایک خوبصورت پہلو اور بھی آیا ہے اور وہ پہلو ہے بچوں سے اُن کی بے پناہ محبت کا۔ بچوں کے دکھ ودرد کو بھی اپنی شاعری میں پیش کرتی ہیں اور اُسے دور کرنے کا عزم بھی ظاہر کرتی ہیں، اُن نظموں میں ماں کا بھی ایک خوبصورت پہلو سامنے آتا ہے۔ اُن کی نظموں میں ماں کا تصور صرف اپنی ماں تک محدود نہیں ہے بلکہ اپنی ماں کے ذریعے کائنات کی تمام ماؤں اور بیٹیوں کو سمیٹنے کی کوشش کرتی ہیں۔

شاہد ماہلی (دہلی، بھارت)

مجھے پروین شیر کی دو خوبصورت اور ضخیم و عظیم کتابیں موصول ہوئیں' تزئین وتہذیب کا خوبصورت اور دیدہ زیب نمونہ..... ان کا پہلا مجموعہ ''کرچیاں'' اور دوسرا ''نہالِ دل پر سحاب جیسے'' ان مصور کتابوں کو دیکھ کر مجھے بے اختیار عبدالرحمٰن چغتائی کا ''مرقع چغتائی'' اور صادقین کی ''نقوشِ اقبال'' یاد آ گئیں۔ پروین شیر کے کمالات دیکھ اور پڑھ کر یہ احساس ہو رہا ہے کہ ان کو مصوری اور شاعری کے ساتھ ساتھ موسیقی میں بھی درک حاصل ہے۔ اسی لئے لکیروں میں مدھرتا نیں اور خطوط و رنگ میں نغموں کا سا کیف محسوس ہو رہا ہے۔ پروین شیر نے لکیروں کو رگِ جاں بنا دیا ہے اسی لئے مصوری میں جو رنگ ہیں ان میں جہانِ معانی پوشیدہ معلوم ہوتے ہیں اس کا سبب صرف ایک ہی ہے کہ وہ انسانی درد کی کیفیت کو اپنے دل میں محسوس کر کے خطوط و رنگ سے وہ بات پیدا کرتی ہیں جو کرب اور ضبط کی ملی جلی کیفیت سے اُبھرتی ہے وہ بھی نہایت شدت کے ساتھ۔ یہ باتیں کرتے ہوئے مجھے میر تقی میر کا شعر یاد آ گیا ہے۔

ہم کو شاعر نہ کہو میر کے صاحب ہم نے
درد و غم اتنے کیے جمع تو دیوان کیا

پروین شیر کی مصوری میں درد و غم کی جو کیفیت اور احساس ہے وہی ان کی شاعری میں بھی ہے۔

سلطان جمیل نسیم (کراچی)

''تازہ کار شاعرہ''

پروین شیر کو زبان پر قدرت حاصل ہے۔ وہ تازہ کار شاعرہ ہیں۔ نسوانی جذبات کی عکاسی اور نظم میں کہانی بیان کرنے کا ہنر پروین شیر کو خوب آتا ہے۔ آئے دن کے مسائل کو دور سے تماشا دیکھنے والے کی طرح نہیں پیش کرتیں بلکہ اس رخ کو پیش کرتی ہیں جو ہر فرد کے سامنے آتا ہے، اپنے احساس اور تجربے کو تخلیق کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے اسلوب کی تازگی پر اور اظہار کی معصومیت اور سچائی پر ان کی نظر ضرور ہوتی ہے۔ تمام ممکن اجزا، منازل اور ذہنی طریق کار کے ساتھ شعور کے مکمل ہونے تک سبھی سلسلے ان کی یہاں نئے ذائقہ اور لفظیات کی نئی تازگی کے ساتھ ملتے ہیں۔ اکیسویں صدی کا انسان سائنس کی دوڑ میں بہت آگے نکل چکا ہے لیکن بے چہرگی کو دور کرنا معکوسی عمل نہیں ہے۔

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی (بھاگل پور' بہار)

''جدلیاتی عمل''

ان کی تخلیقی آگہی جدلیاتی عمل کو جاری رکھتے ہوئے زندگی کے مروجہ اور ان غیر مروجہ اصولوں' جن کو اصل میں رائج ہونا چاہیے تھا کہ ساتھ ایک ایسا رابطہ قائم کرتی ہیں کہ جمالیاتی انبساط وسیع فکری توسیع کے ساتھ ان کے تجربات اور مشاہدات کی تشکیل تخلیقی سطح پر کرتا ہے۔ ان تجربات اور مشاہدات سے جو بھی نتیجہ اخذ ہوتا ہے، پروین شیر اسے بہت پر اثر انداز میں تخلیقی جامہ پہناتی ہیں۔ ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے زندگی کے تجربات و مشاہدات کو کڑی در کڑی جوڑتے ہوئے ایک کل کی طرح اپنی نظموں میں برتا ہے ان کے موضوعات کا ایک سلسلہ ہے جو الگ اور مختلف بھی ہے اور باہم مربوط بھی۔

جاوید انور (وارانسی' بھارت)

''مشکل مثال''

پروین شیر ایسی منفرد شاعرہ و مصورہ ہیں جن کی مثال ادبی دنیا میں ملنی مشکل ہے، کیونکہ جہاں وہ ایک اچھی شاعر ہیں وہیں بہت اچھی مصورہ بھی ہیں، ساتھ ہی وہ ایک باکمال موسیقار بھی ہیں، بیک وقت اتنی صفات کا پایا جانا ناممکن نہیں تو تقریباً ناممکن سا ضرور ہے، ان کے سینے میں ایک دلِ دردمند ہے جو انسانوں پر ہونے والے مظالم کو دیکھ کر تڑپتا ہے چاہے وہ ظلم ان کے وطن اصلی میں ہو رہا ہو، یا وطنِ ثانی یا کسی دیگر ملک میں تمام انسانیت کے لئے ان کا دل تڑپتا ہے، چاہے ان مظالم کے شکار بچے ہوں، جوان ہوں یا بوڑھے۔ ان کے دلِ دردمند کو ان کی شاعری و مصوری دونوں میں دیکھا جا سکتا ہے، وہ صرف زبانی مظلوم طبقہ و مظلوم افراد سے ہمدردی نہیں رکھتیں بلکہ عملی میدان میں بھی ان کا یہی طرزِ عمل ہے ان کے قول و عمل میں مطابقت ہے، جس کی گواہی ہر وہ شخص دے گا جو ان سے آشنا ہے جس نے ان کی عملی زندگی کو دیکھا ہے، یہ محض اللہ کا کرم ہے وہ جسے چاہے نواز دے۔

محمد متین ندوی (سرونج' بھارت)

''فنکارانہ بصیرت''

''کرچیاں'' (Fragments) کی خالق پروین شیر کی اب مثالوں میں ایک نام ہے۔ انھوں نے شاعری کے ساتھ مصوری اور موسیقی کو بھی اپنے فنی اظہار کے وسائل کے طور پر اپنایا ہے۔ ''کرچیاں'' پروین کی شاعری اور مصوری کا ایک منفرد اور باوقار مجموعہ ہے جس میں غزلیں اور نظمیں مع انگریزی تراجم شامل ہیں اور شعری تخلیقات کے بہت سے موضوعات خیالات او رجذبات کو مصوری کے خاکوں سے بھی اجاگر کیا گیا ہے۔ پروین لفظوں کے ساتھ چونکہ رنگوں کو برتنے کا ہنر بھی جانتی ہیں اس لئے ''کرچیاں'' میں ان کی شاعری کا مطالعہ اور تصویروں کا مشاہدہ واضح کرتا ہے کہ وہ لفظوں میں رنگوں اور رنگوں میں لفظوں کو شامل کر سکتی ہیں، دوسرے لفظوں میں وہ نظم کو تصویر اور تصویر کو نظم بنا سکتی ہیں اور اپنے فنی اظہار میں انھوں نے اس کا مظاہرہ کیا بھی ہے۔ لفظوں اور رنگوں کا یہ امتزاج پروین کے اظہار میں رسمی شعری پیکروں کی تخلیق کے مقصد سے نہیں بلکہ اسے ان کی ذاتی فنکارانہ بصیرت کا غماز سمجھنا چاہیے۔ ان کا شعری ذخیرۂ الفاظ نرم، سبک اور سرد ہونے کے ساتھ ساتھ رواں دواں' مستحکم اور جذبات کی حدت سے تپتا ہوا بھی ہے۔ ان کی تصویروں کے رنگ آنکھوں میں چبھتے نہیں مگر دیکھنے والے کی نظروں کو مسحور کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

سلیم شہزاد (دہلی' بھارت)

''خیرالوریٰ ؐ کا آستاں''

نعت

(زندگی دی ہے حصارِ فکرِ احمدؐ نے مجھے)

امین راحت چغتائی

(راولپنڈی)

خود درودِ مصطفیٰ ؐ اظہار ہے تاثیر کا
ایک لمحے میں بدل جاتا ہے رخ تقدیر کا

ذکر کے لمحوں میں یوں ہوتے رہے لطف و کرم
دل مرا مسکن بنا ہے اُن کی ہر تنویر کا

سامنے ہے سیّد وخیرالوریٰ ؐ کا آستاں
کوئی دیکھے تو سہی بننا مری تقدیر کا

زندگی دی ہے حصارِ فکرِ احمدؐ نے مجھے
خیر کی جانب ہوا ہے رُخ مری تقدیر کا

دامنِ دل، شوق کی کلیاں، شہہؐ والا کا در
کوئی اندازہ کرے سوغات کی تقدیر کا

بعثتِ توقیرِ عالم کی شہادت یہ بھی ہے
ٹوٹنا اور ٹوٹ کر گرنا ہر اِک زنجیر کا

مَیں غلامانِ محمدؐ میں لکھا جانے لگا
بن گیا نقشہ نیا راحت مری تقدیر کا

○

سلام

خورشید انور رضوی

(اسلام آباد)

سلام اُس پر جسے اُمت نے اپنے خوں میں نہلایا
سلام اُس پر کہ جس کو ریت کے ذروں نے دفنایا

سلام اُس باوفا پر جس نے اپنے شانے کٹوائے
سلام اُن کی وفا پر جن کے دشمن نے بھی گن گائے

سلام اُن پر کہ جن کی بے کسی ہم کو رلاتی ہے
سلام اُن پر کہ جن کی پیاس ہم کو یاد آتی ہے

سلام اُس بے ردا بے آسرا لاچار بی بی پر
سلام اُجڑے ہوؤں کی قافلہ سالار بی بی پر

سلام اُن پر بے سہارا بے وطن غربت نصیبوں پر
سلام اُن پر کہ رویا آسماں بھی جن غریبوں پر

○

''مکافات''

شہناز خانم عابدی
(کینیڈا)

یوں بھی نہر جلال دینو چوڑی بھی عام نہروں سے بڑھ کر تھی اور گہری بھی بہت تھی۔ اس کا بہاؤ بھی بہت تیز تھا۔ بہتی کیا تھی۔ بے لگام گھوڑی کی طرح اپنے دونوں کناروں سے مستی کرتی اور کٹاؤ ڈالتی، اچھلتی کودتی آگے بڑھتی رہتی اور اس وقت تک قرار نہیں کرتی جب تک سندھو دریا اسے اپنے آغوش میں لے کر بحیرہ عرب میں گُم نہیں ہو جاتا۔

اگر آپ کو یاد نہ ہو یا آپ نہیں جانتے ہوں تو میں بتا دوں کہ اس نہر کا نام پہلے اللہ دینو کینال تھا۔ جس کو خلق نے بدل کر جلال دینو کر دیا تھا۔ اب آپ سوال کریں گے کہ جلال دینو یا جلال دینا کون تھا تو اس کا جواب یہ ہے کہ جلال دینا ولد کمال دینا، ساکن دیہہ ٹنڈو مستی، گوٹھ مستان شاہ، ضلع بدین، صوبہ سندھ، سٹی مجسٹریٹ، عدالت سیشن، ہائی کورٹ سندھ، اپیلیٹ ٹریبونل اور عدا لتِ عالیہ پاکستان کے ریکارڈ کے مطابق قتل عمد کا مجرم تھا جس نے باہوش وحواس بہیمانہ انداز میں جرائم کا ارتکاب کیا اور قتل کئے اور سولی پر لٹکایا گیا۔

اس سے پہلے کہ آپ بیان کردہ صورت حال کو نا قابل قبول پا کر سوالات کا ایک سلسلہ شروع کریں ممکنہ اختصار سے اپنی دستیاب معلومات پیش کرنے کی کوشش کرتی ہوں تا کہ آپ سوالات سے اور میں جوابات سے امان پا سکوں۔

جلال دینو ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں ہیڈ پیون تھا۔ دفتر کے باہر بنچ یا کرسی پر وہ نیلی شیروانی یا واسکوٹ پہنے اور سر پر طرّہ لگائے بیٹھا کرتا تھا۔ ایک دو کو چھوڑ کر ڈپٹی کمشنر کے دفتر حاضری دینے والا سب سے پہلے اس کو سلام کرتا۔ دیہاتی لوگ تو اس کے آگے اپنا سر بھی جھکا دیا کرتے۔ اس کی شخصیت بھی خاصی شاندار تھی۔ دراز قد، چوڑا سینہ، گول اور مضبوط شانے، گندمی رنگ، اونچا ماتھا، بڑی بڑی روشن آنکھیں، کالی مونچھوں کے زیرِ سایہ موٹے موٹے ہونٹ، مضبوط جبڑا، اور سخت ٹھوڑی پر خشخشی ڈاڑھی۔ وہ لوگوں کی بھیڑ میں بھی سب سے الگ، سب سے نمایاں نظر آتا۔ اس کی آنکھوں کے آگے کسی کی آنکھیں ٹھہر نہیں سکتی تھیں۔ ان آنکھوں نے اس کو معمولی سے غیر معمولی بنا رکھا تھا۔ تھا تو وہ معاشرے کا اور اس دفتر کا کمتر فرد لیکن تھا کچھ ضرور۔ یوں بھی اس میں کچھ تھا۔ جب کوئی اسکے ہاتھ میں کاغذ کا کوئی نوٹ تھماتا تو وہ بغیر کسی اظہارِ تشکر لے لیتا۔ اگر وہ ان روایتوں اور رواجوں کا پلانہ ہوتا تو شاید لینے سے بھی انکار کر دیتا۔ اس کی زندگی بغیر کسی قابلِ ذکر واقعے کے گزرتی جا رہی تھی۔ اور اس کو چالیس کے پیٹے میں پہنچا چکی تھی۔ اسکی گھریلو زندگی بھی پرسکون تھی۔ وہ ڈپٹی کمشنر کے بنگلے میں آؤٹ ہاؤز میں قیام پذیر تھا اپنی بوڑھی ماں اور جوان بیوی کے ساتھ اس کے اپنی کوئی اولاد نہ تھی۔ کوارٹر میں ڈپٹی کمشنر کی ذاتی گاڑی کے ڈرائیور کی بیٹی حانیہ اس کے ساتھ کھیلتی کودتی رہتی تھی۔ وہ اپنے گھر کے علاوہ جلال دینو کے گھر کی بھی رونق تھی۔ یہ سب تو ٹھیک تھا لیکن آس پاس کے معاملات خاص طور پر گاؤں اور دیہاتوں کے پرسکون نہیں تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارا ماحول تیزی سے بدلا۔ آدمیوں کے باہر بھی اور اندر بھی۔ جلال دینو کی روشن آنکھیں ایسا کچھ دیکھنے لگیں، اس کے کان ایسا کچھ سننے لگے جس کا وہ عادی نہ تھا۔ وہ ایک چھوٹا آدمی جو بڑے، بہت بڑے آدمیوں میں گھرا کھڑا تھا۔ اس کا اندر کا آدمی اپنے باہر کے آدمی کو نکلتے ہوئے قد کے باوجود بونا تے ہوئے محسوس کر رہا تھا اس نے مسجد میں ادائیگی سجدے کے دوران خالقِ کائنات کے روبرو ماتھا ٹیکنے اور ناک رگڑنے کے ساتھ مدد کی درخواست کی تھی۔ ادائیگی نماز کے بعد تو اس پر رقت طاری ہو گئی اور وہ چیخ چیخ کر رونے اور مدد مانگنے لگا۔ اس نے شہر کے سب سے بڑے رئیس، تاجر، صنعت کار اور مِل مالک سیٹھ حشمت کو ڈپٹی کمشنر سے باتیں کرتے سنا اور جو کچھ اس کے کانوں نے اس تک پہنچایا اس سے وہ ایک دوسرا ہی آدمی بن گیا۔ اس کے اندر کا چھوٹا آدمی ایک دم بڑا اور اہم ہو گیا۔ اس چھوٹے آدمی نے اس علاقے کے سب سے بڑے آدمی سے پہلی مرتبہ مقابل ہو کر بات کی۔ اس کی بڑی بڑی روشن آنکھوں میں بہ یک وقت دل کی گہرائیوں سے نکلتی ہوئی التجا بھی تھی اور شعلہ بار دھمکی بھی۔

''اس علاقے میں تیرا اپنا کون ہے۔؟'' سیٹھ حشمت نے جلال دینو کو اس کی اوقات کے اندر لانے والے لہجے سے مخاطب کیا۔

''میرے تو سب اِدھر ہی ہیں۔ کوئی بندہ میرا اُدھر نہیں ہے جلال دینو کچھ مسکینی'' اور کچھ گستاخی کے انداز کو برقرار رکھتے ہوئے بولا۔

'پھر تو بک بک بند کر اور اپنی اوقات میں رہ۔ کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے یہ ڈپٹی کمشنر صاحب ہم سے بہتر جانتے ہیں۔'' سیٹھ حشمت نے بات کا سلسلہ ختم کرنے کے انداز میں کہا۔ اور ساتھ ہی چوکیدار زرک خان کو آواز دی کہ جلال دینو کو لے جائے۔

''یہ آپ لوگ بہت غلط کر رہے ہو جی۔۔۔ نا انصافی کر رہے ہو جی۔۔۔ قہرِ الٰہی سے ڈرو جی۔۔۔ قہرِ الٰہی سے ڈرو۔۔۔'' انتہائی مجبوری کے عالم میں ہاتھ ملتا ہوا کوٹھی سے باہر نکل آیا۔ وہ جلدی میں تھا اس نے پڑوس کی کوٹھی کے چوکیدار سے سائیکل مستعار لی اور تیزی سے پیڈل مارتا ہوا ڈپٹی کمشنر کے بنگلے پر پہنچا۔ سائیکل پٹخ کر ڈی سی صاحب کی بیرونی بیٹھک سے گزر کر صدر بیٹھک میں بغیر اجازت گھس پڑا۔ ڈی سی صاحب ایک گوشے میں رکھی ہوئی میز کرسی پر کچھ کاغذات کا مطالعہ کر رہے تھے۔ جلال دینو صاحب کے قدموں میں گر کر گڑگڑانے لگا۔ اپنے قدموں پر گرے ہوئے جلال دینو کے سر کو ٹھوکر سے بچاتے

ہوئے ڈی سی صاحب فورطور پر کھڑے ہوئے ،کاغذات اپنے ہاتھوں میں سمیٹ کر،کوٹھی کے اندر کے حصّے میں جاتے ہوئے ڈانٹنے کے انداز میں کہا۔'' اللہ دینا تو پاگل ہو گیا ہے۔۔۔جو ہونا ہے ہو چکا۔۔اب کچھ نہیں ہوسکتا۔۔۔'' اللہ دینا کچھ دیر اسی طرح پڑا رہا اور پھر باہر چلا گیا۔اس کا نکلتا ہوا قد کچھ اور نکل گیا تھا۔گردن اکڑ گئی تھی۔سر اوپر اٹھ آیا تھا۔اس کی بڑی بڑی آنکھوں سے آگ کی لپٹیں نکل رہی تھیں۔

اس کے فوراً بعد قیامت سے پہلے ایک اور قیامتِ صغرٰی آ کھڑی ہوئی صنعتی علاقے اور خاص طور پر سیٹھ حشمت کی ملوں اور فیکٹری کو بچانے کی خاطر، پاکستان کی معیشت کو ترجیح دیتے ہوئے اللہ دینو کینال پر چھوٹے نواب کے نام پر تعمیر شدہ قدیمی بند علی مراد توڑا جا چکا تھا پلک جھپکتے میں شہر، بڑے گاؤں ، بے شمار نام والے اور بے نام دیہات زیرِ آب آ چکے تھے۔خلقِ خدا، آدمی، مویشی، کھیت، کھلیان، کچے کوٹھے پکے کوٹھے سب غرق ہو گئے۔ملک کے غریب عوام سے ایک مرتبہ پھر جان و مال کا جبری نذرانہ وصول کیا جا چکا تھا۔سب کچھ روایات، ریتی رِواج، اور معمول کے مطابق انجام پا چکا تھا۔ماسوا ایک معمول کے خلاف واقعے کے، جلال دینو نے پولس چوکی میں اپنی گرفتاری پیش کر دی تھی ۔۔۔تھانہ منشی پولس تھانہ (غربی) ضلع بدین اکبر علی لاکھانی نے ملزم کا اقبالی بیان قلم بند کیا تھا جس کے مطابق اللہ دینا نے باہوش وحواس ڈپٹی کمشنر بدین (غربی) جناب کفایت اللہ ولد عنایت اللہ اور سیٹھ رئیس حشمت اللہ ولد رحمت اللہ کا خون کر دیا۔ملزم افسرِ مذکورہ بالا اور سیٹھ رئیس مندرجہ بالا کو ثانی الذکر کی جائیداد، فیکٹری، اور ملوں کو بچانے کے لئے بند کا انہدام کر کے لاتعداد بندگانِ خدا، اور مویشیوں کی موت اور عوام کے گھروں، کھیت کھلیان کی بربادی کا ذمّے دار گردانتا ہے۔ اس کو اپنے اس اقدام اور قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے پر کوئی پچھتاوا نہیں۔

جس دن مجرم جلال دینا کو سولی پر لٹکایا گیا تو جیل کے اندر سولی گھاٹ پر، سٹی مجسٹریٹ، ڈاکٹر، جیلدار اور پولس کے چند سپاہیوں اور جلاّد کے علاوہ کسی اور کو آنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔لیکن پھانسی گھاٹ کے باہر علاقے کے عوام ہزاروں کی تعداد میں جمع تھے۔پولس کی بہت بڑی نفری کے علاوہ بندوق بردار نیم فوجی دستے بھی کسی ناگہانی کی روک تھام کے لئے موجود تھے۔

جلال دینو نے اپنے ملنے والوں کو پہلے ہی اپنے لائحہ عمل سے آگاہ کر دیا تھا۔اور اس نے وہ ہی کیا۔۔۔۔جب اس کو پھانسی گھاٹ لایا گیا تو جیل کی بکتر بند گاڑی سے اترتے ہی اس نے تین بار نعرہ لگایا ''اللہ اکبر''۔

پھانسی گھاٹ کے درمیان پہنچ کر اس نے تین مرتبہ نعرہ لگایا۔۔۔'' پاکستان زندہ باد۔'' اور جب اس کو سیاہ نقاب پہنانے لگے تو اس نے جلاّدوں کے ہاتھ روک دیئے اور بلند آواز میں تین مرتبہ کلمہ پڑھا۔۔۔اور پھر کچھ دیر بعد اس کے تنِ بے جان کو نیچے اتار لیا گیا۔پھانسی گھاٹ کے اندر سب کی آنکھیں نم تھیں اور باہر ایک ہجومِ اشکبار تھا۔۔۔جو نعرے لگا رہا تھا۔

○

اپنے دل میں ہی پہلے مجھے ڈھونڈنا، پھر کہیں پوچھنا مجھ سے میرا پتا
دیکھنا، کوئی منظر نہ ہو خواب سا، پھر کہیں پوچھنا مجھ سے میرا پتا

یاد آ جائے جب کوئی بھولا ہوا، پھر کہیں پوچھنا مجھ سے میرا پتا

چاند کھو جائے، سورج نہ آئے نظر، ہاتھ آئے نہ شب ہی، نہ چمکے سحر
فرق ہی ختم ہو جائے دن رات کا، پھر کہیں پوچھنا مجھ سے میرا پتا

جب بہار و خزاں ساتھ رہنے لگیں، خار و گُل جب گل مل کے ہنسنے لگیں
زرد پتّے اڑانے لگے جب صبا، پھر کہیں پوچھنا مجھ سے میرا پتا

ہنستے ہنستے جنوں میں بگڑ جاؤں میں، آپ ہی آپ خود سے بچھڑ جاؤں میں
راستے میں نہ ہو کوئی میرے سوا، پھر کہیں پوچھنا مجھ سے میرا پتا

کوئی جادہ نہ منزل، نہ ہو ہم سفر، چلتے چلتے پہنچ جاؤں اس راہ پر
واپسی کا ہے نہ کوئی رستہ، پھر کہیں پوچھنا مجھ سے میرا پتا

عقل بھی جب مرا رستہ چھوڑ دے، ہوش بھی آ کے منزل پہ دم توڑ دے
جب رہے نہ مجھے یاد ہی کچھ ذرا، پھر کہیں پوچھنا مجھ سے میرا پتا

مجھ سو پہچاننے جب لگے زندگی، مجھ کو اپنا سمجھے ہر کوئی
مجھ کو دشمن بھی دینے لگے جب دعا، پھر کہیں پوچھنا مجھ سے میرا پتا

کیا بتاؤں گماں کیا ہے کیا ہے یقیں، میں خیال آپ خود سے بھی واقف نہیں
ہاں کبھی خود سے ہو جاؤں آشنا، پھر کہیں پوچھنا مجھ سے میرا پتا

پروفیسر خیال آفاقی
(کراچی)

قوسِ قزح نے اپنا خزانہ لٹا دیا

رخشندہ روحی

(دہلی، بھارت)

ماں بننے کے طویل انتظار نے میری چندا کے جسم کو کھوکھلا کرنے کے ساتھ میری الماری کے لاکر کو بھی گھن لگا دیا۔۔ڈاکٹروں کے کلینک میں فنائیل کی بُو میں ڈوبی انتظار میں اونگھتی لمبی قطاروں اور لمبے لمبے بلوں کی ادائیگی کرتے صبر وتحمل کا دامن پھسلنے لگا۔ ہر طرف سے مایوسی نے مجھے اور میری چندا کو اس دوراہے پر لا کھڑا کیا جہاں عقل غلط اور صحیح کے فرق کو بھول جاتی ہے ۔میں سب کچھ بھولنے لگا سوائے چندا کی خوشی کے۔۔

آٹھ سال پہلے امی سے جھگڑا کر بیٹھا تھا۔امی نے لاکھ سمجھایا کہ نہ ذات نہ برادری نہ اسٹیٹس نہ اسٹینڈرڈ۔۔باپ پرائیویٹ فرم میں کلرک۔ماں گھر میں بوتیک کے نام پر سلائی کرتی ہے ۔بھائی ذہنی طور پر معذور۔ایک ناہموار تکونے صحن میں چھوٹی سی کوٹھری! صرف لڑکی کی خوبصورتی کافی نہیں۔ مگر میں اپنی یکلخت محبت کو حاصل کرنے میں امی کے ارمانوں کی لاش پر سے گزر گیا۔۔وہ اپنے حسن کی جیت پر نازاں۔۔میری گولڈن رینج روور میں میرے پہلو میں بیٹھ کر اپنی سیلن بھری کچی پکی صحنچی سے نکل کر میرے سرخ پتھر کے بنگلے میں سج گئی۔۔

''چندا'' وہ حیران ہوکر سرخ تازہ گلاب کی لڑیوں میں سے جھانک کر چاروں طرف نظریں گھما لر بولی تھی ''یہاں تو کوئی نہیں''۔میں نے ا سے سمیٹ لیا تھا اپنے دل کے اندر۔۔تب سمجھی تھی کہ وہی تو ہے میری چندا۔

ہنی مون ٹرپ پر سوئیز رلینڈ میں بیچ پر ذرا نہ شرمائی تھی۔اپنی لمبی آستین والا کرتا اور بڑے پائینچوں کی شلوار کو تہہ کر کے کندھے پر ڈال لیا تھا ۔۔اور صرف دو بے حد چھوٹے کپڑوں میں میرے ساتھ اسٹیمر پر بیٹھ گئی تھی۔میں طلسم ہوشربا کے کسی منظر کی طرح گنگ ہوکر اسکے بدن کے خطوط کی ڈھلان میں بھٹک رہا تھا کہ ہماری اسٹیمر کے برابر سے گزرنے والی اسٹیمر سے ایک چلبلے نوجوان نے چندا پر ڈھیر سا پانی اچھال دیا۔نہ وہ ڈری نہ سہمی نہ برہم ہوئی۔زور سے کھلکھلائی۔۔اسکے گیلے چھوٹے کپڑے بھیگ کر اسکے بدن سے اور زیادہ چپک گئے۔میرے اندر کچھ زور سے اُچھلا شاید۔۔دل۔اسنے بالکل انگریزی انداز میں اپنے سرخ سرخ ہونٹ سیٹی بجانے کے انداز میں گول کر کے پچ کی صدا نکالتے ہوئے ایک نم بوسہ اچھال دیا۔میرے اندر کہیں بادل گرجا اور بجلی گری۔نوجوان نے فلائینگ کس کو کیچ کر لیا۔۔

بے پایاں حسن کے ساتھ ذہین بھی خوب ہے جبھی تو میرے دوستوں کی بیویوں کی سنگت میں کسی مہارانی سے کم نہیں لگتی۔اردو میڈیم سے انگلش میڈیم کا مشکل سفر اسنے چند ماہ میں طے کر لیا۔لب ولہجہ بالکل برٹش ہوگیا ۔میری اس خوش قسمتی پہ میرے سارے دوست آنکھوں کے گوشوں میں حسرت کی چنگاریاں چھپائے اپنی بڑے گھرانوں کی معمولی خدوخال کی بیویوں سے نالاں سے رہتے۔

۔۔وقت گزرنے کے ساتھ میں چندا کے دیومالائی وجود کا عادی بن گیا۔دن بھر اپنے دفتر میں بھی اسی مدھ بھری بوتل کے فراق میں مست رہتا۔۔لیکن۔۔۔وہ ہنستی مسکراتی جی بھر کے سیر سپاٹے کرتی۔۔میرے جیسے ندیدے بچے کی ہر ناجائز ضد پوری کرتی۔۔گو کہ مجھے اسکی آنکھوں کی ایک ایک ادا کے لئے مرمر جانا پڑتا۔۔مگر وہ ٹوٹتی نہ بکھرتی۔۔ایک ادائے دلبری ایک احساس خودسپردگی کو پانے کے لئے میں ہر طرح کی آزمائش سے گزرتا رہا۔۔دنیا کی ہر شے چندا کے قدموں میں ڈھیر کر کے بھی۔۔میں اس حسن کی دیوی کی مسکراتی آنکھوں میں ایک خالی نقطہ اپنی طرف گھورتا پاتا۔۔اسکے چمیلی کے پھولوں سے گندھے جسم سے کوئی مہک نہ اٹھتی۔۔

ایک دن اسنے اپنی آرزو کی تکمیل کے دروازہ پر ہلکی سی دستک دی۔''ایک ننھا منا تمہاری طرح''۔۔پہلی بار اسنے میری آنکھوں میں جھانکا۔۔میں اسکی پلکوں کی نمناک جنبش پر مرمٹا۔میں کیا کروں۔سب ٹھیک تو ہے۔اللہ کی رضا میں میری کیا بساط! وہ گالوں کے ننھے منے گڑھوں کو نچا کر بولی''شاہ جی کے دربار میں سب کی جھولی بھر جاتی ہے۔''اسنے مزید میرے یقین کو پکا کیا کہ شاہ جی کی دعاؤں اور فلیتوں کا ثمرہ اسکی چچازاد بہن کے آنگن میں دو سال کا ہے۔آج مجھے لگا اتنی چھوٹی سی بات کے بدلے مجھے میری چندا پوری کی پوری مل جائے گی۔۔تو میں آسمان سے چاند تارے توڑ کر اسکے پلو میں باندھ دونگا۔۔میں نے اس سے عشق کیا ہے لیکن اسنے میرے عشق کی لاج رکھی ہے۔چندا کی بڑی بڑی کالی آنکھوں میں ڈوبتی امید نے اور شہابی رخساروں کے گول گول ننھے منے گڑھوں کے بے پناہ اسرار نے مجھ خدا کے کٹر بندے کو بابا بھلن شاہ رحمانی عرف شاہ جی کے آستانے کی چوکھٹ پر سر جھکانے کے لئے منا لیا۔

آج صبح اندھیرے ہی میں اور چندا شاہ جی کے در پر حاضری دینے چل پڑے۔

گاڑی آگے نہیں جاسکتی تھی۔مانک پور کی کچی پگڈنڈی پر ہمیں پیدل چلنا تھا۔چندا نے چپل اتار کر پولی بیگ میں ڈال لئے، میں چپل سمیت چل پڑا۔

چندا دعائیں اور تمنائیں دل کی درازوں میں سمیٹ کر میرے قدم سے قدم ملا رہی تھی۔میں اسکے رخساروں کے مرجھاتے گلاب کھلنے کی آس لئے

''چہارسُو''

آستانہ شاہ جی کی طرف تیزی سے بڑھنے لگا۔شام گھر کر اندھیرے کی چادر میں چھپ گئی۔امرود کے پیڑوں کا سلسلہ اگتے چاند کی نوعمر چاندنی کو اپنے پتوں سے ڈھانپ رہا تھا۔سوکھے پتے چندا کے نرم تلوؤں کی زد میں آکر چرمرا کر آخری سانس لے رہے تھے۔۔

سامنے حویلی کے بلند دروازے پر بنی رنگین محرابوں میں مٹی کے چھوٹے دیئے جھلملائے۔چندا کا چہرہ امید کی تمازت سے چمکا۔اسکے چہرے کی توانائی میرے اعصاب کو قوت دینے لگی۔اور آگے بڑھنے پر سفید لکڑی کا منقش بلند پھاٹک بند تھا۔پھاٹک پر مہارت سے چوکور خانے بنائے گئے تھے اور ہر خانے میں ایک سیاہ نوکیلی ٹوپی والی کیل ٹھونکی گئی تھی جو ایک دھاردار نیزے کی انی کی طرح چاندنی میں چمک کر بدن میں جھرجھری پیدا کر رہی تھی۔انار کے دو گھنے پیڑ پھاٹک کے دونوں طرف پہرہ دے رہے تھے۔پیلے اور سرخ انار انکی شاخوں سے جھول رہے تھے۔سناٹے میں ایک میٹھی مہک گھل رہی تھی۔

میری ہاتھ گھڑی میں چھوٹی بڑی دونوں سوئیاں ایک ہو گئیں۔۔ دادی اماں کی کہانیوں میں یہ رات کے بارہ بجے سوئیوں کا ملن۔۔

انار کی مہک سے مدہوش چڑیلیں انار کے درختوں پر چڑھ کر ناچتی ہیں اور اسی رقص کی بے خودی میں سرخ اناروں میں اپنے لمبے دانت گڑا کر اسکا میٹھا رس پی جاتی ہیں۔میرے لاشعور میں گھنگھروؤں کی جھنک ابھری۔انار کے درخت کے تنے پر چڑیل کا سایہ لہرایا۔سفید بے رنگ چہرہ،خون آشام آنکھیں ،کالے ہونٹوں کے کناروں سے ٹپکتا انار کا سرخ رس،پیروں میں لوٹتے سن سفید بال جو ہوا کے جھونکوں سے اڑ کر اسکے چہرے پر گر رہے تھے۔اسکے الٹے پنجوں کے طویل ناخون زمین میں گڑے تھے۔اسکے ہاتھ کی انگلیاں پکے سرخ انار کو توڑنے کے لئے سب سے اونچی ٹہنی پر اٹھنے لگیں۔۔چڑیل نے لمبی زبان نکال کر کالے ہونٹوں کو چاٹا۔۔اسکے منہ میں رال بھر گئی۔۔چڑیل اڑ کر انار کے درخت پر سب سے اونچی شاخ پر جا بیٹھی۔۔

''چپل ہاتھ میں۔۔'' چندا نے مجھے ٹہوکا دیا۔

ہم پھاٹک کے سامنے رک چکے تھے۔میں نے چپل اتار کر ہاتھ میں لے لئے۔پھاٹک کے دائیں بائیں تین فٹ اونچی سنگ مرمر کی چوکیوں پر دو دربان ہاتھ میں موٹی لاٹھیاں جن پر کڑوا تیل ملا گیا تھا لئے مستعد تھے۔

چندا نے اپنا دوپٹہ اپنے چاند سے زیادہ گول اور تابناک چہرے کے گرد لپیٹ لیا۔آج اسکا مکھڑا خوب روشنی دے رہا تھا۔چندا نے احتراماً کندھوں پر پڑی کالی چادر کا کونا سر پر ڈھانپ لیا۔۔کالی بدلی کی اوٹ میں چاند!

دربان ہمیں دیکھ کر اپنی لاٹھیوں پر گرفت مضبوط کرنے لگے۔چندا میرے پیچھے ہو گئی۔میں نے آگے بڑھ کر اشارے سے سلام کیا،تو انکے چہرے اور لاٹھیوں کے تناؤ میں قدرے لچک پیدا ہوئی۔میں نے چندا کے آنے کا مدعا بیان کیا اور شاہ جی کی قدم بوسی کی اجازت طلب کی۔انکی عقاب کی مانند تند نظروں نے مجھے اور میری اوٹ میں چھپی چندا کو کھنگالا۔۔ہمارے ہاتھ خالی تھے۔دربان نے اپنی لاٹھی پھاٹک کے درمیان بنے ایک چوکور خانے پر بجائی۔پھاٹک کے چوکور خانے میں سے ایک دروازہ نمودار ہوا۔۔اسمیں سے ایک خفیف سی داڑھی اور سرمہ لگی بھوری آنکھوں والا نوعمر دبلا پتلا لڑکا وارد ہوا۔اسنے ہم دونوں کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ہم اس کھڑکی میں بمشکل تمام کڑمڑا کر پار ہوئے۔لمبی راہداری سے گزر کر ایک کال کوٹھری کے سامنے وہ رک گیا اور ہم بھی۔غالباً ایک عورت چندا کی تلاشی لینے کو آگے آئی۔اور جھاڑا لے کر اس نے اشارے سے لڑکے کو میری تلاشی کی اجازت دی۔جھاڑ جھٹک کے بعد عود کی دھونی سے ہمیں جراثیم کش کیا گیا۔کوٹھری کا دروازہ چرچرا کر باریک سا کھلا۔

لیڈی دربان نے چندا کا پہلے داہنا پیر اندر رکھوایا پھر بایاں۔مجھے سرمہ لگی شربتی آنکھوں والے نوجوان نے چندا کی تقلید کرنے کے لئے کوٹھری کی گہری کھائی کے اندر دھکیل دیا۔میں لڑکھڑایا اور لکھوری اینٹوں کی دیوار کی ٹیک لیکر کھڑا ہو گیا۔دھوئیں کے مرغولے میرے پھیپھڑوں میں گھس کر سانس کو گھونٹ رہے تھے۔چندا کتنی باہمت ہے۔وہ دھیمی چال سے کوٹھری کے وسط میں کھڑی ہو چکی تھی۔لکڑی کی اونچی میز پر ایک تانبے کا ناند کے سائیز کا چمکتا چراغ رکھا تھا۔اسمیں پڑی بتی اتنی موٹی تھی جیسے گائے بیل کو باندھنے کا بل دار رسہ۔چھت اور سرخ لکھوری اینٹیں دھوئیں کی کالک سے اٹی تھیں۔سامنے زمین سے پانچ فٹ اونچا چبوترا۔۔اور اس پر ایک بے حد پرنور سفید وجود ایک کتابچہ کو چہرہ کے سامنے کھولے منہ سے کچھ عربی کے الفاظ کا ورد کر رہے تھے۔اندھیرے میں اس سے زیادہ نظر نہیں دیکھ سکی۔چندا چبوترے کے نیچے شاہ جی کے قدموں کے عین نیچے بیٹھ گئی۔۔میں بھی اسکی اتباع میں اسکے داہنی جانب بیٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔۔کہ ساری کوٹھری دہل گئی۔''وہاں'' شاہ جی نے اپنی انگلی میری پیشانی میں گھونپ دی اور بند آنکھوں سے دھتکارا۔شاہ جی نے کتابچہ اپنے چہرے سے ہٹا لیا۔فرشتے کی شبیہ آنکھوں میں پھر گئی۔براق داڑھی اور کندھوں پر پڑے چھلے دار چمکیلے بال ایک دوسرے میں گھل مل کر نیاگرا فال کی طرح بہہ رہے تھے۔

چندا کی پتلیوں میں میری تصویر ایک نقطے سے بھی کم تر ہو گئی۔میں بیٹھنے کے آدھے راستے میں ہی شل ہو گیا۔

شاہ جی کے عتاب کی بدولت میں چکراتا ہوا چندا کی پشت سے ۲۰ میٹر کی دوری پر ہوا میں معلق ہو گیا۔اچھا ہوا چندا کی پشت تھی۔۔شاہ جی کی انگلی مجھ سے ہٹ کر چندا کی طرف گھوم رہی تھی میرا دل حلق میں اٹک گیا۔اب چندا کو اسی تکلیف دہ مرحلے سے گزرنا ہوگا۔مگر میری چندا۔۔وہ تو جینئیس ہے۔وہ عقیدت سے آنکھیں موندے ایک مورت کی مانند شاہ جی کے قدموں میں ڈھیر ہو چکی تھی۔۔

کوٹھری کی سیاہ چھت سے کڑوے تیل کی دھار ٹپک کر تانبے کے

چراغ میں بھرنے لگی۔شاہ جی کی آنکھوں کے پپوٹوں میں جنبش ہونے لگی۔شاہ جی کے ہونٹوں سے عربی کی آیات کا ورد با آواز ہونے لگا۔چندا کا سر شاہ جی کے قدموں سے اٹھنے لگا۔۔چراغ میں تیل لبالب بھر گیا۔چھت کا شگاف برابر ہوگیا۔۔۔شاہ جی کی آنکھیں پوری کھل گئیں چراغ کی لو سلگ اٹھی۔میں زمین پر دھپ سے گر پڑا۔۔شاہ جی کی آواز خاموش ہوگئی۔چندا پورے ہوش وہواس میں شاہ جی کے قدموں میں دوزانوں بیٹھ گئی۔چراغ کی لو بلند ہوتے ہوتے چھت سے جا لگی۔شاہ جی کی آنکھوں سے خون رنگ بادل اٹھے۔۔چراغ کی بلند وبالا لو کے درمیان ایک چہرہ ابھرا۔۔میں نے اس چہرے کو اچھی طرح نہ دیکھا۔۔کیونکہ میں تقریباً نابینا ہوگیا۔۔شاہ جی نے جنات کے بادشاہ سلامت سے براہ راست گفتگو کی۔میری پوری تاریخ بادشاہ سلامت نے سنا دی۔چندا سے میری شادی اور ایک ایک واقعہ۔۔شاہ جی جب بچے کے ذکر پر پہونچے تو ۔۔بادشاہ سلامت کی پیشی شاہ جی کے استاد کے دربار میں ہوگئی۔۔اور بادشاہ سلامت چراغ کی لو سے روپوش ہوگئے۔شاہ جی کی آنکھیں پہلے کی طرح آہستہ آہستہ مندنے لگیں۔۔چراغ کی لو چھت سے اترنے لگی۔۔میری بینائی تیز ہونے لگی۔کوٹھری کالے دھوئیں کے مرغولوں سے بھر گئی۔میری سانس گھٹنے لگی۔چندا میرے قریب کھسک آئی۔۔وہ بالکل مطمئن اور باہمت تھی۔اسنے میرے ہاتھ کی اکڑی ہوئی انگلیوں کو اپنی ریشمی ہتھیلیوں سے سہلایا اور ہم دونوں کوٹھری سے باہر نکل آئے۔۔

راستے میں چندا شاہ جی کی طلسماتی شخصیت میں کھوئی رہی اور میں اسکے رخساروں کی لوٹتی شعاعوں میں۔مہینے کی چوتھی جمعرات کو ہی شاہ جی حاضرات کرتے تھے۔تیسری جمعرات سے ہی شاہ جی کے پاس جانے کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔انتظار کی گھڑیاں بڑی جانگسل تھیں۔میں نابینا ہوکر ہوا میں معلق ہونے کو بے چین اور چندا شاہ جی کے قدموں کی دھول سے اپنی زندگی کے گلستان میں پھول کھلانے کی آرزومند!

ایک بار پھر۔۔۔انہیں مراحل سے گزر کر ہم شاہ جی کے دربار میں دست بستہ کھڑے ہوگئے۔آج چراغ کی لو میں بادشاہ سلامت کی آواز میرے کانوں میں بھی آرہی تھی گو کہ میں انکی شکل دیکھنے سے معزور تھا۔بادشاہ سلامت نے فرمایا کہ سولہ سال کی عمر میں چندا پیپل کے پیڑ تلے اپنے گھٹنوں تک لمبے بال کھولے دھوپ میں کھڑی تھی کہ اسی وقت ایک جن اور جناتنی ڈائن کا گزر ہوا ۔جن اس دلنشیں منظر کے سحر میں غرق تھا۔جناتنی جن کی اس بے اعتنائی کی تاب نہ لاسکی اور اسنے چندا کی کوک پر ایسا باندھ ڈالا کہ وہ کبھی ماں نہ بن سکے۔اب اس باندھ کو کاٹنے کے لئے طویل علاج اور پرہیز درکار ہے۔اسکے لئے نوعمر سفید بکری کا کلیجہ اور گیدڑ کی آنتیں کالے مرغ کا دل اور گینڈے کی ناک کا سینگ اشد ضروری ہے۔چندا کو اس علاج کے دوران شوہر سے دور رہنا ہوگا۔گوشت مچھلی اور لہسن پیاز کھانے میں شامل نہ ہونگے۔میں بدستور ہوا میں معلق تھا البتہ چندا شاہ جی کے قدموں میں سر جھکائے تھی۔شاہ جی کا خاص خدمتگار سرمہ بھری آنکھوں سے مجھے تمام بات چیت کا ترجمہ کرکے سناتا رہا کیونکہ بادشاہ سلامت عربی میں ہمکلام تھے اور میں اس زبان سے نابلد۔بادشاہ سلامت مکمل تفصیلی ہدایات دیکر چراغ کی لو سے دھواں بن کر کمرے کی چہار دیواری سے باہر نکل گئے۔میں اس بار آہستگی سے فرش پر آگیا اور چندا شاہ جی کی آنکھیں مندتے ہی انکے قدموں سے دور ہونے لگی۔

ایک ہفتہ مطلوبہ اشیاء اکٹھا کرنے میں بیت گیا۔اور چوتھی جمعرات کو ہم دونوں شاہ جی کی قدم بوسی کے لئے حاضر ہوگئے۔چراغ خشک تھا۔شاہ جی کتابچہ کے بغیر ادھ کھلی آنکھوں سے خلاء میں کچھ پڑھ رہے تھے۔میں تمام اشیاء کی پوٹلی دونوں ہاتھوں میں دبائے ننگے پاؤں شاہ جی کے سامنے مؤدب کھڑا تھا۔چندا سر جھکائے میرے ساتھ تھی۔شاہ جی نے پہلی بار میری طرف نظریں گھمائیں۔۔میں ان شعلہ بار نگاہوں کی تاب نہ لا سکا۔میں نے زمین میں آنکھیں گڑا دیں۔

''اللہ تیری مراد برلائے''شاہ جی کی گونجتی آواز دل میں اتر گئی۔

سرمہ بردار نوجوان نے میرے ہاتھ سے پوٹلی لے لی۔میں بدستور اپنی جگہ کھڑا رہا۔چندا شاہ جی کے نزدیک ہوگئی۔شاہ جی نے ہاتھ بڑھایا تو انکے ہاتھ میں کچھ بڑی کیلیں آگئیں۔انہوں نے ان کیلوں پر دم کیا ور ایک ایک کیل بکرے کی خون ٹپکتی کلیجی میں پرودی۔مرغے کے دل میں گینڈے کا سینگ گھونپ دیا۔خون کے قطروں کو چندا کے اوپر چھڑکا اور کلیجی اور دل کو ایک موم جامہ میں تہہ کرکے چندا کے دوپٹہ کے پلو میں باندھ دیا۔شاہ جی کی آنکھیں واپس کتابچے میں پیوست ہوگئیں۔میں اور چندا جانے کے لئے مڑے کہ سرمہ بردار نوجوان نے کہا''اس دوپٹہ کو آدھی رات کو ریلوے لائن والے قدیم قبرستان میں شمال کی جانب ادھ کھلی پرانی قبر میں دفنا دیجئے۔''

ہم لوٹتے وقت یہ زمہ داری پوری کرآئے۔میں تھر تھر کانپتا رہا۔۔ مگر اولاد کی خواہش کی تکمیل نے چندا کی پتلیوں میں قندیلیں جلا دیں۔ان قندیلوں کی لو دیکھنے کے لئے تو میں آٹھ سال ہر لحہ بے چین رہا تھا۔۔

سولہویں جمعرات کو شاہ جی نے چندا کی ریاضت کی لاج رکھ لی۔۔چندا کی جانب انکی نظر اٹھ گئی۔اس عظیم مرتبہ کو چندا نے اپنے دل کے خالی کونے میں بہ احتیاط محفوظ کرلیا۔شاہ جی کے دربار میں صرف حاجت مند کی رسائی ممکن ہے تو میرا روز روز کیا کام!میں نے اشارہ سے چندا سے اجازت طلب کی اور کوٹھری کی اندھی دیواروں اور کالی چھت سے نکل کر طویل راہداری سے آہنی پھاٹک کی طرف چل پڑا۔امرود کے پیڑوں کے سائے چھدرانے لگے۔آسمان کا تنہا چاند میرے تعاقب میں بھاگتا رہا۔۔

میری کاروباری مصروفیات کی زیادتی اور چندا کی بڑھتی عقیدت نے میری زمہ داری ڈرائیور کے کندھوں پر ڈال دی۔ان گنت جمعراتیں آتی

رہیں اور جاتی رہیں۔۔شاہ جی کی پسند ناپسند مجھے یاد ہوگئی۔۔جمعرات کا سارا دن شاہ جی کے پسندیدہ پکوانوں کی خوشبو سے مہک اٹھتا۔۔ چندا کا چہرہ اب چودھویں کا چاند ہوگیا۔لیکن میری سزا اب تک باقی رہی۔۔

شاہ جی کو چندا کے ہاتھ کی پوریاں بہت پسند ہیں۔کچن میں چندا کو گنگناتے اور گرم پوریاں اتارتے دیکھ کر دل بے اختیار چاہا کہ شاہ جی کے دونوں گال بلبلے اٹھتے تیل میں دونوں طرف سے سنہرا ہونے تک تل دوں۔انکی بھوئیں انکی پلکیں اور انکی لال لال ڈوروں والی آنکھیں سب کی سب تل کر اور زیادہ سرخ ہو جائیں گی۔۔اور پھر جلی ہوئی کھال میں انکے سفید سرخ چہرے کا نور پل بھر میں کالا دھواں بن کر کال کوٹھری کی چھت سے چپک جائیگا۔۔میری چندا جلے ہوئے کالے چہرے سے ڈر کر میری کب سے منتظر باہوں میں سما جائے گی اور میرے دل سے اسے کھونے کا خوف۔۔

''سنئے، ذرا پوری میں نمک چکھ لیجئے۔'' چندا نے اپنے گالوں کے ننھے منے گڑھے نچا کر کہا۔

''تم نے کبھی نمک زیادہ نہیں ڈالا''

''پلیز۔۔'' میرے منہ میں اسنے ایک خستہ پوری کا سوندھا ٹکڑا رکھ دیا۔

''آخ تھو۔۔۔کڑوا۔۔زہر''

''سچ؟''

میں واش بیسن میں الٹی کر چکا تھا۔میرے منہ میں شاہ جی کی لمبی براق داڑھی کے چھلے دار بال انکی ادھ جلی پلکیں بھوئیں اور چرمرائی ہوئی کھال آ گئی۔

چندا کی آنکھوں کے جلتے ہوئے بلب بجھنے لگیں ۔۔'' سوری۔۔آج میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔''

وہ گھبرا کر میرے ماتھے پر اپنا ریشمی ہاتھ رکھ کر میری آنکھوں میں ڈری ہوئی سی دیکھنے لگی۔

میں اسکی پیشانی پر تردد کی لکیریں برداشت نہیں کر سکتا۔میں نے پیار سے اسکی پیشانی کے شبنمی موتی اپنے ہونٹوں میں بند کر لئے۔''چندا۔۔جان خدا کے لئے۔'' تیل میں پڑی پوری جل کر دھواں دینے لگی۔۔وہ میری ڈھیلی گرفت سے نکلنے لگی۔۔''اور کتنے دن۔؟'' وہ میرے ہاتھ کو اپنی کمر سے الگ کر کے مسکراتی ہوئی کالی دھواں دھواں پوری کو تیل سے نکالنے لگی۔۔

میرا دل چاہا کہ میں پھوٹ پھوٹ کر روؤں اور اسکی قمیص کے بے داغ دامن سے اپنی ناک پونچھ لوں۔اسے آج بالکل کچن میں جانے نہ دوں۔چندا گنگنا رہی ہے۔۔

''پیا ایسو جیا میں سمائے گیورے کہ میں تن من کی سدھ بدھ گنوا بیٹھی۔۔

ہر آہٹ پہ سمجھوں وہ آہی گیورے۔۔جھٹ گھونگھٹ میں مکھڑا چھپا بیٹھی۔۔۔''

شاہ جی کے لئے چھن سے کباب تیل میں ڈالدیا۔۔میں نے اپنے دل کی حسرت کو تلوؤں سے کچل دیا۔کیاریوں میں کھڑے ہارسنگھار کے سفید پھول سر جھکائے کن انکھیوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔چندا کچن سے نکل کر پلاسٹک کی بڑی باسکٹ میں تازہ کھانے کے ڈبے احتیاط سے جمانے لگی۔۔میں نے واش بیسن پر لگے آئینہ میں چپکے سے دیکھا۔۔چندا کی آنکھوں میں ایک پرسکون جذبہ لہرا رہا تھا۔۔ڈرائیور سامان گاڑی میں رکھنے لگا۔۔

چندا آج شہد کے رنگ کے لینس آنکھوں میں لگا رہی تھی۔۔نظر تو کمزور نہیں ہوگئی میرا دل دھڑکا۔''چندا تمہاری آنکھوں کا رنگ کیسے بدل گیا۔''''دیدوں کا پانی ڈھل گیا۔'' وہ ہنس رہی تھی۔باریک شیشے کے گلاس ٹکرائے اور بکھر گئے۔۔

یاد آیا۔۔۔شاہ جی کی آنکھیں اسی رنگ کی ہیں۔۔!میں بستر پر بیٹھ کر چندا کے وجود کا احساس جمع کرنے لگا۔۔

چندا گھگیاتی، کانپتی میرے پاس دوڑتی آئی۔۔اسکے ہاتھ سے گرم گرم کھانے سے بھرا اٹن باکس فرش پر الٹ گیا۔۔اسکی آنکھیں دہشت سے اور بڑی ہوگئیں۔۔میرے گرد باہیں لپیٹ کر میرے گلے میں جھول گئی۔۔میں نے دلار سے اسکے گالوں کے ننھے منے گڑھوں کو چوم لیا۔۔چندا کے خوف سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے اسکو کس کے بھینچ لیا۔۔ایک عرصہ بعد۔۔اسکے شہد ہونٹوں کو کاٹنے سے بچالیا۔۔''وہ چوہا۔۔'' وہ بمشکل بول سکی۔مجھے ایک صحتمند چوہے کا قاتل بنانے پر مصر ہے وہ۔۔

چندا کو اتنے قریب پا کر میں۔۔اسکو ڈرا ہوا دیکھ نہیں سکا۔میں اسکی آواز کو ساکت کرنا چاہتا تھا کہ۔۔''۔کچن میں مارٹن۔۔'' وہ میرے ہونٹوں پر اپنا تازہ مکھن کی لوئی سا ہاتھ رکھ کر زور سے بولی۔میں نے اسکو کبھی ایک خراش نہ آنے دی تو آج کیسے میں اسکو اپنی خواہش کی تکمیل کا دکھ دے سکتا تھا۔۔میں نے اسکو اپنی تحویل سے آزاد کر دیا۔۔

کچن سے مارٹن اسپرے کا کین اٹھایا۔۔چوہا بیڈ کے نیچے سہما ہوا کونے میں سکڑا سمٹا دبکا ہوا تھا۔۔میں نے اسپرے کی زوردار بوچھار کر دی ۔۔۔چوہا اپنی جگہ اچھلا کودا بیڈ کے کونے سے نکل بھاگا اور میرے قدموں میں تڑپنے لگا۔۔اسکی چمکدار آنکھیں بے نور ہو کر نیم وا ہوگئیں۔سسک سسک کر ہلکے جھٹکوں سے اسکا موٹا تازہ جسم ڈھیر ہوگیا۔۔میرے اندر ایک فتح مند سُرور گھر کر گیا مجھے ایسا یقین ہوگیا کہ یہ تمام کاروائی شاہ جی کے تنومند جسم اور شربتی آنکھوں پر ہو رہی ہے۔میں شاہ جی کے لوٹتے بدن پر مارٹن کا بھرپور وار کر رہا ہوں۔وہ میرے بیڈ کے نیچے دبکے ہوئے پڑے ہیں۔۔انکی سہمی ہوئی پتلیاں اپنا شہد رنگ کھو رہی ہیں وہ مجھ سے زندگی کی بھیک مانگ رہے ہیں اور میں پھانسی دینے

والے جلّاد کی طرح بے رحمی سے انکے سر پر کالا غلاف چڑھا رہا ہوں ۔بغیر انکی آخری خواہش پوچھے۔

مارٹن اسپرے کے زہریلے قطرے انکی سانسوں کو بند کر رہے ہیں ۔۔وہ اکھڑتی سانسوں کے درمیان میرے قدموں سے لپٹ کر مجھ سے رحم کی بھیک مانگ رہے ہیں اور میں اسپرے کا پورا کین انکے سر پر خالی کر کے انکو تڑپ کر ٹھنڈا ہوتے دیکھ رہا ہوں۔۔

میری چندا اب میری ہے۔۔صرف میری۔

''کیا کر رہے ہو۔۔اسپرے ختم ہو چکا ہے۔۔اور چوہا بھی۔'' چندا مجھے بری طرح جھنجھوڑ رہی ہے اور میں تابڑتوڑ اسپرے کے وار شاہ جی کی برّاق داڑھی پر کر رہا ہوں۔انکے لمبے سفید چمکدار چھلّوں دار بالوں پر انکے جسم کے ہر حصے پر۔۔چندا نے میرے ہاتھ سے خالی کین چھین کر ڈسٹ بن میں ڈال دیا۔۔میں تھکا ہارا سوفے پر گر پڑا۔۔میری سانس میری پسلیوں کو کچلنے لگی۔

چندا میرے ماتھے پر اپنی ریشمی انگلیوں کی حرارت سے مجھے تھپتھپا کر سلانے کی کوشش کر رہی ہے۔میرے سر کے بال اسکی باریک انگلیوں کی گرفت میں سرسرانے لگے۔۔وہ بار بار اپنا گول چہرہ میرے بالوں پر رکھنے لگی۔ اور اسنے میری ٹھوڑی پر اپنی گھنی پلکیں کئی بار کھولیں اور کئی بار بند کیں۔۔دن کے وقت آسمان تاروں سے بھر گیا۔۔میرے بیڈروم کی کھڑکی سے جھانکتا ہارسنگھار اپنے تازہ کھلے ہوئے پھولوں کا گجرا بنانے لگا۔۔ وہ حسن کا مجسمہ۔۔شاہکار ۔۔دیوی۔۔ایک دم جاندار عورت کے روپ میں ڈھل گئی۔۔کتنا زندہ ہو گیا ہے اسکا حسن۔۔کتنا طرحدار۔۔کتنا پائیدار!!

چندا کے دمکتے چہرے سے مقدس شعائیں پھوٹیں۔۔اسکی آنکھوں سے خوابوں کی دھنک کے ساتوں رنگ بہنے لگے۔۔اسکے پگھلے موم کے بدن سے گنگنی سنسناہٹ ابھری۔۔اسکی نوکدار پلکوں کی چبھن نے میری سماعت کو تھپتھپایا۔۔''پلیز ۔۔۔میری قسم کھاؤ۔۔اسنے پلکیں اٹھائیں۔۔۔۔پھر گرائیں۔۔اسنے میرا دایاں ہاتھ اٹھا کر اپنے سر پر رکھ لیا۔۔''اپنے چاندی کے ۔۔زرتار۔بال۔'' اسنے کہتے کہتے میرے سر پر اپنے گلاب کی صبح دم کلی سے کھلتے ہونٹ رکھ دئے۔۔میں سونے کے سنگھاسن پر بیٹھا ساری دنیا کا راجہ بن گیا۔۔

''لمبے کرلو۔۔تھوڑے سے اور لمبے۔۔یہاں تک''۔۔۔چندا نے اپنا سر میرے شانے سے ٹکا دیا۔۔''داڑھی رکھ لو۔۔۔۔سفید لمبی داڑھی۔۔'' میرے سنگھاسن کے طلائی پائے پگھل گئے۔۔ہارسنگھار میری کھڑکی سے اپنا سر ہٹانے لگا۔۔اسکے پھولوں کا تازہ گجرہ ادھورا رہ گیا۔۔ میں نے آنکھیں کھول کر چندا کو غور سے دیکھا۔اسکی آواز میں ایک سوز،ایک گرفتگی تھی جو پہلے پیار کی سوغات ہے۔وہی پیار۔جو میں نے چندا سے کیا اور۔۔جو چندا نے مجھ سے کبھی نہ کیا۔۔۔وہ کتنی مقدس کتنی پاکیزہ لگ رہی ہے۔۔اسکے ہونٹ تازہ کلی سے دھیرے دھیرے کھل کر پھول بن رہے ہیں۔۔میری چندا کو۔۔۔۔۔محبت ہو گئی ہے۔سچی ایک دم سچی محبت !!!اسکی نازک انگلیاں میرے سر پر تیرتی رہیں۔میں چندا کو تکتا رہا۔۔

سچی محبت انسان کو حسین بنا دیتی ہے مگر جو چندا کی طرح بے حد حسین ہو اسے ۔۔۔ایک عورت بنا دیتی ہے۔وہ عورت جو اپنے محبوب کی بانہوں میں گرم موم بن کر اسی زاوئے میں ڈھل جاتی ہے جس میں اسکا محبوب چاہتا ہے۔۔ جیسے میں چندا میں گھل مل گیا۔میری شخصیت میری کہاں ہے اب۔

آج اسکے چہرے پر ہزاروں سورج چمک اٹھے !۔کیسا دمکتا ہے اسکا انگ انگ !ہر رواں گواہی دے رہا ہے۔ہاں اسے محبت ہو گئی ہے۔وہ محبت کہ جسکا کوئی وجود' کوئی رنگ' کوئی زائقہ نہیں ۔۔وہ اتنا دقیق' اتنا دیرپا' اتنا پاک 'اتنا سچا جذبہ ہے کہ جسے پا کر انسان امر ہو جاتا ہے۔۔کائنات کے ہر ذرّے میں وہ ایک صورت نمایاں ہے اسے ڈھونڈنا نہیں پڑتا اسے پایا جاتا ہے۔۔تا حد نظر وہی ایک انسان ملتا ہے۔۔چاہے سامنے کوئی بھی ہو۔!!!

آج میری چندا کے جسم کا ہر رواں میرے لمس کے استقبال میں بچھ بچھ جا رہا ہے۔اسکا بدن خوب خوب مہک رہا ہے۔وہ پوری گرم جوشی سے میری بانہوں میں ۔۔۔میری رگ رگ میں سما گئی۔

میں نے عہد کر لیا۔۔مستحکم!!!

اپنے بال کندھوں تک لمبے کر لونگا۔۔

داڑھی کے بال گول چھلّے دار ہونے تک کٹواؤنگا نہیں۔۔

ڈائی کو کبھی ہاتھ نہ لگاؤنگا۔۔

بالکل شاہ جی کی طرح!!!

- بقیہ -

خوبصورت دنیا

مغرب میں لوگ پاکستان کا سفر کرنے سے قدرے ہراساں رہتے ہیں۔میرا بھائی جو اکثر پاکستان جاتا رہتا ہے اُسے اُسی ملک سے بہت محبت ہے۔مگر چاہے پاکستان ہو یا ہندوستان یا کینیڈا ان سبھی ملکوں کے لوگ روشنی کے خواہاں ہیں نہ کہ اندھیروں کے۔

جو لوگ مصیبت زدہ ہیں اُن کے لیے کوئی کچھ سوچتا نہیں ہے۔ اسی لیے ہمیں پروین شیر کا بے حد ممنون ہونا چاہیے کہ انھوں نے ہماری توجہ اُن بدنصیب لوگوں کی طرف مبذول کرائی جو لگاتار دُکھ اور کرب کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔پروین شیر نے اپنے فن کے ذریعے یہ کارنامہ انجام دیا ہے کہ وہ ان دُکھی اور محروم لوگوں کے بارے میں ہمیں ایک با معنی اور اخلاقی ذمہ داری کا احساس دلانے میں بھی پوری طرح کامیاب ہیں۔ اس نکتے میں اُن کے اصل فن اور ہنر کا راز پوشیدہ ہے۔

شہرِ ناپُرساں

روبینہ ناز

(اسلام آباد)

ایک بے چہرہ مدار میں گردش کرتے کرتے اسے یوں محسوس ہوا کہ وہ ایک ایسا سیارہ ہے جس کی معنویت کو بے مقصدیت نے چاٹ لیا تھا۔ نہ کوئی راہ نہ منزل نہ روشنی کا سراغ۔ یہی وہ لمحہ تھا جب اسے اپنی آواز پرائی لگی اور یہ زمین ایک ایسے تھال کی مانند جس کی گونج کسی کی سماعت پر اثر انداز ہوتی تھی۔ ہیولے تھے اور تھکن کا احساس، وہم وگمان اور نا قابلِ فہم تحریریں۔ اب جیسا کیسا؟ اب تو مرنے میں بھی کوئی اذیت تھی نہ نقصان مگر کچھ بھی تو اپنے بس میں نہ تھا۔

خود سے اس کے مکالمے کا آغاز اس دن ہوا جب دریچے سے باہر کی ہوا بھی خاموش تھی۔ سناٹا پیہم بڑھتا جاتا تھا۔ خوف روح کی زبان بن کر بول اٹھا تھا۔ وہ چہرے جو ورد زبان اور خواب جو حرزِ جاں ہو کر بھی دھندلا چکے تھے۔ کہیں اسی سناٹے میں گم ہو گئے۔ چند سالوں کے اندر اسے دہشت اور بے یقینی نے دیمک کی طرح چاٹ لیا تھا۔ اندر باہر چلتا پھرتا۔ بولتا چالتا سناٹا سایہ بن کر لرزنے لگا۔ حد بندیاں جو معاشرے کا دستور اور جنگل کا قانون بن کر زندہ تھیں اس کے لیے بے معنی ہو گئیں۔ اردگرد کے چہرے اس کے لیے کاغذی تھے اور سب بدن شیشے کے تھے۔ جن کے آر پار وہ کیا جھانکتا کہ ہاتھ کر چیوں سے زخمی اور ان کے ٹوٹنے کا خوف لاحق ہوتا تھا۔ چند ثانیے پہلے تک اس کا کیف وسرور ہوا میں گھل کر بادل بن گیا تھا۔ بارش کا سناٹا ٹوٹ رہا تھا۔ اور خیال مدھم ہو کر قوسِ قزح میں ڈھل گیا تھا۔ یہی وہ لمحے تھے جب اس پر اس کے وجود کا منکشف ہونا ثابت ہوا۔ اب ایک تنگ گھاٹی اور اوپر کھلا آسمان تھا جس کے چاروں طرف نیلاہٹ کا غلاف تھا۔ اور اس کی آواز نقشِ موہوم اور اظہار لاچار ہو چکا تھا۔ لفظ موسیقی کی مدھم گنگناہٹ میں ڈھل گئے تھے۔ ایسے ہی لمحوں میں وہ آئی جس کے ایک ہاتھ میں تعبیر کا جام اور دوسرے میں زندگی کی شمع تھی۔

اب وہ خود سے آشنا ہوا۔ اس کا وجود اظہار کی راہ پا چکا تھا۔ ایک ایسی راہ جس میں منزل کے خطوط تراشیدہ ہیرے کی مانند شفاف تھے راستے ڈھل کر ایسی زنجیر بن گئے جس نے دونوں کو ایک پیکر میں باندھا اور سرِ منزل لے چلے۔

منزل کے نشاں واضح مگر خطوط موہوم تھے۔ راستے میں پتھروں کی سختی اور کانٹوں کی چبھن تھی۔ مگر ایک کا ہاتھ دوسرے کے چہرے سے تھکن کی تحریر کو مٹاتا تھا اور انگلیاں زندگی کی عبارت رقم کرتیں۔ ایک شام کو اجالا دیتا اور دوسرا صبح کو امید کی کرنیں عطا کرتا۔ یوں صبح شام ہاتھ میں ہاتھ ڈالے رواں دواں تھے کہ دوپہر کی تیز آنکھوں والی ندی بڑھتی چلی آتی جس سے دونوں روح کی پیاس مٹانے وار راہ کے لیے جل اکٹھا کرتے آگے بڑھتے وقت کے سینے پر قدم رکھتے کسی بوجھ کو روح پر اٹھائے بغیر دونوں بڑھتے ہی چلے گئے اور پھر رات کا پہاڑ آن پہنچا جس میں گلرنگ مہک اور ٹمٹماتے ستارے تھے۔ جگنو رنگ زمزمے اور بہار رنگ آبشاریں تھیں۔ مگر وہیں کہیں اداسی کے مکڑے نے جالا تان رکھا تھا۔ اسی مکڑے نے آہستہ آہستہ اب ان دونوں کی روح میں بسیرا کر لیا۔ کوئی ان کا دشمن نہ تھا۔ مگر وہ خود ہی اپنے نصیب کے رقیب بنے۔ لفظ جب تک درمیان نہ آئے تھے۔ ان کا وجود ہوا کے پر سے لطیف تر تھا۔ مگر لفظ کی چٹانوں سے ٹکرا ٹکرا کر خود ہی اپنے وجود کو گھائل کرتے رہے۔ اب فضا میں سنسناہٹ باقی تھی اور لفظوں کے دائروں سے ساعت پر لاوا بن کر پگھلتی ہوئی آوازوں کا دبا دبا شور جس میں دونوں کی انفرادیت کہیں کھو گئی تھی۔

وہ دن اس کے لیے سکون کا پیغام لے کر آیا تھا جب وہ خواب کی سرنگ سے ہوتا ہوا اس کی جھیل آنکھوں میں جا اترا تھا اور اس کے من میں ہلچل سی مچا دی تھی۔ یہ خواب بھی عجیب دنیا کا نام تھا۔ جہاں ہر تجربہ سمندروں کے ٹھہرے پانیوں کے سفر سے مشابہہ تھا۔ ہولے ہولے ڈولتی لہروں پہ تیرنے کا احساس جہاں اپنے وجود کا تحیل ہونا گہرے خلد کی یاد دلاتا لیکن اب ایک مدہم سی لکیر تھی جس نے اسے دنیا اور اپنے وجود سے جدا کر دیا تھا۔

وہ کنارے پہ بیٹھا خود کو ہی ڈوبتے ابھرتے دیکھا کرتا نہ بچنے پہ قدرت تھی نہ ڈوبنے پہ اختیار خیال باطل اور خواب جھوٹ۔ اس کی ذات کا اپنا ہی ایک سرد خانہ تھا جہاں مردہ خواب چت لیٹے بے بسی سے سیاہ چھت کو دیکھا کرتے اس کے من کی چڑیا تنہائی کے اونچے گنبد سے سر ٹکرا کر اپنی موت آپ مر جاتی۔

پھر بہت سا وقت کسی کے غم کی نذر ہو گیا، اور اسے اپنی خبر بھی نہ ہوئی۔ وہ وقت کے پکھیرو اور بادل جیسے لطیف لمحوں کے پکڑنے کی کوشش میں ہاتھ مارتا رہ گیا۔ حال آنسو بن کر بہتا رہا اور نمی کا احساس بھی باقی نہ رہا۔ آہیں اور سسکیاں گزری ساعتوں کی آہٹیں بن کر گونجتی رہیں۔ یہ کون تھا جو اس کے راستے بدلتا تھا۔ خواب کے بے وجود لمس نے اس سے بارہا یہ سوال دہرایا تھا مگر لفظ بے صوت وصدا پتھر کی مورتیاں بنے اسے دیکھا کیے۔

اگر اسے پالوں تو پانے اور کھونے میں فرق کیسے کروں گا۔ اپنے مٹ جانے کا درد کیسا ہوتا ہے۔ یہ تو ساتھی سے بچھڑ کر ہی سمجھ میں آ سکا تھا۔ مگر ہر چیز کی اپنی قیمت تھی اور قیمت کی ادائیگی اس کے بس کی بات نہ تھی۔ یا شاید ہر شے بے قیمت تھی۔ ہو سکتا ہے ہر شے اس قدر قیمتی ہو کر قوتِ خرید سے ہی باہر ہو۔ اس حقیقت نے اس کے اندر خوف بھر دیا تھا۔ کہیں میری بھی کوئی قیمت نہ ہو یا زمانے کے بازار میں میری قیمت اتنی ارزاں ہو کہ کوئی مجھے خریدنا بھی اپنی انا کے منافی سمجھے۔

وہ ایک ایسے شہر میں رہتا تھا جہاں گلیاں کوچے دھند میں لپٹے رہتے۔ پرچھائیاں راز و نیاز کرتیں آن کی آن میں فیصلے ہوتے اور کسی کو خبر تک نہ ہوتی پتھر ہیروں کے مول بکتے اور ہیرے قدموں میں بھی جگہ نہ پاتے۔ اب

اس شہر میں اپنی پہچان کیونکر منوا سکتا تھا۔ جہاں بے چہرہ جسموں کی بہتات تھی اور سانس روکے ہر شخص رواں تھا۔ جیسے اس کے دائیں بائیں دو رویہ دیواریں ہوں راستے بے شمار تھے مگر منزلیں معدوم۔ صرف سفر تھا جو جاری تھا۔

اس کا حل یہ تھا کہ گھر سے نکلے تو کام پہ جائے اور کام سے آئے تو پھر اگلے دن کے طلوع کا خوف سر پر سہم بن کر سوار ہو جائے اسے ایک ایسے خول کی تلاش تھی جس میں سمٹ کر اپنا وجود چھپا لے یا پھر قلب ماہیئت کر کے خود کو کسی پرندے یا دیو ہیکل جانور کے روپ میں ڈھال لے۔ لیکن اس تبدیلی کے بعد زندگی کا کیا روپ ہوگا۔ اس بارے میں ابھی کچھ کہنا مشکل تھا وہ کسی سے اس بابت سوال بھی نہ تو کر سکتا تھا۔ اس ساکت و جامد شہر میں لمبی دوپہر سناٹا بن کر گونجتی رہتی تھی۔ حتیٰ کہ آوازیں بھی خاموشی کے سایوں میں لپٹی رہتیں۔

یوں لگتا تھا سب کچھ ختم ہو رہا ہے یا ختم ہو چکا تھا۔ (وقت کی زمانی تقسیم اب بے معنی تھی) اس کے اندر باہر پانی ہی پانی تھا۔ جل تھل منظر لیکن صحرا سا دل۔ دونوں ناکام و ناشاد ایک چہرہ جو کبھی حاصل کون و مکاں تھا۔ دعائے دو جہاں تھی التجائے زمان و مکاں تھی۔ اب سائے سے بڑھ کر اس سے گریزاں اور سانس بن کر اس کے ساتھ تھا وہ طلب وہ تمنا آہ!

سب دل سے شروع ہوتا ہے اور دل ہی پر ختم ہو جاتا ہے۔ یہ قیامتیں سب اسی دلِ تمنا گزیدہ کی تولائی ہوئی ہیں۔

اسے بارش میں چلتے چلتے مدت ہو چلی تھی۔ اب پانی اس کے اندر بھی تھا اور باہر بھی۔ پانی کا احساس بھی مٹ چکا تھا اس سے پیدا ہونے والی نرم طمانیت اور اس سے حاصل ہونے والی جھنجھلاہٹ کا احساس بھی مر چکا تھا۔ اس مردہ شہر میں اسے جیتے ہوئے یگ بیت چلے تھے۔ اور اب وہی بے حس مردنی اس کے قلب و جاں پر بھی طاری تھی۔ ایک عادت جس نے اسے زندہ رکھا تھا وہ اپنے اندر کا دروازہ کھلا رکھنے کی عادت تھی اس سے اسے دکھ بھی ملے۔ اور وہ زندہ بھی رہا۔ لوگ اسے دیکھتے اور اپنی پتھر آنکھوں سے اس کے تن من میں زخم کرتے۔ وہ جب باہر کی دنیا سے ہار جاتا تو اپنے اندر کا دروازہ کھول کر اس میں داخل ہو جاتا۔ یہاں عجب بھول بھلیاں تھیں۔ بند گلیاں تھیں کہیں دھوپ سے سنولائے رستے تھے تو کہیں زرد سائے دونوں جہاں اس چھوٹی سی دنیا میں سمائے تھے مگر سمندروں سا گہرا پانی وہاں بھی تھا۔ اس سے فرار وہ وہاں بھی حاصل نہ کر سکا۔

یہاں بھی اسے اس ہستی کی یاد ستاتی جس نے اسے پتھر آنکھوں سے نجات دی تھی۔ وہ اونچی نیچی راہوں پر اس کے ساتھ چلی تو تھی۔ اس کے اندر باہر کے موسموں میں سانس بھی لیتی رہی تھی۔ مگر اس کے ساتھ رہ کر کچھ پژمردہ سی ہو چلی تھی۔ اسے نمو کے لیے باہر کی دنیا اور نت نئے دیسوں کی کشش درکار تھی۔ ارتقاء اسے ہر بندھن توڑنے پر مائل کرتا تھا۔ وہ پانیوں کے موسم کی خوگر نہ تھی۔ اس لئے اسے پھولوں جنگلوں اور بادلوں میں گھرا چھوڑ کر کسی بارونق اور انسانوں سے بھرے شہر میں چلی گئی۔ وہ اپنے پانیوں بھرے راستوں پر پھرا کیلا تھا۔

آج سمندر کی پرشور لہروں کے کنارے تنہا اور بے آباد جزیرے پر اس کے وجود کو نا موجود کی صدا سنائی دے رہی تھی۔ وقت ایک بار پھر طلسمِ صد رنگ بن چکا تھا۔ اک گنبد بے صدا ایک سفاک چمکتا آسمان، ایک ادھورا خواب ایک ان کہی داستان جس کو نیا موڑ دیتے ہوئے تقدیر کے ہاتھ فگار اور خامہ خونچکاں تھا۔ اس دھارے میں جذبے کی لہو رنگ دھنک بھی تھی اور فکر کے ہزار سالوں کی منطق طرازیاں بھی۔ لیکن نہ فلسفے نے اس کا دامن تھاما نہ عقائد اس کی دھندلی پڑتی راہوں کو روشن کر سکے۔ رہ گئی تو بس نظر کی تنگ دامانی اور روح کی تشنگی۔ نگاہ سے حد نگاہ کا فاصلہ یونہی برقرار رہا۔ اور مناظر فاصلوں کی زد پر معدوم ہوتے گئے۔ دل، نگاہ، روح اور ذہن کے سب تقاضے ناتمام تھے۔ لیکن اس ناتمامی کی تاویل نہ روشنیوں کے پاس تھی نہ بلندیاں اس کا کوئی جواز پیش کر سکتی تھیں۔ تقدیر اپنے بے رنگ لباس میں کانپتی ہوئی آئی اور اس کے سامنے خوف کا پیالہ رکھ کر چلی گئی۔ بے بس اور نامراد ظلمت و جبر کے سائے اس قدر طویل تھے کہ اس کا اپنا سایہ ان کے میں چھپ گیا۔ تاریکی نے اپنی زلفِ دراز کو اس کے گرد پھیلایا اور پھر اُس کو سنوارنے والے ہاتھ ہی قلم کر دیئے۔ اس کے قلب و نظر کی الجھنوں میں اور اضافہ ہو گیا۔ روح میں زندہ یہ ہست و بود کا نغمۂ سرمدی کیوں؟ جبکہ احساس کی لوہی ڈگمگا چکی تھی۔ قلبِ حزیں کا سرمایۂ غم اور زندگی کے شبستان میں سحر لانے والی ایک صدا بھی تو زندہ نہ رہی تھی۔ آس کا پنچھی شام ڈھلنے سے قبل ہی افق کے اس پار ڈوب چکا تھا۔

یہ روشن بازار وہ تھے جن میں کوئی خریدار نہ تھا ہر دریچہ خندہ بلب تھا۔ مگر راہوں میں کوئی نغمۂ جانفزا نہ گونجتا تھا۔ بس ایک سناٹا اور پھر ''میں'' کی صدا جو لوٹ کر بے جواب واپس آتی ہے اور گنبدِ وجود سے سر ٹکرا کر دم توڑ دیتی ہے۔

''جو تصوف پابندِ شریعت نہ ہو وہ زندیق تو پیدا کر سکتا ہے، صدیق نہیں''

---کشف المحجوب---

- از -

علی بن عثمان

المعروف

داتا گنج بخش

اپی ٹاف

نثار احمد صدیقی

(بہار، بھارت)

تقریباً ساڑھے گیارہ بج چکے تھے۔

دن بھر کی تھکان پورے وجود پر حاوی ہوتی جارہی تھی اور میں اب بستر کی گود میں چلا جانا ہی چاہتا تھا کہ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔

''اس وقت کون سکتا ہے؟'' میں سوچتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا اور دروازہ کھول دیا۔

''روی تم''؟ روی کو اتنی رات گئے دیکھ کر میں حیرت زدہ سا رہ گیا۔

روی خاموش کھڑا رہا میں نے بالکونی کی بتی جلا دی، روی روشنی میں نہا گیا۔ اور میں نے دیکھا کہ روی خاصا پریشان اور گھبرایا ہوا نظر آرہا ہے۔

''کیا بات ہے روی؟'' تم بولتے کیوں نہیں؟ اتنے پریشان کیوں نظر آرہے ہو؟''

روی نے مجھے پریشان، اداس اور خالی نگاہوں سے دیکھا اور انتہائی پژمردہ آواز میں بولا۔ لوسی، لوسی.....'' اور پھر چپ ہوگیا۔

''کیا ہوا لوسی کو..... بتاؤ روی، کیا ہوا؟'' میں بے ساختہ چیخ اٹھا۔

روی کے ہونٹ کچھ کہنے کے لئے کھلے اور پھر ایک دوسرے سے آن ملے، اب مجھ میں برداشت کی تاب نہ تھی، میں نے اُس کے دونوں کندھے جھنجھوڑ کر رکھ دیئے۔ ''بولو روی بولو! میں شاید اپنے ہوش وحواس میں نہ تھا۔

روی نے آہستہ سے میرے دونوں ہاتھ اپنے کندھے سے ہٹائے، ٹھنڈی سانس لیکر رومال سے اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھا، اب وہ اپنے آپ پر قابو پاچکا تھا۔

''امیت! لوسی ختم ہوگئی''۔ اُس کی آواز میں سمندر کا اوپری ٹھہراؤ اور خزاں کی بھری دوپہر کا سناٹا بول رہا تھا۔

''روی تم ہوش میں تو ہو؟ تم کیا کہہ رہے ہو روی؟ میں نے محسوس کیا کہ میری آواز انتہائی غم وغصہ سے بھری ہوئی تھی، روی نے ہمدردانہ انداز میں میرے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے اور ٹھہر ٹھہر کر کہنے لگا۔

''ہاں امیت! میں پوری طرح ہوش میں ہوں، لوسی ایک تیز رفتار کار کے نیچے آکر ہمیشہ کے لیے ہم سے جدا ہوچکی ہے''۔ اور تب میرے اندر جانے کیسا جوار بھاٹا اُٹھا، جانے دکھ کا کیسا سمندر پورن ماشی کے چاند سے نبرد آزما ہونے لگا میں نے جذبات چھپانے کے لئے آسمان کی طرف نگاہ کی، مگر آسمان سیاہ تھا، میرے من پر اتنا بوجھ تھا کہ میں چاہ کر بھی نارمل نہیں ہو پا رہا تھا۔

میں چیخ اُٹھا.....'' نہیں لوسی نہیں مرسکتی..... وہ کبھی نہیں مرسکتی''۔

روی نے آہستہ سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا، شاید وہ میرے دکھ کا اندازہ کر رہا تھا اُس نے آہستہ سے اور بڑی ہمت سے سمجھایا۔

''امیت! پاگل مت بنو، یہ وقت رونے کا نہیں ہے لوسی کا غم تو ہمیشہ جگمگاتا رہے گا اس وقت ہمیں اُس کے گھر چلنا چاہیے۔

میں نے روی کے طرف دیکھا۔ یہ روی تھا، یہ کوئی اور تھا روی تو ہمیشہ کوئی نہ کوئی دل کو خوش کرنے والی بات سناتا، اس کی اس ادا پر میں نے اسے ''پیغامبر مسرت'' کا خطاب دیا تھا مگر آج یہ بات جھوٹی ثابت ہوچکی تھی، روی نے مجھے دھوکا دیا۔ آج اُس نے مجھے میرے دل کی گلیوں، کوچوں اور بازاروں میں تڑپنے اور پھڑ پھڑانے کا سامان مہیا کیا تھا۔

''مگر روی کیا کرسکتا ہے؟'' میرے اندر ہی اندر پھر ایک سوال اُٹھا، اور اس کا میرے پاس جواب نہیں تھا۔

لوسی کا گھر ماتم کدہ بنا ہوا تھا۔ لوسی کی ماں کو دیکھ کر ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ہسٹریا کا دورہ پڑ گیا ہو، وہ دیواروں سے اپنا سر ٹکرا رہی تھی، اس کو دیکھ کر تو میں اپنا بھی غم بھول گیا اور اپنے میں اتنی ہمت بھی نہ پیدا کر سکا کہ اُس کے نزدیک جا کر اُسے سمجھا سکوں..... میں آہستہ سے اُس طرف بڑھ گیا، جدھر لوسی کا مردہ جسم پڑا ہوا تھا۔ یہ ایک اور دل دہلا دینے والا منظر تھا۔ وہ خوبصورت، سادہ، مہک اور تیکھے نقوش والی لوسی جو مجھ سے محبت کرتی تھی وہ وہاں نہیں تھی۔ وہاں تو ایک مسخ چہرہ پڑا ہوا تھا جس کا ایک ایک حصہ کار سے ٹکرا کر چُور چُور ہو چکا تھا۔

میں آنسوؤں میں نہایا اور آہوں میں جلا اور طاقت وجبروت والے خدا کے خوف سے اندر ہی اندر لرزتا رہا جس نے شاید چشم زدن میں یہ فیصلہ لیا کہ اس تر وتازہ جوان، خوب رو، تیز وطرار، کومل، شیتل اور مدھر لڑکی کے متحرک فعال اور پرکشش جسم کو اب خاموش ہوجانا ہے۔

لوسی خاموش..... نہیں، مردہ میرے سامنے پڑی رہی اور مجھے بہت ساری باتیں، خواب، امیدیں، آرزوئیں، مسرتیں، لمحے، یادیں، پریشان کرتی رہیں جو ہم دونوں کا مشترک سرمایہ تھیں۔ آنسوؤں کے چند قطرے پھر بے قرار ہوکر نکلے اور لوسی کے جسم پر پڑی سفید چادر میں مل گئے۔

لوسی کے اختتام پر لوسی کی ابتدا یاد آگئی، وہ کالج میں مجھ سے دو سال جونیئر تھی، اس کی صاف گوئی اور نرم رویئے نے مجھے اس کی طرف متوجہ کیا، پھر ایک مرتبہ وہ میرے گھر بھی آئی اور اس طرح آہستہ آہستہ ہم ایک دوسرے کے قریب ہوتے گئے، گزرتے ہوئے دنوں کے ساتھ ایک عجیب احساس نے سر اُٹھایا، میں نے محسوس کیا کہ آپ ہی آپ میرے دل میں اُس کی محبت کا بیج جڑ پکڑ چکا ہے، پھر اس بیج کا انکر پھوٹا، پھر ننھا منا پودا نکلا اور دیکھتے دیکھتے وہ ایک تناور درخت بن گیا مگر میرا مسئلہ یہ تھا کہ میں انتہائی شرمیلا ہونے کے سبب کبھی کھل کر اس کے سامنے اپنے اس جذبے کا اظہار نہ کرسکا۔ صرف میرے دل کے

ہر کونے میں اس کی محبت کا چراغ جلتا رہا اور میرے خانہ دل پر اسکی چاہت کی پھوار پڑتی رہی مگر یہ بارش بے آواز تھی اور محبت خاموش تھی۔

لوسی اپنے امتحان کی تیاریوں کے سلسلے میں اکثر، بیشتر میرے یہاں آتی رہتی اور میں کچھ کہے بغیر نہایت ذمہ داری، ایمانداری اور لگن کے ساتھ اس کو پڑھاتا رہا۔ ایسی ہی ایک شام لوسی نے اچانک میری طرف نگاہ اٹھائی، مسکراتی ہوئی آدھی گویا آدھی ساکت آنکھیں مجھ پر مرکوز تھیں، میں فطری طور پر ایسی صورت حال سے گریز کا عادی ہونے کے سبب گڑبڑا گیا پر اُن آنکھوں کا کیا کرتا جو مسلسل مسکرا رہی تھیں اور مسلسل مجھے دیکھ رہی تھیں.....اچانک دیکھتے دیکھتے لوسی نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور آہستہ سے بولی۔

''امیت ! تم سے الگ ہوتی ہوں تو تم مجھے بہت یاد آتے ہیں..... مجھے تم.....!''

جملہ ادھورا چھوڑ کر وہ اُٹھی اور تیزی کے ساتھ دروازے سے باہر نکل گئی۔

اور میں تنہا رہ گیا میرے اردگرد ایک طوفان سر مارتا رہا، پتہ نہیں اس کیفیت کا کیا نام ہے جب خوشی اور غم دونوں بے نام ہو جائیں۔ جب اندر اندر تو خوشیوں کا احساس موجزن ہو اور آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ جائیں میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے رات بھر میں بستر پر کروٹ پہ کروٹ بدلتا رہا اور ہزار کوشش کے باوجود نیند نہ آسکی۔

دوسری صبح کمرے میں بیٹھا تھا کہ لوسی آ گئی اور خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گئی میں نے سر اُٹھایا اُس کی طرف دیکھا، اس کی آنکھیں میری آنکھوں میں پیوست ہوتی جا رہی تھیں، میں ایک مرتبہ فطری حجاب کی دھند میں گھرا مگر فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھال لیا اور آہستہ سے کہا۔ ''لوسی! کل بات ادھوری رہ گئی تھی''!

وہ آہستہ سے مسکرائی اور جذبات سے بوجھل آواز میں بولی۔ ''ایسی باتیں ادھوری ہی چھوڑی جاتی ہیں امیت۔''

''پلیز! میری خاطر مکمل کر دو، ایک مرتبہ پوری بات کہہ دو''۔

لوسی تھوڑی دیر خاموش رہی پھر بہت دھیرے سے بولی۔ ''ہاں! امیت مجھے تم سے محبت ہے''۔!

میرے اندر ہی اندر خوشی کا ایک سیل اٹھا اور میں اُس میں بہہ گیا، میں شاید اپنے آپ میں تھا ہی نہیں، پھر مجھے میری آواز سنائی دی''۔ اب تم میری زندگی کا مقصد اور میری منزل ہو لوسی''

پھر یوں ہوا کہ اس سیل میں ہم دونوں بیک وقت بہے اور پھر کچھ یاد نہ رہا، بس ہم دونوں ایک دوسرے کو بھینچے ہوئے رقص کرتے رہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے محبوب تھے، امتیاز من وتو مٹ چکا تھا، اور اس لمحے میں میرے اور لوسی کے علاوہ اس پوری کائنات میں کچھ نہ تھا، میں نے لوسی کے لئے ایک نظم کہی۔

''اس دھرتی پر دو ہی کتھا
میں اور تم.....''

پھر دوسری نظم' تیسری نظم میں لوسی کو دیکھتا اور شعر کہتا رہا، لوسی مجھے دیکھتی رہی اور شعر سنتی رہی دن پر دن اس طرح گزرتے چلے جا رہے تھے کہ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ صبحیں کب طلوع ہوتی تھیں اور رات کیسے دروازوں پر آن دھمکتی تھی۔ ایسے ہی ایک لمحے میں لوسی کہنے لگی۔ ''امیت وعدہ کرو کہ میں جب مر جاؤں تو تم میری قبر پر لگانے کے لئے ایک اپی ٹاف Epitaph لکھو گے''۔ میں نے اُس کی بات پر اُسے خبطی، پاگل اپنے چاہنے والوں کو رُلانے والے جیسے القاب سے نوازا اور اسکی بات کو نان سنس قرار دیتے ہوئے ہوا میں اُڑا دیا۔

مگر آج وہی بات سچ ثابت ہو چکی تھی اور میں اُس کی لاش کے پاس بیٹھا اُس کے ساتھ گذری ہزاروں یادوں اور ساعتوں کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا، ساری رات یہ ساعتیں جھلملاتی رہیں اور لوسی میرے سامنے اپنے پسندیدہ سفید لباس میں ہونٹوں پر نرم نرم مسکراہٹ لئے لیٹی رہی، وہ ابدی نیند سو رہی تھی اور میں جاگ رہا تھا۔ اور اُسے دیکھ رہا تھا، اچانک میری نگاہ اپنی گردن میں پڑے چاندی کے اُس لاکٹ پر پڑی جو اُس نے مجھے دیا تھا۔ میں نے وہ لاکٹ اتارا اور اس کی گردن میں پہنا دیا۔ میں اس سے زیادہ اس کی محبت کا اور کیا احترام کر سکتا تھا۔

اور یوں ساری رات بیت گئی اور وہ صبح آئی جو اُس کی جدائی کی آخری صبح تھی، اس کا جنازہ اُٹھا۔ سب چلے۔ میں بھی چلا۔ لوگ زیر لب دعائیں پڑھ رہے تھے۔ لیکن مجھے کوئی دعا یاد نہیں آ رہی تھی۔ اگر یاد بھی آتی تب بھی میں پڑھ نہیں سکتا تھا۔

''دشمنی ہے دعا کو اثر کے ساتھ''

میں لوسی کے جنازے کا ایک خاموش تماشائی شریک تھا۔ مگر بہت دیر تک میں اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا اور اس سے پہلے کہ اُسے قبر میں لٹایا جائے میں نے تابوت پکڑ لیا اور آنسوؤں سے تر بتر ایک بوسہ آپ ہی آپ اس تابوت پر ثبت ہو گیا، میری لوسی تابوت میں تھی، میں نے تابوت کا نہیں، لوسی کا بوسہ لیا تھا۔

اور پھر لوسی مجھ سے جدا ہو گئی، اسکی قبر بند کر دی گئی تو مجھے اُس کے الفاظ یاد آئے۔ ''وعدہ کرو کہ جب میں مر جاؤں تو تم میری قبر پر لگانے کیلئے ایک اپی ٹاف Epitaph لکھو گے''۔ اور مجھے ایک ایسے وعدے کی تکمیل کرنی پڑی جو میں نے کیا ہی نہیں تھا۔

آنسو میری آنکھوں میں جھلملاتے رہتے ہیں، دل اس کی یادوں سے روشن پُر نور..... اور افسردہ رہتا ہے اور اسکی قبر پر میرا لکھا ہوا کتبہ میری کیفیت کا تھوڑا بہت اظہار کرتا رہتا ہے۔

''پل بھر کی یہ چھپکی/ گہری نیند ہی بن جائے/ لیکن وہ تمہاری زندہ دلی ہنستی ہوئی آنکھیں محبت سے بھری/ سونے کی نہیں جاناں/ مرنے کی نہیں یار و جسم فانی ہے تو کیا/ روح تو سائے کی طرح/ اک عمر کی ساتھی ہے/ یادوں کی جلا وطنی کسی شخص کے بس میں ہے اور میرا دکھ زندہ ہے.....اور تا عمر زندہ رہے گا''

کہ لوسی میری زندگی کے صحراؤں سے نکل کر بہشت کے باغوں کی طرف اتنی آہستگی سے چلی گئی کہ مجھے خبر تک نہ ہوئی۔!!!

خوابوں کے پھندے

کنیز نبوی
(ٹنڈوآدم)

نام تو اس کا کمال خاتون تھا۔ مگر بچپن میں چھوٹے بھائی کی پرورش کی جو ذمہ داریاں پڑیں تو اپنی توتلی زبان میں اسے کمال خاتون سے کامی بنا دیا۔

باپ اس کا بہت بڑے جاگیردار کا کمی۔ منشی گیری کرتا اور اس کی بیٹیاں حویلی میں کماتیں، پانچ آٹھ سو روپیہ ماہانہ۔

گاؤں کے آدھے سے زیادہ لوگ جاگیردار فیملی کے ملازم، باقی مزارعے، سب غلام، اندر باہر نوکری بھرتے رہتے۔

ایک سدھائی ہوئی بیل منڈھے چڑھتی، خان صاحب کی اجازت سے، اس کے ولی گھر جاتے ہیں۔ دوسری بہن جانشیں بن کے حویلی میں در آتی۔

رال ٹپکنے والوں کی رال ٹپکتی، منہ میں پانی بھر آتا، آنکھوں میں نئے شکار کو پھانسنے کی چمک بڑھ جاتی۔ حویلی میں پہلے دن آتے ماں نے سمجھایا۔

''دیکھ بیٹی نظر نیچی رکھنا۔ نظر کو نظر سے بچانا۔ سر جُھکا کے چلنا دھی ''بیٹی'' جھکے سر اور نظر سے اپنا حفاظتی بند باندھنا۔ سماج کے گورکھ دھندے میں عورت کو اٹھے سر کو جُھکانا، تیکھی نظروں کو اپنی انگلیوں پر نچانا، خود سر مردوں کی خواہش ہوتی ہے دھی۔ خود پر بدمزاجی کا خول چڑھا لو۔ کام سے کام رکھو۔ فضول کام اور فضول بات سے پرہیز کرو۔''

اس نے بڑی سمجھداری سے ساری نصیحتیں پلّو میں باندھیں اور جاگیردار کی حویلی میں کام والی بن کے آ گئی۔ وہ ماں کی نصیحت پر عمل کرتی۔ نگاہ جھکا کے چلتی۔ اور اپنے تئیں بدنگاہی سے محفوظ رہتی۔

کئی بہاریں بعافیت گذر گئیں۔ بیگم صاحبہ کی کڑی نگرانی اسے حد درجہ مطمئن و پُرسکون رکھتی۔ آہستہ آہستہ وہ خود نڈر و بہادر بن گئی۔ مجال نہیں کوئی اس کی طرف آنکھ اٹھائے۔ بڑے کروفر سے چلتی۔ گردن اکڑا کے پھرتی سے کام نبٹاتی اس کی کوکنگ ان کے معدوں کو روز افزوں تسکین پہنچاتی۔ دن رات کام میں جٹی رہتی۔

بڑی بیگم کی نظروں سے بھی بالآخر اس کا خوف کافور ہوا۔ لڑکی باآبرو ہے۔ خود حفاظت کرنا جانتی ہے۔ وہ مطمئن و بے نیاز ہوئیں۔ اور بے نیاز تو نمانی کامی بھی ہوگئی، عمر عزیز کے گیارہ سال حویلی خان صاحب میں گذارنے کے بعد بھی باکرہ و باکردار ہی رہی۔

آہستہ آہستہ جیسے وہ بے نیاز ہوتی چلی گئی، اپنے مضبوط آہنی اعصاب نے اس کے گرد بے پرواہی کی چادر تان دی۔ بس لڑکی لڑکپن بخیر و خوبی گذار لے۔ تو پھر سمجھدار ہو جاتی ہے۔ دنیا کی اونچ نیچ، اٹھنا بیٹھنا، بولنا چالنا، سب سیکھ جاتی ہے۔ تیس سال کے بعد اسے لگا اب بڑھاپا آیا کہ آیا۔ خوش تھی عمر عافیت میں کٹ گئی۔

مگر یہ خوشی اس وقت زنگ آلود ہوئی جب خان صاحب کی نظریں اسے واضح پیغام ارسال کرنے لگیں۔ وہ رُکی، ٹھٹھکی، سنبھلی اور خان صاحب کو پیغام سمیت نظر انداز کر دیا۔ اک بار پھر حیا کی چادر کھینچ کے تان لی۔ اور بے پروائی کے خول میں چھپ گئی۔

اس عمر میں؟ وہ دل ہی دل میں ہنسی۔

خان صاحب کی آنکھ میں تو شرم کا پانی کبھی چڑھا ہی نہیں۔ پر میں اس کی ملازمہ، اس کے بچے کی آیا۔ کچھ تو خیال کرے۔ میرا باپ اس کا منشی، کئی باتیں خان صاحب کی اس کی یاداشت میں تازہ ہوگئیں۔

تب وہ کہتی ہاں عورتوں کا بھی تو قصور ہے نا! وہ اسکو قبول کرتی ہوں گی تبھی تو وہ ان کی زندگیوں سے کھیلتا ہے۔ تب اسے علم نہیں تھا کہ کھلونے کو کوئی اختیار نہیں روک ٹوک کا۔ اس کا کام تو صرف دل بہلانا ہوتا ہے کھیلنے والا کھیلے، توڑے، پھینکے یا بہ حفاظت رکھے۔ کھلونا تو غریبوں کا سا مقدر لایا کرتا ہے اس کے بس میں کچھ نہیں سوائے بے بسی و لاچاری کے۔

مگر وہ کھلونا نہیں اک جیتی جاگتی سوچ و فکر رکھنے والی متنفس تھی۔ سوچنے لگی کہ اپنی حفاظت کیسے کی جائے۔ بیگم صاحبہ کو بتانے سے نوکری جانے کا ڈر۔ دوسرا عتاب خان صاحب کا خوف۔ پیچھے اک چھوٹا بھائی دو بہنیں اور بوڑھا باپ۔ پتہ نہیں خان صاحب ان کے ساتھ کیا سلوک روا رکھے۔ وہ شش و پنج میں گھری حیران و پریشان رہنے لگی۔ کام سے جی اوب گیا۔ جاگیردارنی سے اجازت لینا چاہی۔ ''ماں بوڑھی ہے اس کی خدمت کا کچھ فرض ادا کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے ملازمت سے فارغ کر دیں۔'' مگر اک نا سنی گئی۔

''دیکھ اتنے سالوں سے تُو میرے پاس ہے۔ ہر بات سے بخوبی واقف ہے۔ کہے بنا ہر کام کر دیتی ہے۔ میں تجھے چھوڑ نہیں سکتی۔ ماں کی خدمت کے لیے ابھی عمر پڑی ہے۔ چھوٹی بہنوں کی شادیاں ہو جائیں۔ پھر جا کر یہ فرض ادا کرنا''۔ مجبوری کا احساس اور قوی ہوا۔ وہ خاموشی سے کچن میں لوٹ آئی۔ کیا بیگم صاحبہ کو بتا دوں کہ خان صاحب کی بدلی بھری نظروں کا خوف مجھے بھگا رہا ہے۔ نہیں اس نے اپنی سوچ کو رد کر دیا۔

بیگم صاحبہ نے خان صاحب کو کہا تو بھی شامتِ اعمال تو آنی ہے۔ پتہ نہیں کیا کرے کون سے جھوٹے سچے کیس میں میرے باپ کو پھنسوا دے۔ کئی دن سوچ و بچار اور خان صاحب کی نظروں سے بچتے بچاتے گذر گئے۔

''میں تم سے محبت کرتا ہوں کامی'' کڑک لہجہ عاجزانہ ہوگیا۔

کیوں سے محبت نا سمجھ آنے والا معمّہ۔ وہ ایک بار پھر سر جھٹک کر

آگے بڑھ گئی۔

''میں نے زندگی میں کبھی کسی سے سچا پیار نہیں کیا تیرے سوا''۔

وہ ٹھٹھکی، برتنوں کی ٹرے اٹھائی اور مڑ گئی۔ خان صاحب کی نگاہ اس کے پورے وجود کا طواف کرتی رہتی اور بہت بڑے دوپٹے کے بکل سے ڈھکے بھرپور سراپے سے ٹکرا کر مایوس لوٹتی۔

بیگم صاحبہ شہر بغرضِ علاج کیا گئیں کہ کامی کی شامت آ گئی۔ خان صاحب نے اپنی ساری ذمہ داری کامی پر ڈال دی۔

کامی میرے کپڑے نکالو، جوتے لے آؤ۔ میرا کھانا لگاؤ۔ ہر کام کے لیے پکار کامی کی سماعتوں میں پگھلا سیسہ بن کر آتی۔

کامی کچن میں کام وام چھوڑ چھاڑ، مرتی کیا نہ کرتی کے مصداق دوڑی بھاگی جا رہی ہے۔ حکم، حاکم مرگِ مفاجات، ادھر بیگم صاحبہ کی بیماری طویل ادھر کامی کی شامتِ اعمال۔ کامی چائے پہنچاتی تو ہاتھ پکڑ لیا جاتا۔

''دیکھ پگلی مت بھاگ مجھ سے، ارے تجھ سے شادی کروں گا۔ اس حویلی کی مالکن بن جائے گی تُو۔ رانی بن کر راج کرے گی۔ بس یوں سمجھ، ادھر چند ماہ کی مہمان بیگم صاحبہ فوت ہوئیں، اُدھر تمہاری قسمت کھلی۔ دیکھ کامی زندگی میں سب کچھ ہے میرے پاس سوائے سچے پیار کے جو مجھے تو ہی دے سکتی ہے، صرف تُو۔''

پہلے پہل تو کامی ایسی باتوں کو خاطر میں نہ لاتی۔ سرطان زدہ بیگم صاحبہ کا چہرہ اس کی نگاہوں میں سما جاتا۔ مگر کہاں بھاگتی بیچاری کامی۔ اک کمزور وجودی تقاضوں سے بھرپور تنفس، ساری عمر محنت و چاکری کرتے گذارنے والی ایک کمی کمین، اتنے اونچے برجوں کی ملکہ بننا کون ناپسند کرے۔ سو خفیہ نکاح کے جھانسے میں آ کر زمینوں پر بنے فارم ہاؤس پر منتظر خان صاحب کے پاس اس کے ڈرائیور کے ساتھ پہنچ گئی۔ حویلی سے نکلنے میں بیگم صاحبہ کے پاس شہر جانے کا بہانہ کام آیا۔

خان صاحب کی تو خوشی سے باچھیں بند ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں۔ کامی کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ فارم ہاؤس کے یخ بیڈ روم میں وہ آنکھوں میں سپنے سجائے نکاح کی منتظر تھی۔ خان صاحب کا پروگرام خفیہ شادی کا تھا۔ جب تک اس کی خاندانی بیوی داغِ مفارقت نہ دے بقول اس کے موت کے بستر پر اسے یہ صدمہ دینا نہیں چاہتے اور اس کی محبت میں بارہ سال جلنے کے بعد انتظار کا یارا ابھی نہیں رہا تھا۔

کامی کا سر اس کی محبت کے آگے جھک گیا اور وہ اس کی چکنی چپڑی باتوں میں بہتی چلی گئی۔ ''مجھے یقین نہیں آ رہا کامی آج تم میری ہو'' لہجہ انہونی خوشی سے چور چور تھا۔ لجاتی شرماتی کامی بار بار کن انکھیوں سے دروازے کو گھورنے لگتی۔

''اُدھر کیا دیکھتی ہے جانِ من' اِدھر دیکھ، تیرا عاشق، تیرا سودائی، صدیوں سے تیرا منتظر ہے'' کامی کے سراپے کو نظروں میں سماتے اور سمیٹتے قریب اور قریب آ گیا۔

''خان صاحب میں یہ دیکھ رہی ہوں کہ نکاح خواں کب آئے گا''۔

''نکاح بھی ہو جائے گا اتنی جلدی کاہے کی ہے۔ آج سالوں بعد تنہائی میسر آئی ہے۔ دل بھر کے مجھے دیکھ تو لینے دے، کب سے تمنا تھی تجھے پانے کی۔ برسوں کے بعد آج پوری ہوئی ہے'' آخری جملہ منہ میں بڑبڑایا۔

اس نے دونوں ہاتھوں میں کامی کا چہرہ تھام لیا۔ کامی کو پتہ ہی نہ چلا کہ کب گھاگ شکاری محبت بھری باتوں کے شیرے میں بھگو کر کامی کو پگھلاتے ہوئے بیڈ پر آ بیٹھا۔ اور وہ کیسے موم کی طرح پگھلتی چلی گئی۔ پتہ تب چلا جب عزت کی لَو ہمیشہ کے لیے بجھ چکی تھی۔ کامی نے ایک بار صرف ایک بار کمزور سا احتجاج کیا۔ ''خان صاحب ابھی نہیں''۔ اور خان صاحب نے اس کی پیشانی چوم کر کہا۔ ''کیا فرق پڑتا ہے۔ نکاح سے چند گھنٹے پہلے یا بعد میں، ہو تو تم میری ہی نا ہمیشہ سے اور ہمیشہ رہو گی۔''

عجیب طرح کی بھبھکے خان صاحب کے صرف منہ ہی نہیں پورے وجود سے اُٹھ رہے تھے۔ سرشاری اس کے انگ انگ سے پھوٹتی تھی۔ اس صاحبِ تسخیر نے بالآخر سالوں بعد سہی اسے مسخر کر ہی لیا۔ خان صاحب کی انا کا برج اور اونچا ہو گیا۔ پہلے سے تنا ہوا سینہ کچھ اور تن گیا۔ تسخیر کے نشے میں شاداں و فرحاں جھومتا' ڈولتا' شکاری حویلی کے صحن میں کھڑی بی ایم ڈبلیو میں بیٹھ کر پھُر سے اُڑ گیا۔

''چلو تمہیں واپس حویلی چھوڑ دوں'' ڈرائیور کی چبھتی آنکھوں اور طنزیہ مسکراہٹ سے نظریں چرا کر اس نے خان صاحب اور نکاح خواں کے بارے میں استفسار کیا۔

''خان صاحب کو شہر سے فون آیا تھا۔ بیگم صاحبہ کی طبیعت خراب ہے، وہ چلے گئے ہیں۔ تمہیں کس نے کہا ہے کہ مولوی آئے گا'' پان کی پیک تھوکتے ہوئے استہزائیہ انداز میں ''فارم ہاؤس پر مولوی نہیں دلال آتے ہیں''۔

کامی کا دماغ ایک دم سُن ہو گیا۔ دل درد کے آہنی شکنجے میں جکڑا گیا۔ زخمی اور بے جان جسم کو بمشکل گھسیٹنے کی کوشش کرنے لگی۔ بارہ سال حویلی خان صاحب میں نیک نام رہنے کے بعد فارم ہاؤس سے اپنی حرمت نسواں کو داغدار کر کے سفرِ واپس ایک طرح سے سفرِ ندامت بن گیا۔ غیرت کی بے مول نیلامی کے باعث کامی زمین میں گڑی جاتی تھی۔ کیا ہو گیا کامی' آخر تجھے کیا ہو گیا؟ کس جھانسے میں آ گئی۔ کیسے خونخوار شکاری کے ہتھے چڑھ گئی؟ ارے پگلی ان اونچے شملوں والوں کے لئے ہر نو جوان اور خوبرو عورت نئی تازگی اور نئے خمار کا باعث ہوا کرتی ہے۔ یہ خونخوار درندے ہر ساز کو چھیڑ کر اس کے سروں سے اک نئی خوشی کشید کرنا محبوب مشغلہ گردانتے ہیں۔

تُو تو ایک زمانے سے اپنی عزت اپنی عصمت اور اپنی حرمت بچانے کی سعی میں کوشاں تھی۔ تُو کس طرح بھرے بازار میں اندھے اعتماد کے ہاتھوں لٹ گئی۔

اس کے مردہ جسم سے بے حرمتی کے بھبکے اٹھتے رہے۔ گدھ مردہ جسم سے اپنی بھوک مٹا کر اُڑ گیا۔ اور وہ پیاسی اپنے پامال جسم کے ذرّات کو لنگڑے ہاتھوں سے سمیٹتے سمیٹتے ادھ موئی ہوئی جاتی تھی۔

صدیوں سے لہولہان وجود سنبھالتے اذیت ناک مسافرت کی زحمت اٹھائے لوٹی۔ کہ جس نے بدن چُور چُور، روح رنجور، دل کرچی کرچی کر دیا۔ جسم و جاں اک ٹیس بن گیا۔ مسلسل کرب کا اک نہ رُکنے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مضطرب لیر لیر وجود محبت کی چال میں ہوس کی نذر ہو کر حیات دردانگیز میں تبدیل ہو چکی تھی۔

اس کا تو صدیوں سے استحصال ہوتا آیا تھا۔ تو پھر سر اٹھانے کا جرم کیوں کر سرزد ہوا اس سے' کیوں اب وہ اس کی ناکردہ گناہ کی پاداش میں مصلوب کر دی گئی ہے؟ وہ کامی کس طرح ڈسی گئی۔ جس کی تنی گردن میں خم پڑ گیا ہے۔ جس کا فراخ سینہ جوانی میں ہی ڈھل گیا۔ جس کی تیز نظریں دھرتی میں گڑ گئیں ہیں۔ جس کا ماضی' حال اور مستقبل گھنے جنگل کی عفریتوں میں گھر گیا ہے۔

سرگوشیاں منظر کا بھیس بدل کر بنگلے کے کونوں کھدروں میں نوکروں کی آنکھوں میں گھسی جاتیں۔ لبوں پر مچلنے لگیں، ساعتوں پر کروٹیں لینے لگیں، بڑھتے بڑھتے بدنامی کا اژدہا بن گئیں۔ اژدہے نے کامی کو تو سالم نگل لیا۔ خان صاحب کی جاگیردارانہ فطرت عود کر آئی۔ شامتِ اعمال نے نوکروں کے چھکّے تو چھڑائے ہی مگر معتوب کامی اور اس کے گھر والے بھی ٹھہرے۔ اس کے بہنوں بھائیوں کے رشتوں پر قدغن لگ گئی۔ وہ سالوں تک کنوارے بیٹھے رہے۔ کامی تو جنموں جلی سب سے منہ چھپائے پھرتی۔ ناپلّو میں عزت رہی، نا سماج میں طاقت کہ نئے عہد کی کوئی نوید سنائے۔ وہ ناقابلِ علاج ناسور پالتی رہی۔ دل تھا کہ مسلسل دُکھنے والا پھوڑا بن گیا۔ وہ کوئی صدائے احتجاج بلند کر پائی نہ اس فرسودہ نظام کے خلاف کسی طرح کی دہائی دے سکی۔ بدبودار نظام کے خلاف، صدیوں سے سرنگوں تھی۔ پتہ نہیں کیسے سر اٹھانے کی جرأت کر بیٹھی تھی، سسکتی زندگی کو گھسیٹتے گھسیٹتے تھک گئی تھی۔ کہاں جاتی، محبت کے خواب دکھانے والے کے پاس جاتی تو کیسے؟ اس ستم کیش سے کیا فریاد کرتی اور کہاں تک کرتی۔ کہ اب تو تن من زبان اور زخمی روح کے ساتھ گھر والوں کی قیدی تھی۔

اب اُس کے بہن بھائیوں کے لیے پیغام آنا تو کجا' خود بات کرنے پر بھی سب انکار کر دیتے۔ اگر خان صاحب ناراض ہو گئے تو جان کے لالے پڑ جائیں گے۔ ہر کوئی توبہ تِلّا کرتے بھاگتا۔

بھائی بہنوں کی ڈھلتی عمر نمانی کامی سے نا دیکھی گئی۔ اس سے پہلے کہ ان کی آنکھوں میں سجے سپنوں کے پھول مرجھا جائیں۔ جوانی کی خوشبو اڑ جائے، اور خواہشات مردہ ہو جائیں۔ کامی کمر کس کے میدان میں کود پڑی۔

''کہاں جا رہی ہو کامی''۔

''خان صاحب کے پاس' اب بہت ہو گیا'' میرے گھر میں بھی بھائی کے سہرے گونجنے چاہیے۔ بہنوں کی بارات اترنی چاہیے۔ بوڑھے باپ کی غلام آنکھوں میں قید آنسو آزاد ہوئے۔ لب کانپے، پھڑ پھڑائے، پر مضبوط قفل نہ کھل سکے، اس نے ہمیشہ سے جھکایا ہوا سر اور جھکا لیا۔ اور کامی نڈر پن سے خوابوں کے پھندے پر مصلوب معصوم خواہشیں لیکر اسی فارم ہاؤس پہنچی جہاں اس کی کمند ٹوٹی تھی

''تم!'' خان خوشی سے کھڑا ہو گیا۔ شکار خود آ کر پھنسا تھا، شکاری کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔ خودسری عود کر آئی، تنفر سے مسکرا کر کھڑا ہو گیا۔

''ہاں خان صاحب' میں!'' وہ دو قدم چل کر عین اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ ''میرے بھائی بہنوں کے رشتوں سے پابندی اٹھا دیں۔

''ہمیں معلوم ہے! یہاں سے لوٹ کر جانے والیاں پھر پلٹ کر واپس آتی ہیں'' خان صاحب کے ہاتھ اس کے کاندھوں تک آ گئے۔

''خان صاحب تمہیں اللہ کا واسطہ' میرے بھائی بہنوں کے''

''ہاں' ہاں اُٹھ گئی پابندی تو جاتے ہی تیاری شروع کر دے''۔ خان نے کامی کے مضبوط لہجے کو کاٹتے ہوئے اُس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اپنے سیاہ اور بھدّے ہونٹ کامی کے ہونٹوں میں پیوست کر دیئے۔

کامی نے اپنا تھوک' اُس کے اعمالوں کی طرح سیاہ منہ میں ڈالتے ہوئے' تنفر سے سوچا' تم جسموں کے سوداگر کبھی بھی دلوں کے بادشاہ نہیں بن سکتے۔

بقیہ
سرمایۂ جاں

عالم میں ایک ہی جانب بڑھے چلے جا رہے ہیں۔ غیر ارادی طور پر میں بھی اسی جانب چلنے لگا ہوں۔

تمام لوگ' بڑ کے اس گھنے درخت تلے جا کر ٹھہر گئے ہیں۔

جہاں چوہدری کے پوتے کی پیدائش کا جشن منایا گیا تھا۔ کچھ بھی تو تبدیل نہیں ہوا گاؤں میں' سوائے تازہ مٹی کے ایک ڈھیر کے!

مجمع میں بہت سے شناسا چہرے بھی نظر آ رہے ہیں جن میں شکیلہ' غزالہ' زینت' زرینہ' چمکی اور بہار بائی بھی نمایاں ہیں۔

سب کے ہاتھوں میں پھول اور آنکھیں اشک بار ہیں۔

سب کے کانوں میں ایک ہی مترنم سرگوشی سنائی دے رہی ہے۔

حسن جس رنگ میں ہوتا ہے جہاں ہوتا ہے
اہل دل کے لئے سرمایۂ جاں ہوتا ہے

☆

گلزار جاوید

''سرمایۂ جاں''

راولپنڈی

وقت گزرنے کے ساتھ' انسان خود کو پہلے سے زیادہ عاقل و بالغ سمجھنے لگتا ہے۔ اسے آپ' خوش فہمی کے علاوہ سائنس کا کرشمہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ میرے خیال میں' گئے وقت کی نسبت' میں بھی کسی قدر بردبار اور سمجھدار ہو گیا ہوں۔ جیل میں گزرے ایک سال نے میرے اندر کافی تبدیلیاں پیدا کر دی ہیں۔ اب میں دل کے بجائے' دماغ سے سوچنے بلکہ کسی قدر سمجھنے بھی لگا ہوں۔ یہ میری کم عقلی اور جہالت ہی تو تھی' جو میں چوہدری کے بیٹے کے ہاتھوں نثار بھائی کی بے عزتی برداشت نہ کر سکا اور اس پر حملہ کرنے کے جرم میں سال بھر کے لئے سلاخوں کے پیچھے جا بیٹھا۔ جہاں پہنچ کر لفظ ''آزادی'' کی حرمت کے مفہوم و معنی سے آگاہی کے علاوہ انسانوں پر گذرنے والی قیامت کو قریب سے دیکھنے' پرکھنے اور اپنے ملک کے نظام انصاف کے اندھا ہونے کا مجھے پکا یقین ہو گیا۔

میرے اور نثار بھائی کے تعلق کی عمر' میری یادداشت سے بھی بڑی ہے۔ بقول نثار بھائی' انہوں نے اپنے بچپن میں مجھے گودوں کھلایا اور پہروں رلایا ہے مگر میں نے ہمیشہ انہیں بڑا یا بزرگ سمجھنے کے بجائے دوست کے روپ میں دیکھا تھا۔ نہایت درویش صفت' میٹھے اور شفاف انسان تھے نثار بھائی۔ زندگی میں ان کا اوڑھنا بچھونا فقط محبت تھی۔ جسے وہ نہایت دریا دلی سے قرب و جوار میں بانٹتے رہتے۔ اکثر کہا کرتے ''خالق دو جہاں نے انسان کو پیدا ہی محبت کے لئے کیا ہے'' ان کے نزدیک دنیا کی سب سے بڑی عبادت خلق خدا سے بے حد و بے حساب اور بے ریا محبت تھی۔ ان کی ذات سے کبھی کسی کو کوئی رنج پہنچا نہ انہوں نے کسی کو رنج و الم میں دیکھ کر منہ موڑا۔ بڑے بوڑھوں' مریضوں' ناداروں اور بچوں کے علاوہ ہر عمر اور ہر طبقہ کے لوگوں سے ان کا میل ملاپ اور گھل مل جانا عام تھا۔ وہ سب کے دکھ سکھ میں بلا امتیاز فیاضی کا مظاہرہ کرتے اور اس حوالے سے ذاتی مال و اسباب خرچ کرنے سے کبھی دریغ نہ کرتے۔

بشری کوتاہی ہر انسان کا خاصا ہے اور یہی امر' ہمیں انسانوں کی بھیڑ میں کم تر یا برتر مقام عطا کرتا ہے۔ ہم میں سے اکثر نے اپنے چہروں پر ماسک چڑھائے ہوئے ہیں۔ ہم جو ہیں وہ نظر نہیں آتے' اور جو نظر آتے ہیں وہ ہیں نہیں۔ نثار بھائی اس آلائش سے قطعی پاک تھے وہ ظاہری طور پر جو نظر آتے تھے ان کا باطن بھی اس کے عین مطابق تھا۔ وہ قول اور فعل کے درمیان کسی بھی نوع کی منافقت کے قطعی قائل نہ تھے۔ صنف نازک کے لئے ان کے دل میں نرم گوشہ تھا؟ جسے چھپانا انہوں نے کبھی مناسب نہ سمجھا' ان کا ہر عمل ظاہرہ زریں اور ڈنکے کی چوٹ پر ہوتا تھا۔

والدین کی اکلوتی اولاد نثار بھائی' بڑی منّتوں اور مرادوں کے بعد پیدا ہوئے تھے۔ ان کی پرورش میں احتیاط اور نازک اندامی کو بڑا دخل تھا۔ پیدائش سے لے کر والدین کے فوت ہونے تک ان کی نظر اُتارنے کا سلسلہ باقاعدگی سے جاری رہا۔ بے شمار اولادوں کے ضیاع کے بعد ڈھیر سارے پیروں اور فقیروں کی دعاؤں کے طفیل زندگی پانے والے نثار بھائی کو بچپن میں اللہ کا فقیر بنا دیا گیا تھا جس کے سبب ان کے گلے اور بازوؤں پر تعویزوں کا پلندہ نمایاں طور پر نظر آتا تھا اسی باعث مزاج کے نازک اور طبیعت کے سخی تھے۔ چہرہ مہرہ' رنگ روپ' قد و قامت سبھی کچھ اللہ میاں نے فیاضی سے عطا کیا تھا۔ اسی وجہ سے بات بات پر روٹھنا اور جلد ہی مان جانا ان کے روزمرہ کے معمولات میں شامل تھا۔ ضد کا ایک پہلو بھی ان کی طبیعت میں نمایاں تھا۔ اوّل کبھی تھوڑی کم یا ایک چیز خریدنے پر اکتفا نہ کرتے مثلاً بچپن سے لے کر جوانی تک غبارے کھلونے' مٹھائی تھوک کے حساب سے خریدے جاتے۔ عذر یہ ہوتا کہ سب کے سب انہیں اچھے لگ رہے ہیں۔ کبھی اتفاق سے انہیں ان کی مطلوبہ شے نہ ملتی تو وہ اس کو دل سے لگا لیتے اور کئی کئی دن بعض اوقات تو ہفتہ دو دو ہفتہ تک نارمل نہ ہوتے تھے۔

ضعیف والدین کی ایک ہی خواہش' اپنی زندگی میں بیٹے کا سہرا دیکھنے کی تھی مگر نثار بھائی کسی طور شادی پر آمادہ نہ ہوتے تھے۔ ان کا استدلال تھا کہ پروردگار عالم نے ہمیں آزاد پیدا کیا ہے پھر ہم کسی ایک کے پابند ہو کر کیوں جئیں۔ اس طرح سے اگر نثار بھائی کے والدین آزردگی کا شکار ہوتے تو دوسری جانب ان کی امیدوار لڑکیوں میں نئی زندگی دوڑ جاتی اور وہ ایک دوسرے پر سبقت لے جانے میں وہ وہ ہتھکنڈے آزماتیں جنہیں بیان کرنے سے قبل ہمیں پسینے چھوٹنے لگتے ہیں۔

دراز قد' بھرواں جسم' لمبے بال اور کٹورا سی آنکھوں والی شکیلہ کی تعلیم گرچہ واجبی تھی مگر گھریلو کام کاج میں وہ ایسی طاق تھی کہ دور دراز سے بڑی بوڑھیاں بھی سینے پرونے کا کام اس کے پاس لے کر آیا کرتیں تھیں۔ مرزا صاحب سہاگ رات سے زن مریدی کا چولا پہن چکے تھے۔ وہ بھلا بیگم کا کہا کب ٹال سکتے تھے۔ ان کا سارا زور اپنی اکلوتی سالی شکیلہ کے لئے نثار بھائی کو گھیرنے اور بازار کے نئے نئے کھانے کھلا کر شکیلہ سے منسوب کرنے پر صرف ہوا کرتا تھا۔ اس تمام کاروائی کو ہم کتنے بھی غیر جانب دار بن کر بیان کریں' یکطرفہ نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ شکیلہ کا ذکر آتے ہی نثار بھائی کی آنکھوں میں وہی چمک آ جاتی تھی جو ایسے موقعوں پر اکثر نوجوانوں کی آنکھوں میں اتر آتی ہے۔

عید' بقرعید' شب برات' شادی بیاہ' مائیوں' مہندی کی مناسبت سے شکیلہ کے لئے تحائف خریدے اور بڑے اہتمام سے پیش کئے جاتے۔ دوستوں اور بے تکلف یاروں کی محفل میں شکیلہ کی تعریفوں کے پل بھی باندھے جاتے مگر لفظ عشق ومحبت ان کی زبان سے کبھی ادا ہوتے نہیں سنا۔

غزالہ' محلّے کی عام سی لڑکی تھی مگر صاحب! شادی کے بعد اس نے وہ رنگ وروپ نکالا کہ محلے کے لونڈے تو لونڈے بڈھے ٹھیڑے بھی دل تھام کر رہ گئے۔ وہ تو صحیح معنوں میں گدڑی میں چھپا لعل نکلی۔ کون سا حربہ تھا جو اس نے نثار بھائی کو اپنے جال میں پھانسنے کے لئے استعمال نہ کیا ہو۔ بس نثار بھائی کے ایک اشارے کی دیر تھی' پکّے ہوئے پھل کی مانند غزالہ ان کی گود میں گرنے کے لئے بے چین تھی۔ کہنے لگے ایک رات محلے کے بچے کے ذریعہ غزالہ کی والدہ نے بلا بھیجا' خلاف توقع دروازہ پہلے سے کھلا تھا۔ نثار بھائی کی چھٹی حس زور زور سے پھنکارنے لگی۔ انہوں نے گہری خاموشی اور تاریکی کا فائدہ اٹھا کر باہر کی طرف قدم اٹھانا شروع کر دیئے۔ ''کہاں چل دیئے میرے سرکار' آج تو دل کے ارمان نکالنے کا بھرپور موقع ہے۔ اماں ابا شادی پر گئے ہوئے ہیں'' پیچھے سے نثار بھائی کے گلے میں بازو حمائل کرتے ہوئے غزالہ نے کہا' کہتے ہیں ''اس کے بعد مجھے بس اتنا یاد ہے کہ میں وہاں سے سر پہ پاؤں رکھ کر دوڑا۔ میرے اور غزالہ کے درمیان مزید کیا گفتگو ہوئی۔ یہ مجھے قطعاً یاد نہیں'' ایک ہفتہ کے بخار کے بعد بستر سے اٹھے تو انہیں صرف اتنا ہی یاد تھا۔

''دنیا کا دستور ہے سفر آگے کی طرف کیا جاتا ہے۔ مگر میرا سفر بے سمت ہے' مجھے نہیں معلوم کہ میری منزل کدھر ہے'' ایک دن نہایت سنجیدگی سے دوستوں کی محفل میں بڑبڑا رہے تھے۔ ''اب کون سی نئی بات ہوگئی؟'' شہاب الدین نے لقمہ دیا۔ ''ہمارا خاندانی دھوبی شبراتی اکثر دھلے کپڑے دے جاتا ہے اور میلے لے جاتا ہے۔ پچھلے ہفتہ کپڑے بدلنے کے لئے ٹرنک کھولا تو صاف کپڑے ندارد' بے اختیار شبراتی کے گھر کی جانب چل پڑا' چوکھٹ کے بیچو بیچ شبراتی کی بہو زینت اپنے ننھے سے بچے کو ادھ کھلی چھاتی سے چمٹائے خیالوں میں گم بیٹھی تھی۔ پہلے تو میرے اندر کا شیطان' گلی محلے کے آوارہ بدمعاش کی مانند رال ٹپکائے برآمد ہوا اور چیخ چیخ کر اپنا حصہ طلب کرنے لگا پھر مجھے اپنے عمل پر خود ہی شرم آنے لگی اور میں دل ہی دل میں خود کو لعنت ملامت کرنے لگا۔ اچانک میرے اندر سے ایک ننھا منّا شیر خوار بچہ برآمد ہوگیا' بالکل زینت کی گود میں پڑے بچے کی مانند' میں نے بڑی کوشش کی کہ جس طرح میں نے اپنے اندر سے برآمد ہونے والے شیطان کو دفع دور کر دیا ہے اسی طرح بچّے کو بھی بہلا پھسلا کر کہیں غائب کر دوں مگر اس بچے کی ایک ہی ضد تھی کہ جس طرح زینت کی ایک چھاتی سے اس کا بچہ چمٹا ہوا ہے' بالکل اُسی طرح اس کی دوسری گول سڈول چھاتی سے وہ بچہ چمٹ کر اپنا حق حاصل کرے گا''

''بابو جی خیریت تو ہے؟ آپ نے کیوں تکلیف کی' کسی لونڈے لپاڑے کو بھیج دیا ہوتا' یا مجھے بلا لیا ہوتا' آپ چلیں چل کر اندر بیٹھیں' گریب کے گھر کی چائے تو جرور پی کر جائیں۔''

''وہ دن ہے اور آج کا دن' میں جب بھی جاؤں' جہاں بھی جاؤں' میرے قدم خود بخود شبراتی کے گھر کی جانب اٹھ جاتے ہیں اور عین اس کے گھر کے سامنے پہنچ کر میرے اندر کا معصوم اور ضدی بچہ برآمد ہو جاتا ہے اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مچل' مچل کر اپنی ضد دھرائے جاتا ہے۔''

جانو گھوسی کا اصل نام جان محمد تھا۔ محلّے کے سبھی گھروں میں وہ دودھ دیا کرتا تھا۔ جب بھی کوئی گاہک اس سے دودھ میں پانی کی شکایت کیا کرتا' وہ اپنے آڑے ترچھے کالے دانتوں کو نکال کر ہنستا اور بھینس کے زیادہ گھاس کھانے کا عذر پیش کرتا' جس میں پانی کی مقدار زیادہ ہونے کے سبب دودھ پتلا ہو جاتا ہے۔ گھاس کا موسم ہونے یا نہ ہونے سے اسے کوئی فرق نہ پڑتا تھا۔ سال کے بارہ مہینے وہ یہ ہی عذر پیش کیا کرتا تھا۔ جانو کی ایک ہی بیٹی تھی' زرینہ جس پر محلّے کے آدھے لڑکے فریفتہ تھے۔ زرینہ کو دیکھ کر جب بھی کوئی لڑکا آنکھ مٹکا کرنے کی کوشش کرتا' وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بغور اس کا جائزہ لیتی اگر اسے لڑکے کی نیت پر ذرا سا بھی شک ہو جاتا تو عزّت اتار کر ہتھیلی پر رکھ دیتی۔ اسی باعث محلّے کے لڑکوں نے اس کا نام منہ زور حسینہ رکھا ہوا تھا۔ نہ جانے کیوں جانو گھوسی نے نثار بھائی کے گھر خود دودھ دینے کے بجائے اپنی بیٹی زرینہ کو یہ ڈیوٹی سونپ رکھی تھی۔ خدا معلوم زرینہ کو اپنے باپ کے ارادوں کا علم تھا یا وہ بھی محلّے کی دوسری لڑکیوں کی طرح نثار بھائی پر مرمٹی تھی خالص دودھ سے لے کر گھی' مکھن' دہی' لسی کی' نثار بھائی کے گھر میں لہر بہر کی ہوئی تھی۔ جس کے سبب نثار بھائی کے دوستوں کی مونچھیں خوب تر رہا کرتیں تھیں۔ بازار میں دستیاب کون سا شوخ رنگ تھا جو زرینہ روز بدل بدل کر نثار بھائی کے سامنے آ کر نہ اتراتی۔ ہمیشہ کی طرح نثار بھائی زرینہ سے بڑے شوق سے ملتے' کبھی کبھی اس کے کپڑوں' بالوں اور چوڑیوں کی تعریف بھی کیا کرتے۔ دودھ کے پیسوں کے علاوہ کچھ مدد بھی کر دیا کرتے' جسے لینے میں زرینہ کو ہمیشہ تامل رہا۔ مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ زرینہ کی خوش فہمی حسرت میں بدل گئی' جانو گھوسی اپنی خواہش کی تکمیل کے انتظار میں اس دنیا سے کوچ کر گیا۔

پھڈّے پہلوان کے دنگل جیتنے کی خوشی میں دوستوں نے مٹھائی کا اصرار کیا' جسے پھڈّے پہلوان کی طرف سے نثار بھائی نے بخوشی پورا کیا۔ مٹھائی کے بعد گھنٹے والے کی سبز چائے' جو مٹی کے آبخورے میں مزے کے ساتھ خوشبو میں بھی اپنا شہرہ رکھتی تھی پی گئی۔ ''اس کے بعد اگر پان کا دور ہو جائے تو اسمبلی کے کورم کی طرح ہمارا کوٹہ بھی پورا ہو جائے'' میری تجویز نثار بھائی نے بخوشی مان لی۔

عمر کوئی تیس بتیس، رنگت سانولی نین نقش تیکھے، بدن چھریرا مگر لچک دار، چمکی بائی نوجوانی ہی میں بیوہ ہوگئی تھی اور اس کے دو چھوٹے چھوٹے گول مٹول بچے ماں کے دائیں بائیں اس کے حسن و جوانی کے نگہبان بنے معصومیت سے ہر آنے جانے والے کا منہ تکا کرتے تھے۔ ایسا پہلی مرتبہ ہوا تھا؟ نثار بھائی ہمارے ساتھ ہوں اور ہم پیسہ خرچ کریں۔ اس دن پان کھانے کے بعد نثار بھائی نے کافی دیر تک خاموشی اختیار کئے رکھی۔ وہ حسن کے ساتھ دو دو ننھے منّے معصوم پہرے داروں کو تکتے رہے تو میں نے موقع غنیمت جان کر جیب سے پیسے نکالے، میرا خیال تھا میرے جیب میں ہاتھ ڈالتے ہی نثار بھائی کی ڈانٹ کا سامنا کرنا پڑے گا مگر ایسا کچھ بھی نہ ہوا نثار بھائی مٹی کا بت بنے کھڑے رہے۔ میں نے پیسے دیئے بقایا واپس لئے مگر وہ اپنی جگہ گم سم کھڑے رہے۔ میں نے نثار بھائی کے انہماک پر غور سے چمکی بائی کو دیکھا تو وہ بڑی من موہنی لگ رہی تھی۔ دھانی رنگ کی ساڑھی کے ساتھ آنکھوں کے کاجل اور بالوں کے گجرے نے اسے مندر کی ایسی مورتی میں ڈھال دیا تھا جو زندگی کے بغیر بھی زندہ لوگوں کی آرزوؤں اور تمناؤں کا مرکز ہوا کرتی ہے۔

موتی کی طرح چمکنے والے دانت جلد ہی پان کی لالی سے داغ دار ہو گئے۔ نثار بھائی بلاناغہ چمکی کی دکان پر پان کھانے جایا کرتے حالانکہ پہلے دن کے بعد کبھی بھی چمکی بائی کو صاف ستھرے یا عمدہ لباس میں نہ دیکھا گیا۔ البتہ اس کے دونوں معصوم اور گول مٹول بچے پہلے سے زیادہ صاف اور ہوشیار نظر آنے لگے تھے۔ نثار بھائی پان کھانے سے پہلے ان کے لئے مٹھائی کا دونا لیجانا نہ بھولتے جسے کچھ ردوقدح کے بعد چمکی بائی نے بھی قبول کر لیا تھا۔

نثار بھائی کے معمولات سے ان کے دوست تو شاکی نہ تھے مگر کچھ بزرگوں اور اہل محلّے کی نظر میں ان کی یہ سرگرمیاں اخلاق سے گری حرکتوں میں شمار ہوتی تھیں۔ بہت سے لوگوں نے تو ان کی دماغی حالت پر شک کرنا شروع کر دیا تھا۔

اس روز چوہدری کے پوتے کا عقیقہ تھا، پورے محلّے میں جشن کا سماں تھا۔ محفل زوروں پر تھی۔ پٹاخے، فائرنگ، داد و تحسین اور رنگ برنگی منشیات کی بُو میں بہار بائی کا مجرا چل رہا تھا، لوگ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے بڑھ چڑھ کر ویلیں دے رہے تھے۔ بہار بائی کی ڈائن نما والدہ کے علاوہ قحط زدہ سازندے بھی بڑھ بڑھ کر ویلیں وصول کر رہے تھے۔ گانے کا ایک ایک مصرعہ دس دس بار میں بھی پورا نہیں ہو رہا تھا۔ بہار بائی اپنی ٹھونکواں جوانی اور لچھے دار ٹھمکوں کی خوب خوب قیمت وصول کر رہی تھی۔ چلت فلمی گانوں کی تیز دھنوں پر نوجوان لڑکے کولہے مٹکانے کے ساتھ کن انکھیوں سے زنان خانہ کی جانب حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے جبکہ بزرگ اور پکّی عمر کے لوگ کچھ ایسا منہ بنائے بیٹھے تھے جیسے گھر کی بدمزہ ہانڈی کھانے کے بعد بیٹھے ہوں۔ ''شکل سے تو جہاندیدہ لگتی ہو کچھ ہمارا بھی خیال کرو'' ایک بزرگ نے قریب سے ویلیں وصول کرنے والی بہار بائی کی پھٹکار زدہ اور بے ڈول ماں کو مخاطب کرتے ہوئے پھبتی کسی تو اس نے جا کر بہار بائی کے کان میں کچھ کہا جس کے جواب میں بہار بائی نے پہلے سے جاری گانے کو عجلت میں ختم کرتے ہوئے کھنکار کر گلا صاف کیا اور لمبی تان لگائی پھر دو تین گراری لگانے کے بعد، پکی عمر کے لوگوں سے اپنے گلے کی داد وصول کی اور اُس کے بعد نہایت سوز سے اس نے جگر مرادآبادی کی غزل کا مصرعہ پوری توجہ سے اٹھایا۔

حسن جس رنگ میں ہوتا ہے جہاں ہوتا ہے
اہل دل کے لئے سرمایۂ جاں ہوتا ہے

نوجوان تو بہار بائی کی دلبراداؤں اور منہ زور جوانی کے پہلے ہی اسیر ہو چکے تھے انہوں نے جی کھول کر نعرۂ تحسین بلند کیا۔ ساتھ ہی بزرگوں کی جانب سے بھی واہ، واہ سبحان اللہ کے شور میں اچانک نثار بھائی درمیان میں کود پڑے۔ بہار بائی کے کندھے سے کندھا اور کولہے سے کولہا ملا کر ایسے بے ڈھب طریقے سے ناچے کہ لوگ حیران رہ گئے۔

بظاہر یہ غیر معمولی بات نہیں۔ تماشبین فطرت لوگ اکثر ایسی حرکتیں کیا کرتے ہیں۔ غصہ، شرمندگی محلّے کے بزرگوں کو نثار بھائی جیسے ذمہ دار اور بردبار آدمی کے غیر ذمہ دارانہ رویہ پر تھا چنانچہ اس رات بزرگوں کی برہمی کے پیش نظر دوستوں نے نثار بھائی سے دوٹوک بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

''آج آپ کو فیصلہ کرنا ہوگا؟''

''کیسا فیصلہ؟''

''کب تک بھٹکتے رہیں گے آپ؟ ایک نہ ایک دن تو فیصلہ کرنا ہی ہوگا چاہے وہ شکیلہ، غزالہ، زینت، زرینہ، چمکی یا بہار بائی میں سے کسی کے بھی حق میں ہو؟''

''ہم کون ہوتے ہیں فیصلہ کرنے والے (آسمان کی جانب گھورتے ہوئے) ہمارا کام تو محبت کرنا ہے؟..... بے ریا..... بے مول۔''

''واہ بھئی واہ! کیا کہنے، اس سے بڑا ٹھرکی میں نے آج تک نہیں دیکھا''

نثار بھائی سے متعلق چوہدری کے بیٹے کے یہ نازیبا الفاظ مجھ سے برداشت نہ ہو سکے۔ میرے لئے خود پر قابو رکھنا ناممکن ہو گیا۔ جس کے عوض مجھے اپنی زندگی کا قیمتی ایک سال جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزارنا پڑا۔

اپنوں سے ایک سال کی طویل جدائی، اور دھرتی سے دوری کے باعث میرے جذبات و احساسات میں عجب ہلچل ہے، ایک ایک خیال، ایک ایک جذبہ، ہزار ہزار الفاظ کا طالب ہے۔ خیال پر قابو پاتا ہوں تو احساس جاگنے لگتا ہے، احساس کو قابو کرنے کی کوشش، جذبات میں بہالے جاتی ہے۔ سب کچھ بدلا بدلا، اجنبی اجنبی اور پراسرار لگ رہا ہے۔ پیشتر لوگ سراسیمگی کے

باقی صفحہ ۶۸ پر ملاحظہ کیجیے

''رفعتِ عالم''

سید مشکور حسین یاؔد
(لاہور)

کراں اندر کراں جو بیکراں موجود رہتا ہے
پھر اپنی حد میں کوئی بھی کہاں موجود رہتا ہے

بہ شکلِ رنگ و بو، سنگِ گراں موجود رہتا ہے
گُلِ نازک میں بھی زورِ تواں موجود رہتا ہے

ہر اک پرواز میں پائل بندھی ہوتی ہے پتّوں کی
پرندوں کے پروں میں آشیاں موجود رہتا ہے

ہماری ہر اُمید اک رفعتِ عالم کا ہے نقشہ
ہماری آس میں ہر آسماں موجود رہتا ہے

کسی بھی وقت ہم اپنے لئے کچھ اور ہوتے ہیں
تسلسل میں ہمارے ناگہاں موجود رہتا ہے

ہم اپنے آپ کو کس طرح اپنے سامنے لائیں
جو غائب ہے ہمارے درمیاں موجود رہتا ہے

یہی بہتر ہے ہم سے مشورہ اے یاؔد مت لیجے
ہماری رائے میں تو رائیگاں موجود رہتا ہے

ہمیں مشکوؔر تنہائی میّسر ہی نہیں آتی
جہاں ہوتے ہیں ہم، سارا جہاں موجود رہتا ہے

○

کرشن کمار طور
(دھرم شالہ، بھارت)

یہی تو کرتے ہیں سب کچھ نہ کرنے والے بھی
گذر کے رہتے ہیں آخر گذرنے والے بھی

یہ انکشاف ہوا ہم پہ ایک عمر کے بعد
الگ الگ تھے یہاں خود پہ مرنے والے بھی

کچھ اور دیر لگے گی اسے بھلانے میں
یہ زخم اتنی نہیں جلدی بھرنے والے بھی

وہ آنکھ رکھتی بھی کب تک انہیں نظر انداز
سمٹ ہی جاتے ہیں اک دن بکھرنے والے بھی

ہمیں تو درد ہی کا اک آسرا ہے بہت
ترے قریب ہیں کب یہ ٹھہرنے والے بھی

یہی تو اس کی محبت کا بس کرشمہ ہے
ہیں بیچ دریا کے یہ پار اترنے والے بھی

اب ایسی صورت حالات کو کہیں کیا طوؔر
ڈرا رہے ہیں ہمیں، ہم سے ڈرنے والے بھی

○

امین راحت چغتائی

(راولپنڈی)

وہ دیکھنے کو تو اِک پُرسکون ساحل تھا
ہر ایک موجِ بلا خیز میں بھی شامل تھا

عجیب بزم تھی جس میں ہر ایک گھائل تھا
مگر نگاہِ مکرّر کا پھر بھی سائل تھا

وظیفۂ کششِ خلق کا وُہ عامل تھا
جسے سمجھتے رہے لوگ فردِ کامل تھا

اُسے بھی سحرِ کرامات سے کیا مسحور
وہ ایک شخص جو فکر ونظر کا حامل تھا

مگر یہ کیا کہ اندھیرے سے مطمئن تھے سبھی
اگر چہ جو بھی ملا ، روشنی کا قائل تھا

گھِرے ہوئے تھے گھروندے ہی سیلِ غینی سے
مگر قصورِ شہی کو تو سیل، ساحل تھا

عجب فضا تھی کہ ہر پیکرِ سخا خود بھی
امیرِ شہر کے دستِ سخا کا سائل تھا

ہر اِک نگاہ میں تصویر بن گیا راحتؔ
وہ آدمی تھا مگر دیکھنے کے قابل تھا

○

شبنم شکیل

(اسلام آباد)

حکم نامے نئے تحریر کئے جاتے ہیں
اب یہاں خواب بھی زنجیر کئے جاتے ہیں

جس سے مل سکتا ہے مظلوم کو انصاف یہاں
اُس گواہی میں ہی تاخیر کئے جاتے ہیں

زندگی چھُپ کے ہنسا کرتی ہے ہم پر اور ہم
اُس کی پرچھائیں کو تصویر کئے جاتے ہیں

حیف، وہ طائرِ خوش رنگ کے سب جس کے لئے
دانہ ودام کی تدبیر کئے جاتے ہیں

چلتے جاتے ہیں، پہنچ پاتے نہیں پھر بھی کہیں
اور اِسے زیست سے تعبیر کئے جاتے ہیں

○

سُرور انبالوی

(راولپنڈی)

انا کا طُرۂ دستار خم ہونے نہیں دیتا
میں اپنے سائے کو بھی خود میں ضم ہونے نہیں دیتا

جُنونِ شوق اُس کے در پہ مجھ کو لے تو جاتا ہے
کِسی صورت میں پیشانی کو خم ہونے نہیں دیتا

تصوّر بھی ترا مجھ سے زمانہ چھین لیتا ہے
مگر میں پھر بھی اپنی آنکھ نم ہونے نہیں دیتا

مرے دل کی لگی سے باخبر کیسے کوئی ہوگا
میں ظاہر خود پہ بھی اپنا بھرم ہونے نہیں دیتا

ترا غم جان لیوا ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے
تری یادوں کو میرے دل سے کم ہونے نہیں دیتا

رگِ خود آگہی کو رکھدیا خودنوکِ خنجر پر
سرِ بازار میں رُسوا بھرم ہونے نہیں دیتا

جونکتہ چیں بھی ہیں میرے، جو مجھ سے کد بھی رکھتے ہیں
میں اُن سے بھی تعلق کلعدم ہونے نہیں دیتا

یہ اِنساں آدمی کو زندہ رہنے کی نہ مہلت دے
مگر میرا خدا ایسا ستم ہونے نہیں دیتا

سُرور انبالوی شیوہ ہے نامُوسِ قلم اپنا
''مجھے نامحترم میرا قلم ہونے نہیں دیتا''

نقشبند قمر نقوی بھوپالی

(ٹلسا، امریکہ)

بلبل چہکے، کوئل کوکے، اور پپیہا گائے جی
میرے شہر میں کوئی میرے گاؤں کو بھی لے آئے جی

چولی مسکے اور شانے سے آنچل ڈھلکا جائے جی
بندش دل پر، قید آنکھوں پر، لیکن جی للچائے جی

میں نے عشق چھپایا لیکن میری غزلیں بول پڑیں
یہ بھی سچ ہے گھر کا بیدی اکثر لنکا ڈھائے جی

کوّے تُو دیوار پہ میری آ کر ایسا گیت سنا
جس کا میں دیوانہ ہوں وہ بن کر مہماں آئے جی

قصد حرم اچھا ہے لیکن ایسے رستے سے جانا
جس پر بھولے بھٹکے اک بت خانہ بھی آ جائے جی

علم کی پونجی، فن کا سرمایہ تو میرے پاس نہیں
کاش مجھے گدڑی میں اپنی لعل کوئی مل جائے جی

میں نے تو قمر نقوی کو دیکھا وہ تو ایک دیوانہ ہے
کعبے جا کر روتا ہے اور بت خانے میں گائے جی

○

بی ایس جین جوہر
(میرٹھ، بھارت)

تم پڑھتے رہو مجھ کو میں لکھتا چلا جاؤں
بازار مجھے مانگے میں بکتا چلا جاؤں

شہروں میں مرے چرچے گلیوں میں مری باتیں
دیکھے تو کوئی مجھ کو میں دِکھتا چلا جاؤں

الفاظ مرے منہہ سے جو نکلیں وہ موزوں ہوں
اشعار کی بھٹّی میں یوں سِکتا چلا جاؤں

میں پھول ہوں جنگل کا، کی کس نے آبیاری
کانٹوں سے گھِرا ہوکر بھی کھلتا چلا جاؤں

برسوں سے گریزاں ہوں، مدت سے نہیں دیکھا
پڑتے ہو راستے میں تو ملتا چلا جاؤں

مُڑنا تو نہیں آتا میں ٹوٹ ہی سکتا ہوں
عزّت سے کوئی بولے تو جھکتا چلا جاؤں

دوچار گھڑی بیٹھیں تن من کی کریں باتیں
کچھ وقت ٹھہر جائے، کچھ رُکتا چلا جاؤں

آکاش کا پنچھی ہوں، اُڑنا ہی مرا جیون
طوفاں بھی اگر روکے میں اُڑتا چلا جاؤں

○

خالد حمید شیدؔا
(یو۔ایس۔اے)

جلوہ اپنا اے مری جان دکھاتے رہیے
تابِ رخسار سے اس دل کو جلاتے رہیے

ٹھیک غیروں سے تو ہے آپ کا ملنا جلنا
مجھ سے بھی آ کے مگر ملتے ملاتے رہیے

دیکھئے بزم میں اغیار کو چاہے جتنا
تھوڑی مجھ سے بھی و لے آنکھ لڑاتے رہیے

راز رنجش کا نہ کھل جائے کہیں لوگوں پر
گاہے گاہے مجھے محفل میں بلاتے رہیے

ہو سکے گر تو رقیبوں کو دکھانے کے لئے
پاس اپنے بھی مجھے آپ بٹھاتے رہیے

روئے رخشاں سے دلِ زار فروزاں کیجیے
اور امیدوں کی شمعیں آکے جلاتے رہیے

دیکھ کر مڑ کے کبھی، ہنس کے کبھی شیدؔا کو
پھول اسکے دلِ ویراں میں کھِلاتے رہیے

○

ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ

(دہلی، بھارت)

اپنے ہی شہر میں اجنبی سا ہوں
میں کہاں ہوں، کیا کہوں، سوچتا ہوں

وہی گلیاں، وہی کُوچہ بازار
تھیں شناسا کبھی، اب نا آشنا ہوں

نفس نفس اجنبی سا لگے ہے
میں تھا اِن سے کبھی، اب پرایا ہوں

جانے پہچانے ہیں ویسے سبھی چہرے
پھر کیوں اِن کو میں غیر لگتا ہوں

شہر بھر میں کوئی پہچانتا نہیں
شائد میں کوئی بہروپیا ہوں

بے مہر ہوں، لاچار ہوں تم ہی کہو!
دوستو! پہچان اپنی کھو گیا ہوں

جب نہیں آتی کسی جانب سے صدا
سوچتا ہوں میں بھی ایک دھوکا ہوں

سب دن ایک سے نہیں رہتے تشنہؔ
میں تھا کردار کبھی، اب تماشا ہوں

○

آصف ثاقب

(ایبٹ آباد)

لفظ دیتے ہیں اگر کرب عذابوں کے سوا
مرے کمرے میں دھرا کیا ہے کتابوں کے سوا

مرے دل میں تری صورت کے سوا کوئی نہیں
کچھ بھی آنکھوں میں نہیں ہے ترے خوابوں کے سوا

شدتیں مجھ پہ بگولوں کی نہیں ہیں ایسی
خار چبھتے ہیں مرے دل میں گلابوں کے سوا

کب سے رستے میں کھڑا تیری سواری دیکھوں
کو ن دیکھے گا مجھے تیرے حجابوں کے سوا

رہنماؤں کی سیاست میں بھلا اور ہے کیا
سبز باغوں کے سوا اور خطابوں کے سوا

جب سے مَٹی سے کٹا پیار کا رشتہ ثاقبؔ
درد ہوتے ہی چلے جائیں چنابوں کے سوا

کون کرتا ہے وفا مجھ سے فقیروں کے سوا
کو ن سہتا ہے ستم خانہ خرابوں کے سوا

○

غالب عرفان
(کراچی)

تاریخ کو جو شہر بسا کر دیئے گئے
تہذیب کی صفات مٹا کر دیئے گئے

مطلوب ہوگیا جو کبھی حقِّ خوں بہا
ہم ہی بطورِ قرض ادا کر دیئے گئے

جن پتھروں کو ہم نے ہٹایا تھا راہ سے
ہر میل پر وہ راہ نما کر دیئے گئے

طاقت جنہیں ملی وہ تدبّر نہ پا سکے
بے دست و پا کو ذہن عطا کر دیئے گئے

ٹھہرے تو کارواں سے بچھڑتے چلے گئے
بولے تو قافلے سے جُدا کر دیئے گئے

موسم کی آندھیوں میں گرفتار ہوگئے
طائر قفس کے جونہی رہا کر دیئے گئے

سمٹے تو تیرگی کا بھی عرفاںؔ نہ ہو سکا
پھیلے تو روشنی کی ردا کر دیئے گئے

○

انوار فیروز
(راولپنڈی)

میں کِسی کے حصار سے نکلا
عکس میرا غبار سے نکلا

پھر مقدر ہے اس کا تنہائی
جو ستارہ مدار سے نکلا

ہے صفِ دشمناں میں اب شامل
وہ ہماری قطار سے نکلا

اب کہاں میری دسترس میں ہے
لمحہ جو اختیار سے نکلا

جو منافق تھا مجھ کو چھوڑ گیا
وہ مرے اعتبار سے نکلا

اس کا پھر اعتبار ختم ہوا
جب وہ قول وقرار سے نکلا

آگ ہی آگ تھی وہاں انوارؔ
شعلہ کِس کے مزار سے نکلا

○

مہندر پرتاپ چاند
(انبالہ بھارت)

کِس موڑ پر یہ لائی ہے مُجھ کو مِری حیات؟
تڑپا رہے ہیں جی کو بِکھرے تعلّقات!

ہر دلِ اُداس اُداس ہے۔ ہر آنکھ آشکبار
کس درجہ سوگوار رہے کل بزمِ کائنات!

لاتی ہے کیا پیام نیا؟ دیکھئے سحَر
وحشت سی دِل پہ چھائی رہی ہے تمام رات

گویا میری دَسترس سے نہ تھا دُور وُہ گُلاب
چھو لینے کو ترستے رہے، پھر بھی، میرے ہات!

کیوں کر گِلہ کُروں تِری بیگانگی کا مَیں؟
مجھ میں ہی اَب رَہی نہ کوئی دِل کشی کی بات!

ہر گام پَر زمین کا ہے منظر لہُو لہُو
اب اَور کیا ہے دیکھنے کو اسے رہِ حیات!

رَقصاں ہیں ذہن میں وُہ مُرادوں کے روز و شب
پھِر یاد آرہا ہے تِرا حسنِ اِلتفات۔

مایُوس ہو نہ زیست کی محرُومیوں سے چاندؔ!
حاصِل ہوا ہے دہر میں کِس چیز کو ثبات؟

○

پروفیسر حسن عَسکری کاظمی
(لاہور)

عظمت حرف کی توقیر مری خاک میں ہے
ریزۂ خواب مرے دیدۂ نمناک میں ہے

کیا خبر تھی کہ ہدف مجھ کو بنائے گا فلک
گردشِ وقت بھی ہر لحظہ مری تاک میں ہے

دلِ وحشی پہ قیامت نہ گزر جائے کہیں
طنز کا وار بھی اب خندۂ بیباک میں ہے

کھو دیا اس نے مجھے، کھویا نہ میں نے اس کو
آج بھی اس کی طلب کتنی دلِ پاک میں ہے

میں اسے بھولنا چاہوں تو بھلاؤں کیسے
حسرتِ دید مرے سینۂ صد چاک میں ہے

ایک سیلاب سا آیا ہے زمیں پر جیسے
ڈر یہ ہے فتنہ کوئی پردۂ افلاک میں ہے

میری پہچان حسنؔ عرض ہنر سے ہوگی
افق تازہ مرے حلقۂ ادراک میں ہے

○

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی
(بھاگل پور، بہار)

زیست کا غم مآل ہے شاید
یہ بھی اپنا خیال ہے شاید

جوہری دَور میں زوالِ بشر
ارتقا کا کمال ہے شاید

دل کو ہونے لگی ہے جسم کی مانگ
عشق کا اب زوال ہے شاید

ملک میں رقص بربریت کا
آپ اپنی مثال ہے شاید

اک تغافل شعار کو بھولوں
زندگی میں محال ہے شاید

عشق کو غم دیا ہوس کو سکوں
حسن کا یہ کمال ہے شاید

دستِ حالات کے شکنجے میں
زندگی یرغمال ہے شاید

○

صفوت علی صفوت
(یو۔ایس۔اے)

الفاظ و معانی کی شفق دیکھ رہے ہیں
تحریر تری ربِّ فلق دیکھ رہے ہیں

وہ چاند جو ہو جائے گا شق دیکھ رہے ہیں
دُنیائے تمدن لق و دق دیکھ رہے ہیں

یہ عالمِ برزخ کی ہواؤں کا اثر ہے
ہر روز جو ہم قتلِ علَق دیکھ رہے ہیں

سانس ہی اب باعثِ افکارِ اُمم ہے
مذہب میں یہی ایک رَمق دیکھ رہے ہیں

ہمعصر جو بیٹھے بھی ہیں مصحف ترا لیکر
خاموش ورق پر وہ ورق دیکھ رہے ہیں

مغرب کو شکایت ہے کہ اِس دور کے ''لادن''
غاروں میں ہمالہ کے بھی حق دیکھ رہے ہیں

اس کھیت میں چڑیاں ابھی اُتریں نہیں صفوتؔ
''ماکول'' سے پہلے کا سبق دیکھ رہے ہیں

○

''For Services Rendered''

''برائے پیش کردہ خدمات''

Jeffery Deaver

- ترجمہ -

ثمینہ فرخ

(کینیڈا)

''پہلے میرا خیال تھا کہ وہ میں تھی۔۔۔مگر اب میں وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ میرا شوہر مجھے پاگل بنانے کی کوشش کر رہا ہے''

ڈاکٹر ہیری برنسٹن نے سر ہلایا اور تھوڑی دیر رکنے کے بعد بہت دل لگا کے اپنے مریض کے کہے ہوئے الفاظ اپنی گود میں رکھے ہوئے کاغذات پر منتقل کئے۔

''میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ مجھے پریشان کر کے یا عاجز کر کے پاگل بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔۔میرا مطلب ہے کہ وہ مجھے پاگل ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور ایسا وہ جان بوجھ کر کر رہا ہے''

پیسٹی رینڈولف، نے ڈاکٹر ہیری کے آفس میں رکھے چمڑے کے صوفے پر بیٹھے بیٹھے اب سر گھما کر اپنے نفسیاتی معالج کی طرف دیکھا۔باوجود اسکے، کہ ڈاکٹر اپنے پارک اوینیو آفس میں اپنے سیشنز کے دوران خاصی کم روشنی رکھا کرتا تھا، اسے اپنی مریضہ کی آنکھوں میں تیرتے آنسو نظر آ گئے۔

''تم بہت پریشان ہو'' اسنے بہت دردمندی سے کہا۔

''ظاہر ہے میں پریشان ہوں'' پیسٹی نے کہا ''اور خوفزدہ بھی''

پینتالیس، چھیالیس کے پیٹے کی کی یہ عورت کوئی دو مہینوں سے اسکے مریضوں میں شامل تھی۔بہت مرتبہ ان سیشنز کے دوران اسکی آنکھوں میں آنسو آئے تھے مگر وہ آج تک کبھی باقاعدہ روئی نہیں تھی۔آنسو کسی انسان کے جذباتی موسم کا اندازہ لگانے کا اچھا پیمانہ ہوتے ہیں۔کچھ مریض ڈاکٹر کے سامنے رونے میں سالوں بھی لگا دیتے ہیں اور جب آنکھیں پانی برسانے لگیں تو کوئی بھی سمجھدار معالج سیدھا بیٹھ جاتا ہے اور اپنی ساری توجہ اپنے مریض پر مرکوز کر دیتا ہے۔

''کہو'' اسنے حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا ''مجھے اسکے بارے میں بتاؤ''

پیسٹی نے اپنے قریب رکھے ٹشو پیپر کے باکس سے ایک ٹشو کھینچا اور اپنی آنکھوں پہ رکھ لیا مگر بڑی احتیاط سے۔ہمیشہ کی طرح اسنے بہت نفیس میک اپ کیا ہوا تھا۔

''برائے مہربانی'' ہیری نے بہت نرم آواز میں کہا۔

''اب تک ایسا کئی بار ہو چکا ہے'' اسنے بولنا شروع کیا۔''پچھلی رات سب سے خراب تھی۔میں اپنے بستر میں لیٹی تھی جب میں نے یہ آواز سنی۔پہلے پہل مجھے صاف طور پر سنائی نہیں دیا۔۔پھر اس نے کہا۔۔'' وہ بولتے بولتے ایک لمحے کو جھجک کر رکی ''اس نے کہا کہ وہ میرے والد کی روح ہے''

علاج میں صوتی معاملات اس سے بہتر نہیں ہو سکتے اور ہیری کی ساری توجہ اس پر مرکوز تھی۔

''تم خواب تو نہیں دیکھ رہی تھیں؟''

''نہیں، میں جاگ رہی تھی۔۔مجھے نیند نہیں آ رہی تھی اور میں ایک گلاس پانی پینے کے لئے اٹھی تھی۔اسکے بعد میں نے اپنے اپارٹمنٹ میں ٹہلنا شروع کر دیا، ایسے ہی یہاں سے وہاں۔مجھے عجیب سے بے چینی محسوس ہو رہی تھی۔میں اپنے بستر پر لیٹ گئی اور پھر وہ آواز۔۔۔میرا مطلب ہے میرے شوہر پیٹر کی آواز نے کہا کہ وہ میرے باپ کی روح ہے''

''اسنے کیا کہا؟''

''وہ بس بڑبڑاتا رہا۔۔کچھ کچھ بار بار۔۔میرے ماضی کی نہ جانے کون کون سی باتوں، چیزوں کے بارے میں۔۔حادثات، جب میں ایک چھوٹی سی بچی تھی۔میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔۔وہ سب سنائی دینا بہت مشکل تھا۔''

''اور یہ ساری باتیں وہ تھیں جو تمہارا شوہر جانتا تھا؟''

''ساری باتیں نہیں''۔۔اسکی آواز ایک لمحے کو لرزی ''مگر اسنے انکے بارے میں پتا لگا لیا ہوگا۔۔۔میرے خطوط، اور میری year books کی چھان بین کے ذریعے''

''تم یقین سے کہہ سکتی ہو کہ وہی تھا جو بول رہا تھا''

''وہ آواز کچھ کچھ پیٹر جیسی ہی تھی۔اور کس کی ہو سکتی ہے؟'' وہ ہنسی مگر اسکی آواز نے اسکا ساتھ نہیں دیا۔''میرا مطلب ہے۔۔۔ظاہر ہے اب وہ میرے باپ کی روح کی آواز تو ہونے سے رہی۔۔۔۔یا ہو سکتی ہے؟''

''ہو سکتا ہے وہ محض نیند میں بول رہا ہو''

وہ ایک منٹ تک کچھ نہیں بولی۔''دیکھا۔۔۔یہی تو بات ہے۔۔۔وہ اپنے بستر میں ہی نہیں تھا۔وہ اسٹڈی میں تھا۔۔کوئی وڈیو گیم کھیل رہا تھا''

ہیری نے باتیں قلمبند کرنے کا عمل جاری رکھا۔

''اور تم نے اسکو وہیں سے سنا؟''

''وہ یقیناً دروازے پر ہوگا۔۔۔اوہ ڈاکٹر۔۔۔یہ بے کار سی بات لگتی ہے۔۔۔مجھے پتا ہے۔۔مگر میرا خیال ہے کہ وہ دروازے پر جھکا ہوا تھا۔۔اسٹڈی ہمارے بیڈروم سے بالکل ملی ہوئی ہے۔۔۔وہ سرگوشیاں کر رہا تھا''

''کیا تم اسٹڈی میں گئیں؟ اس سے اسکے بارے میں پوچھا؟''

''میں دروازے تک تقریباً بھاگتی ہوئی گئی، لیکن جب تک میں نے اسے کھولا، اس وقت تک وہ اپنی میز پر واپس جا چکا تھا'' اسنے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا تو اسے پتا چلا کہ وہ ٹشو پیپر کو ریزہ ریزہ کر چکی ہے۔ اسنے کن انکھیوں سے ہیری کی طرف دیکھ کر اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ کیا وہ اسکے اس جارہانہ رویے کا جائزہ لے چکا ہے جو کہ ظاہر ہے کو وہ لے چکا تھا۔ اور پھر وہ پرزہ پرزہ ٹشو پیپر اپنے مہنگے اسکرٹ کی جیب میں ٹھونس لیا۔

''اور پھر؟''

''میں نے اس سے پوچھا اگر اسنے کچھ سنا ہو۔ کسی قسم کی آوازیں۔ تو اسنے ایسے میری طرف دیکھا جیسے میرا دماغ چل گیا ہو اور پھر اپنا گیم کھیلنے لگا''

''اور اس رات، تم نے مزید کوئی اور آوازیں نہیں سنیں''

''نہیں''

ہیری نے اپنی مریضہ کا جائزہ لیا۔ وہ یقیناً اپنی نو عمری میں خوبصورت لڑکی رہی ہو گی۔ اسنے ایسا اس لئے فرض کیا کیونکہ اب وہ ایک خوبصورت عورت تھی (معالج ہمیشہ بالغان میں انکا بچپن دیکھ لیتے ہیں)۔ اسکا چہرہ ہموار تھا اور ناک تھوڑی سی اوپر اٹھی ہوئی تھی۔ اسے یاد آیا کہ پیسٹی کے بقول وزن اسکے لئے کبھی مسئلہ نہیں رہا۔ پانچ پونڈ وزن بڑھنے کی صورت میں اسنے ہمیشہ ایک ذاتی ٹرینر کی خدمات حاصل کی تھیں۔ اسنے ایک ڈھکے چھپے غرور کے ساتھ بتایا تھا کہ مرد عام طور پہ کافی شاپس اور بارز میں اسکی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اسنے پوچھا ''تم نے کہا کہ ایسا پہلے بھی ہو چکا ہے؟ یہ آوازیں سننا؟''

ایک مرتبہ پھر جھجھک ''ہاں۔۔۔ ہوسکتا ہے دو یا تین بار۔ سب پچھلے کچھ ہفتوں کے اندر اندر''

''مگر پیٹر کیوں تمہیں پاگل بنانا چاہے گا؟''

پیسٹی نے، جو ہیری کے پاس عام ادھیڑ عمری کے مسئلے کی علامات لے کر آئی تھی، اپنے شوہر کے بارے میں ابھی تک بہت زیادہ بات چیت نہیں کی تھی۔ وہ اتنا جانتا تھا کہ وہ اچھی شکل وصورت کا ہے، پیسٹی سے عمر میں کچھ سال چھوٹا ہے، لیکن زندگی میں ترقی کرنے کی لگن نہیں رکھتا۔ انکی شادی کو تین سال ہو گئے تھے، دونوں کی دوسری شادی تھی، اور دونوں کی پسند ناپسند بہت زیادہ میل نہیں رکھتی تھی۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ صرف پیسٹی کی طرف کی کہانی تھی۔ وہ ''حقائق'' جن کا ایک معالج کے دفتر میں انکشاف ہوتا ہے، بہت زیادہ گھڑے گھڑائے بھی ہو سکتے ہیں۔ ہیری برنسٹن نے انسانی جھوٹ پکڑنے کا آلہ بننے کے لئے بہت محنت کی تھی اور اسکا خیال اس شادی کے بارے میں یہ تھا کہ دونوں میاں بیوی کے درمیان بہت زیادہ ان کہا تصادم موجود تھا۔

پیسٹی نے اسکے سوال پر غور کیا۔ ''میں نہیں جانتی۔۔۔ میں سیلی سے بات کر رہی تھی'' ہیری کو یاد آیا کہ سیلی کا ذکر پیسٹی نے اپنی سب سے اچھی دوست کے طور پر کیا تھا۔ وہ ایک اور کردار تھی۔ وہ اس طرح کی عورت تھی جو نیویارک کے سب سے بڑے بینک کے سربراہ کے ساتھ لنچ اور پھر شادی کرتی ہیں۔ ''اسنے کہا کے شاید پیٹر مجھ سے جلتا ہے۔ میرا مطلب ہے۔۔ ہماری طرف دیکھو۔ میں ہوں جسکی سماجی زندگی ہے۔ میرے دوست ہیں۔ میرے پاس پیسہ ہے۔۔۔'' ہیری نے اسکی آواز میں ایک تیزی محسوس کی۔ پیسٹی نے بھی محسوس کرتے ہوئے اس پر فوراً قابو پایا۔ ''بس مجھے نہیں معلوم وہ یہ کیوں کر رہا ہے۔۔ مگر کر رہا ہے''

''کیا تم نے اس سے اس بارے میں بات کی ہے؟''

''میں نے کوشش کی تھی۔ مگر ظاہر ہے وہ ہر بات کو رد کرتا ہے۔'' اس نے اپنا سر ہلایا اور اسکی آنکھوں میں پھر آنسو جھلکنے لگے۔ ''اور پھر۔۔۔ وہ پرندے''

''پرندے؟''

ایک اور ٹشو پیپر کھینچا گیا، استعمال اور پرزے پرزے ہوا۔ اور اس مرتبہ اسکے ثبوت چھپانے کی کوشش نہیں کی گئی۔

''میرے پاس ان سیرامک پرندوں کا مجموعہ ہے۔ Boehm کے بنائے ہوئے ہیں۔ آپ اس کمپنی کے بارے میں جانتے ہیں؟''

''نہیں''

''یہ بہت مہنگے ہوتے ہیں۔ یہ جرمن ہیں۔ بہت خوبصورتی سے بنے ہوئے۔ میرے والدین کے تھے۔ جب ہمارے والد کا انتقال ہوا تو اسٹیو اور میں نے وراثت کو تقسیم کر لیا مگر اسٹیو کو خاندان کے روائتی ورثہ کا زیادہ حصہ ملا۔ جس کا مجھے واقعی بہت دکھ ہوا، لیکن مجھے یہ پرندے مل گئے''

ہیری جانتا تھا کہ اس کی ماں کا دس سال پہلے انتقال ہو چکا تھا اور باپ کا تین سال پہلے۔ وہ آدمی بہت جابر اور سخت گیر تھا اور پیسٹی کے بڑے بھائی اسٹیفین پر خصوصی توجہ دیتا تھا، جو پیسٹی کی تمام زندگی سرپرستی کرتا آیا تھا۔

''میرے پاس ایسے چار پرندے تھے۔ ویسے تو وہ پانچ تھے مگر مجھ سے ایک اس وقت ٹوٹ گیا تھا جب میں بارہ سال کی تھی۔ میں اندر کی طرف بھاگ رہی تھی۔ میں کسی بات کی وجہ سے بہت پرجوش تھی اور اپنے والد کو اس کے بارے میں بتانا چاہتی تھی۔۔۔ اور میں میز سے ٹکرائی اور ایک پرندہ نیچے گرا دیا۔ وہ عام چڑیا، گوریا کا تھا۔ وہ ٹوٹ گیا۔ میرے والد نے مجھے ایک چھڑی سے مارا اور مجھے کھانا کھائے بغیر میرے کمرے میں بھیج دیا''

اوہ! ایک اہم واقعہ۔۔۔ ہیری نے اسے قلمبند کیا لیکن اس وقت اس قصے کو مزید نہ چھیڑنے کا فیصلہ کیا۔

''اور؟''

''اس صبح، جب میں نے پہلی بار اپنے والد کی روح کو سنا۔۔۔''اسکی آواز سخت ہوگئی''میرا مطلب ہے، وہ صبح جب پیٹر نے مجھ سے سرگوشیاں کرنی شروع کیں۔۔۔مجھے ان پرندوں میں سے ایک ٹوٹا ہوا ملا۔وہ بیٹھک کے فرش پر پڑا تھا۔میں نے پیٹر سے پوچھا کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔۔۔وہ جانتا ہے کہ یہ میرے لئے کتنے اہم ہیں۔۔اور اسنے انکار کیا۔کہنے لگا کہ میں ضرور نیند میں چل رہی ہونگی اور خود ہی توڑ دیا ہوگا۔لیکن میں جانتی ہوں کہ میں نے ایسا نہیں کیا۔ایسا صرف پیٹر ہی نے کیا ہوگا''اسکی آواز پھر مظلومانہ ہوگئی۔

ہیری نے گھڑی پر نظر ڈالی۔وہ دیکھ چکا تھا کہ وہ کتنی ابتر دکھائی دے رہی ہے۔ہاں، اسکا میک اپ بہت احتیاط سے کیا گیا تھا، لیکن اسکی قمیض کے بٹن ٹھیک سے لگے ہوئے نہیں تھے۔یا تو وہ بہت جلدی میں تیار ہوئی تھی یا اس نے اس پر توجہ ہی نہیں دی تھی۔اور اسکے مہنگے جوتوں کا ایک تسمہ ٹھیک سے بندھا ہوا نہیں تھا۔

وہ کھڑی ہوگئی''شکریہ ڈاکٹر۔۔۔کسی کو اس بارے میں صرف بتانے کے قابل ہونا بھی اچھا لگتا ہے''

''ہم سب کچھ صحیح کرلیں گے۔اگلے ہفتے ملاقات ہوگی''

پیسٹی کے دفتر سے جانے کے بعد، ہیری برنسٹن اپنی میز پر بیٹھا رہا۔وہ اپنی کرسی پر آہستہ آہستہ گھوما۔اپنی کتابوں کو دیکھتا رہا۔پھر کھڑکی سے باہر سہ پہر کی ڈھلتی دھوپ کو گاڑیوں اور ٹیکسیوں پر گرتے دیکھتا رہا۔

ایک پرندہ کہیں قریب سے اڑا۔

اسنے پیسٹی کے بچپن میں ٹوٹے ہوئے سیریمک سے بنے گوریا کے بارے میں سوچا۔

اور اس نے سوچا۔۔کیسا خاص الخاص سیشن رہا۔

صرف اسکی مریضہ کے لئے ہی نہیں۔بلکہ اس کے اپنے لئے بھی۔

پیسٹی رنڈولف، جو آج تک ایک اور ادھیڑ عمر کی بولائی ہوئی، پریشان مریضہ تھی، ڈاکٹر ہیرولڈ ڈیوڈ برنسٹن کے سامنے ایک خاص واقعہ پیش کرچکی تھی۔وہ اسکی ساری زندگی مکمل طور پر تبدیل کردینے کے قابل تھا۔

اور ایسا کرنے کے دوران، شاید اپنی زندگی بھی۔

ہیری نے بلند قہقہہ لگایا، اور اپنی کرسی پر کسی کھیل کے میدان میں کھیلتے بچے کی طرح گھوما۔ایک بار، دوبار، تین بار۔

دروازے پر ایک شبیہہ نمودار ہوئی۔''ڈاکٹر؟''مریم، اسکی سیکریٹری نے اپنے سفید بالوں سے ڈھکا سر اندر ڈال کے جھانکا۔''آپ ٹھیک تو ہیں؟''

''میں ٹھیک ہوں۔تم کیوں پوچھ رہی ہو؟''

''وہ۔۔۔بس ایسے ہی۔۔۔میرا خیال نہیں کہ میں نے آپ کو ایک لمبے عرصے سے ہنستے سنا ہو۔میرا خیال نہیں کہ میں نے آپ کو کبھی بھی اپنے دفتر میں ہنستے سنا ہو''

یہ ایک مرتبہ پھر ہنسنے کا موقع تھا اور وہ ہنسا۔

مریم نے سانس بھری۔اسکی آنکھوں میں تشویش تھی۔

ہیری نے مسکرانا بند کیا۔اسکی طرف سنجیدگی سے دیکھا۔''دیکھو۔۔میں چاہتا ہوں کہ تم باقی دن کی چھٹی کرو''

وہ متعجب ہوئی''مگر یہ تو ویسے بھی گھر جانے کا وقت ہوگیا ہے ڈاکٹر''

''مذاق''اسنے وضاحت کی''مذاق تھا یہ۔۔۔کل ملیں گے''

مریم نے اس پر ایک محتاط نظر ڈالی۔ایسا لگتا تھا کہ اسکے لئے اپنے چہرے پر چھائے تعجب کے تاثرات ہٹانا ممکن نہیں تھا۔''آپ کو یقین ہے آپ بالکل ٹھیک ہیں''

''میں ٹھیک ہوں۔شب بخیر''

''شب بخیر ڈاکٹر''

ایک لمحے بعد اسنے دفتر کا بیرونی دروازہ بند ہونے کی آواز سنی۔کلک۔

وہ اپنی کرسی پر ایک اور بار گھوما۔۔۔سوچ میں گم۔۔پیسٹی رانڈولف۔۔۔میں تمہیں بچا سکتا ہوں اور تم مجھے بچا سکتی ہو۔

اور ڈاکٹر ہیری برنسٹن وہ آدمی تھا جسے بچت کی اشد ضرورت تھی۔

کیونکہ اسے نفرت تھی اس سے، جو اس نے زندہ رہنے کے لئے آج تک کیا تھا۔

دماغی اور جذباتی مسئلوں کا شکار مریضوں کی مدد کرنے کا کام نہیں۔۔اوہ۔۔وہ تو ایک پیدائشی معالج تھا۔اس سے بہتر تو کچھ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔جس سے اسے نفرت تھی وہ تھا اس کا مشرقی نفسیاتی کلینک۔یہ وہ آخری چیز تھی جو وہ کبھی بھی کرنا چاہتا تھا۔مگر اپنے میڈیکل کالج کے دوسرے سال میں لمبے، وجیہہ طالب علم کی ملاقات جدید فنون کے عجائب گھر کی دراز قد اور خوبصورت اسسٹنٹ ڈائریکٹر سے ہوگئی۔ہیری اور لنڈا کی شادی اسکی انٹرنشپ شروع ہونے سے پہلے ہو چکی تھی۔اپنے گھر سے وہ اسکے ٹاؤن ہوم منتقل ہوگیا تھا۔کچھ ہی ہفتوں کے اندر اندر لنڈا نے اسکی زندگی تبدیل کرنا شروع کردی تھی۔وہ ایک ایسی عورت تھی جسکو اپنے مرد سے انتہائی اعلی توقعات ہوتی ہیں (بالکل پیسٹی کی طرح، جس نے کچھ ہفتے پہلے اپنے شوہر کے اندر لگن اور امنگ کی کمی کے بارے میں سرسری سا تبصرہ کیا تھا اور ہیری نے اسکی آنکھوں میں غصے کی جھلک دیکھی تھی)۔لنڈا کو پیسہ درکار تھا۔اسکو زندگی کی آسائیشوں سے لگاؤ تھا۔اسکو پیرس، اور مونا کو کے مہنگے ریسٹورنٹس میں اپنی آؤ بھگت چاہئے تھی۔

ایک قناعت پسند، سہل طبیعت، اور نیویارک کے عام علاقے میں پلے بڑھے ہیری کو معلوم تھا کہ لنڈا کے کہے کو ماننے سے وہ ایک بالکل غلط رخ پہ جارہا تھا۔لیکن وہ اس سے محبت کرتا تھا، اس لئے اسے سنے لے گیا۔انہوں نے

ایک مہنگے ترین علاقے میں بڑا سا گھر خریدا اور اسنے اپنے نام کی پلیٹ ایک تین ہزار ڈالر ماہانہ کرائے کے شاندار آفس کے باہر ٹانگ دی۔

پہلے پہل، اس آفس کے لمبے چوڑے بلوں کی آمد نے اس کو فکر مند کیا لیکن جلد ہی پیسے نے اندر کی طرف اپنا بہاؤ شروع کر دیا۔ اسے اپنا کاروبار جمانے میں ذرا بھی دقت نہ ہوئی۔ امیروں میں اسکے مطلب کے لوگوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ اپنے کام میں وہ ویسے ہی ماہر تھا۔ اسکے مریض آتے، اسے پسند کرتے اور پھر ہفتہ وار آتے۔

انکی پریشانیاں اور مسائل اکثر تو اتنے معمولی ہوتے کہ ان کے اوپر ہنسنے کو دل چاہتا۔ لیکن اپنے پیشے سے کیا گیا وعدہ اور اسکی شخصیت اسے ایسا کرنے اور اپنے مریضوں کو غیر اہم سمجھنے سے باز رکھتی۔ اپنے مریضوں کی مدد کرنے کے لئے وہ جان توڑ محنت کرتا۔

اور اس تمام عرصے میں، اسنے وہ سب بھلائے رکھا، جو وہ اصل میں چاہتا تھا۔ جو انتہائی سنجیدہ دماغی مسائل کے مریضوں کے ساتھ کام کرنا تھا۔ لوگ، خطرناک ذہنی دباؤ اور دہری شخصیات کا شکار لوگ، جو غم زدہ زندگیاں گزار رہے تھے اور اس غم سے امیروں کی طرح پیسے کی آڑ میں چھپ نہیں سکتے تھے، جیسے ہیری کے مریض کر رہے تھے۔

کبھی کبھی وہ مختلف کلینکس میں رضا کارانہ طور پر کام کرتا، بالخصوص بروکلین کے ایک بے گھر مردوں اور عورتوں کے لئے قائم چھوٹے سے کلینک میں۔ لیکن اپنے عالیشان آفس کے کام کے بوجھ اور اپنی بیوی کی سماجی مصروفیات کی وجہ سے وہ اس کلینک کو زیادہ وقت نہیں دے پاتا تھا۔ کبھی کبھی وہ سوچتا کہ اپنے آفس کے کچھ گھنٹے کم کر دے، اور ظاہر ہے کہ اگر وہ ایسا کرتا تو اسکی آمدنی خطرناک حد تک کم ہو جاتی۔ انکی دو پیاری بیٹیاں تھیں، جن سے وہ شدید محبت کرتا تھا۔ اور انکی ضرورتیں۔۔۔ بہت ''مہنگی'' ضرورتیں۔۔ پرائیوٹ سکول قسم کی ضرورتیں۔۔ اسکی ذاتی خواہشات پر حاوی آجاتیں۔ ویسے بھی، وہ جانتا تھا کہ لنڈا اسے ایک لمحے میں اپنی زندگی سے نکال دے گی اگر اسنے اس بروکلین کے چھوٹے سے آفس میں کل وقتی کام کرنا شروع کر دیا تو۔

لیکن حقیقت یہ تھی کہ جب لنڈا نے اسے ایک زیادہ دولت مند شخص کے لئے واقعی چھوڑ دیا، تب بھی وہ اس کلینک میں زیادہ وقت گزارنے سے اسی طرح قاصر تھا جس طرح شادی شدہ زندگی میں۔ قرضے کا ایک انبار تھا جو لنڈا اسکے لئے چھوڑ گئی تھی۔ اسکی بڑی بیٹی ایک مہنگے کالج میں پڑھ رہی تھی اور چھوٹی والی بھی اگلے سال ایک مہنگے کالج کا رخ کرنے والی تھی۔

اور، درجنوں مایوس کن مریضوں میں سے پیسٹی رینڈولف وہ تھی، جو سچی، ضرورت مند مریضہ تھی۔ ایک عورت جو اسے بھوتوں اور روحوں کے بارے میں بتا رہی تھی۔ اپنے شوہر کے بارے میں جو اسے پاگل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک عورت جو واضح طور پہ انتہا پر تھی۔

ایک مریضہ، جو بالآخر اس کو اپنی زندگی کو بدل دینے کا موقع دے سکتی تھی۔

اس رات، اسنے رات کے کھانے کا تکلف نہیں کیا۔ گھر آ کے وہ سیدھا اپنی اسٹڈی میں چلا گیا۔ جہاں سالوں کے جمع شدہ پیشہ ور جریدوں کا انبار رکھا تھا جنہیں پڑھنے کی اسنے اس لئے کبھی زحمت نہیں کی تھی کیونکہ وہ تمام انتہائی سنجیدہ دماغی اور نفسیاتی مسائل کیساتھ معاملہ کرتے تھے جو ہیری کے مریضوں کے لئے کسی کام کے نہیں تھے۔ اسنے اپنے جوتے اتار کر ایک طرف اچھالے اور ان کی ورق گردانی اور اہم باتیں لکھنے میں مصروف ہو گیا۔ اسے کچھ ایسی انٹرنٹ سائیٹس کے پتے بھی ملے جہاں سے اسکو نفسیاتی برتاؤ کے بارے میں معلومات مل سکتی تھیں، اور اسنے گھنٹوں کمپیوٹر پر وہ مضمون چھاپنے میں گزار دیئے جو اسکی پیسٹی کی صورت حال سمجھنے میں مددگار ثابت ہو سکتے تھے۔

ہیری اب ایک ایسا مضمون دوبارہ پڑھ رہا تھا جس نے اسے پُر جوش کر دیا تھا۔۔ یہ مضمون پیسٹی کے سلسلے میں انتہائی مددگار تھا۔ نہ جانے کب تک وہ اس میں غرق رہا کہ اسے ایک سیٹی کی سی آواز سنائی دی۔۔۔ کیا وہ اتنا کام میں منہمک رہا تھا کہ اسنے چولہے پہ چائے کی کیتلی رکھی اور بھول گیا؟ لیکن جب اسنے کھڑکی سے باہر دیکھا تو اسے معلوم ہوا کہ وہ کیتلی کی آواز نہیں تھی بلکہ ایک پرندے کی تھی جو درخت کی شاخ پہ بیٹھا چہچہا رہا تھا۔ صبح ہو چکی تھی۔

اپنی اگلی ملاقات میں پیسٹی پچھلی مرتبہ سے زیادہ بدتر لگ رہی تھی۔ اسکے کپڑے استری شدہ نہیں تھے۔ اسکے بال اجڑے ہوئے اور کئی دن کے گندے لگ رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ اسکے کپڑے پر دھول کی لکیریں پڑی ہوں۔ اسکے موزے گندے اور کہیں کہیں سے دھاگے نکلے ہوئے تھے۔ ہاں، البتہ اسکا میک اپ اب بھی انتہائی محنت اور توجہ سے کیا گیا تھا۔

''ہیلو ڈاکٹر'' اسنے نرم آواز میں کہا۔

''ہیلو پیسٹی۔۔۔ اندر آجاؤ۔۔۔ نہیں آج صوفے پہ نہیں، بلکہ یہاں میرے سامنے بیٹھ جاؤ''

''کیوں؟'' وہ ہچکچائی

''میرا خیال ہے کہ ہمیں اپنا عام کام فلحال ملتوی کر دینا چاہئے اور صرف اس تشویش ناک معاملے پہ توجہ دینی چاہئے۔۔۔ آوازوں کی بارے میں۔ میں تمہیں آمنے سامنے دیکھنا چاہوں گا''

''تشویش ناک؟'' اسنے اس لفظ کو اسکے سامنے رکھی آرام کرسی پہ بیٹھتے ہوئے عجیب طرح سے دہرایا۔ اسنے اپنے بازو باندھ لئے، اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ ان سارے جسمانی زبان کے پیغامات ہیری اچھی طرح پہچانتا تھا۔ اسکا مطلب تھا کہ وہ نروس ہے اور مدافعتی موڈ میں ہے۔

''اب۔۔ کیا ہو رہا ہے۔۔۔ جب میں نے تمہیں آخری بار دیکھا تھا اسکے بعد؟'' اسنے پوچھا۔

اسنے اسے بتایا۔مزید آوازوں کے بارے میں۔۔اسکا شوہر اب بھی اسکے والد کا بھوت یا روح بننے کی کوشش میں مصروف تھا۔اسکے ساتھ عجیب و غریب سرگوشیوں کا کھیل کھیلنے میں۔''کیا؟''ہیری نے پوچھا''روح نے کہا''اسنے جواب دیا''کتنی بری بیٹی تھی وہ۔کتنی بیکار بیوی تھی وہ اور کتنی سطحی دوست تھی وہ۔۔۔آخر وہ اپنی زندگی ختم کر کے دوسروں کی زندگیوں کو اجیرن بنانے کا کام ختم کیوں نہیں کر دیتی''

ہیری نے کاغذات پہ کچھ لکھا۔۔''کیا وہ تمہارے والد کی آواز لگ رہی تھی؟انداز۔۔۔میرا مطلب ہے''

''میرے والد نہیں''۔۔۔اسنے ناراضگی سے کہا۔''وہ میرا شوہر تھا۔۔۔میرا باپ بنا ہوا۔۔۔میں تمہیں بتا چکی ہوں''

''میں جانتا ہوں۔لیکن وہ آواز۔۔۔اسکا انداز؟''

اسنے سوچا''ہوسکتا ہے۔لیکن میرا شوہر اس سے مل چکا ہے۔اور ہمارے پاس والد کے گھر میں ویڈیوز بھی ہیں۔اسنے یقیناً انہیں سن کر ویسا انداز اور آواز اپنانے کی کوشش کی ہے۔''

''پیٹر کہاں تھا جب تمہیں یہ آوازیں سنائی دیں؟''

اسنے کتابوں کی الماری کا جائزہ لیا''وہ باقاعدہ گھر پہ نہیں تھا''

''نہیں تھا؟''

''نہیں۔۔۔وہ باہر سگریٹ خریدنے گیا ہوا تھا۔لیکن میں نے بوجھ لیا ہے کہ یہ سب اسنے کیسے کیا ہوگا۔اسنے ضرور کسی اسپیکر،ٹیپ رکارڈر یا وہ۔۔۔واکی ٹاکی قسم کی چیزوں کا سہارا لیا ہوگا''اسکی آواز ہلکی ہوگئی۔

''اسکے علاوہ پیٹر اچھا نقل باز بھی ہے۔اچھے تاثرات کے ساتھ نقلیں اتارنا۔۔تو اسنے ساری آوازیں پیدا کر لی ہونگی''

''ساری آوازیں؟''

اسنے اپنا حلق صاف کیا۔''اس مرتبہ ایک سے زیادہ روحیں تھیں''اسکی آواز پھر بلند ہوگئی اپنے آپ''میرے دادا۔۔میری ماں۔۔۔دوسرے۔۔نہ جانے کون کون تھے''پیسٹی نے ایک لمحے کو اسکی طرف دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔پھر اپنا پرس کھولا،اندر جھانکا اور اپنی لپ اسٹک اور پاؤڈر نکال لیا۔انکی طرف کچھ دیر تک دیکھا اور پھر انہیں دور ہٹا دیا۔اسکے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

ہیری نے ایک طویل لمحے انتظار کیا۔''پیسٹی۔۔میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں''

''تم مجھ سے کچھ بھی پوچھ سکتے ہو ڈاکٹر''

''اچھا فرض کرو۔۔۔صرف بحث کے لئے۔۔۔کہ پیٹر روح بننے کی کوشش نہیں کر رہا ہے۔تو پھر یہ آوازیں کہاں سے آ سکتی ہیں؟''

وہ غصے سے پھنکاری''تم میرے ایک لفظ پر بھی یقین نہیں کرتے۔۔۔ہیں نا؟''

کسی معالج کے لئے سب سے مشکل کام یہ ہوتا ہے کہ اپنے مریضوں کو اس دوران جب کہ سچ جاننے کی کوشش کر رہا ہو،یہ باور کروا سکے کہ وہ انکی ہی طرف ہے۔اسنے عام سے لہجے میں کہا''یہ بالکل ممکن ہے۔۔جو تم کہہ رہی ہو اپنے شوہر کے بارے میں۔۔۔لیکن کچھ دیر کو اسے ایک طرف رکھ کر ان آوازوں کے سنائی دینے کی کسی اور وجہ کے بارے میں غور کرو''

''جیسے کہ؟''

''جیسے تم نے کچھ سنا۔۔۔ممکن ہے اپنے شوہر کو فون پر بات کرتے ہوئے۔۔۔ہوسکتا ہے ٹی وی،یا ریڈیو۔۔۔لیکن یہ جو بھی ہے اسکا روحوں یا بھوتوں کے ساتھ کچھ لینا دینا نہیں ہے۔تم اپنی سوچوں کو ان آوازوں میں ڈھال رہی ہو جو تمہیں سنائی دے رہی ہیں''

''تمہارا مطلب ہے کہ یہ سب میری ذہنی خرافات ہے''

''میں یہ کہہ رہا ہوں کہ ہوسکتا ہے کہ یہ الفاظ تمہارے لاشعور کی آواز ہوں۔اس کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟''

اس نے اس پر ایک لمحے غور کیا''میں نہیں جانتی۔۔۔ایسا ہوسکتا ہے۔میں یہ فرض کر لیتی ہوں کہ اس میں کچھ عقل کی بات ہے''

ہیری مسکرایا''بہت خوب۔پیسٹی۔یہ اسے تسلیم کرنے کا بہت اچھا پہلا قدم ہے''

ایسا لگا جیسے اسے یہ بہت اچھا لگا۔ایک ایسے طالب علم کی طرح جسے اسکے استاد کی جانب سے سنہرا ستارا ملا ہو۔

اسکے بعد،معالج نے پھر سنجیدگی اوڑھ لی''اب ایک بات۔۔۔جب وہ آوازیں تمہیں اپنے آپ کو کوئی تکلیف پہچانے کے بارے میں بات کریں تو تم انکو نہیں سنو گی۔۔۔ٹھیک ہے؟''

''نہیں۔۔میں نہیں سنوں گی''اسنے ایک دلیر مسکراہٹ پیش کی''بالکل نہیں''

''شاباش''اسنے گھڑی کی طرف اچٹتی ہوئی نظر ڈالی۔''میں دیکھ رہا ہوں کہ ہمارا آج کا وقت بالکل ختم ہونے کو ہے پیسٹی۔میں چاہتا ہوں کہ تم ایک کام کرو۔میں چاہوں گا کہ تم ایک ڈائری رکھو اور اس میں وہ ساری باتیں لکھو جو وہ آوازیں تم سے کرتی ہیں''

''ڈائری؟ٹھیک ہے''

''تمہیں اس میں وہ سب لکھنا ہے جو تمہیں سنائی دے اور پھر ہم ساتھ بیٹھ کر ان پہ غور کریں گے''

وہ کھڑی ہو کر اسکی طرف مڑی۔''ہوسکتا ہے میں کسی روح سے کہوں کہ وہ میرے ساتھ ان مجالس میں آئے۔۔۔لیکن پھر تمہیں مجھ سے دوہرا معاوضہ لینا پڑے گا۔۔ہیں نا؟''

وہ ہنسا''اگلے ہفتے ملیں گے''

اگلی صبح تین بجے ہیری فون کی گھنٹی سے بیدار ہوا۔

''ڈاکٹر برنسٹن؟''

''جی ہاں''

''میں آفیسر ڈیوڈ بات کر رہا ہوں پولیس اسٹیشن سے''

بستر سے اٹھتے ہوئے نیند کو سر جھٹک کر بھگانے کی کوشش کے دوران اسکو اپنے مریض ہرب کا خیال آیا۔ اسکے بروکلین آفس کا یہ مریض انتہائی بے ضرر ہوتے ہوئے بھی اپنے جارحانہ رویئے اور خراب ذہنی حالت کی وجہ سے ہر وقت مصیبت میں گرفتار رہتا تھا۔

لیکن ٹیلی فون کال آنے کی یہ وجہ نہیں تھی۔

''آپ محترمہ پیٹریشیا رینڈولف کے نفسیاتی معالج ہیں۔ کیا میں صحیح کہہ رہا ہوں''

اسکا دل زور سے دھڑکا ''ہاں۔۔۔ میں ہی ہوں۔ وہ ٹھیک تو ہے''

''ہمیں ایک کال موصول ہوئی تھی۔ اسکو ہم نے اسکی اپارٹمنٹ بلڈنگ کے باہر سڑک پر پایا۔ کوئی زخمی تو نہیں ہے لیکن وہ کچھ تھوڑی سی ہسٹیریائی کیفیت میں ہے''

''میں ابھی آتا ہوں''

جب ہیری اس بلڈنگ کے پاس پہنچا تو اسنے پیسٹی اور اسکے شوہر کو راہداری میں کھڑے پایا۔ ایک باوردی پولس افسر بھی ان کے ساتھ کھڑا تھا۔

ہیری جانتا تو تھا کہ رینڈولف امیر لوگ ہیں لیکن یہ بلڈنگ اس کی توقعات سے بہت بڑھ کر تھی۔

''ڈاکٹر'' پیسٹی نے اسے دیکھ کر روتے ہوئے کہا۔ وہ اسکی طرف بھاگی۔ ہیری اپنے مریضوں کے ساتھ کسی قسم کے جسمانی لمس کے بارے میں بہت محتاط تھا۔ وہ ایک معالج اور اسکے مریضوں کے درمیان پیدا ہونے والی عام، روایتی کشش کے بارے میں تو جانتا ہی تھا لیکن جسمانی لمس کے ساتھ بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت تھی۔ ہیری نے اسے بازوؤں سے تھام لیا تاکہ وہ اسکے گلے نہ لگ سکے اور نرمی سے لاکر واپس راہداری میں رکھے صوفے پر بٹھادیا۔

''رینڈولف صاحب؟'' ہیری نے اسکے شوہر کی طرف مڑتے ہوئے پوچھا۔

''جی ہاں''

''میں ہیری برنسٹن ہوں''

دونوں مردوں نے ہاتھ ملایا۔ پیٹر ویسا ہی تھا جیسا ہیری کو اس کے متعلق اندازہ تھا۔ وہ ایک کھلاڑیوں جیسے چھریرے بدن کا چالیس کے لگ بھگ آدمی تھا۔ وجیہہ۔ اسکی آنکھیں غصیلی ہو رہی تھیں۔ اسے دیکھ کر ہیری کو اپنے ایک اور مریض کا خیال آیا جسکی شکایت یہ تھی کہ اسے اپنی بیوی اور دو محبوباؤں کے ساتھ زندگی برتنے میں مشکل پیش آرہی تھی۔

''تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں اگر میں پیسٹی سے اکیلے میں بات کرنا چاہوں تو؟''

''نہیں۔ اگر میری ضرورت پیش آئے تو میں اوپر موجود ہوں'' اسنے ہیری اور پولیس آفیسر دونوں سے کہا۔

ہیری نے بھی افسر پر نگاہ ڈالی اور وہ بھی اسے اسکی مریضہ کے ساتھ تنہائی میں بات کرنے کا موقع دینے کے لئے ایک طرف ہوگیا۔

''کیا ہوا؟'' اسنے پیسٹی سے پوچھا۔

''پرندہ'' اسنے دوبارہ آنسو بہاتے ہوئے کہا۔

''ان سیریمک پرندوں میں سے ایک؟''

''ہاں'' اسنے سرگوشی کی ''اسنے اسے توڑ دیا''

ہیری نے اسکا ایک محتاط جائزہ لیا۔ آج وہ بہت ہی ابتر حالت میں تھی۔ گندے بال، میلکجے کپڑے، اور غلیظ ناخن۔ بالکل اسکے پچھلے دن کی ملاقات کی طرح۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس دن اس کا میک اپ ہمیشہ کی طرح بہترین تھا۔

''مجھے بتاؤ۔۔ کیا ہوا؟''

''میں سو رہی تھی جب میں نے اس آواز کو یہ کہتے سنا ''بھاگو۔۔۔ تمہیں باہر نکل جانا چاہئے۔ وہ تقریباً پہنچنے ہی والے ہیں۔ وہ تمہیں تکلیف دینے والے ہیں'' اور میں بستر سے کودی اور سیدھی بیٹھک کی طرف بھاگی۔۔۔ اور وہاں۔۔ وہاں وہ پرندہ تھا۔ روبن۔۔ ٹوٹا پھوٹا، سارے فرش پر بکھرا ہوا۔ میں نے چیخنا شروع کردیا۔۔۔ کیونکہ مجھے پتا تھا کہ وہ میرے پیچھے تھے'' اسکی آواز بلند ہوگئی ''روحیں۔۔۔ وہ۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ پیٹر میرے پیچھے تھا۔ میں نے اپنا گاؤن لپیٹا اور فرار ہوگئی''

''اور پیٹر نے کیا کیا؟''

''وہ میرے پیچھے بھاگا''

''لیکن اس نے تمہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچائی؟''

وہ ہچکچائی ''نہیں'' اسنے اپنے اطراف ٹھنڈی راہداری کو خالی نظروں سے دیکھا ''خیر۔۔۔ اس نے جو کیا وہ پولیس کہ مطلع کرنا تھا۔ لیکن کیا تمہیں نظر نہیں آتا؟ پیٹر کے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ اسے پولیس کو تو مطلع کرنا ہی تھا۔ کیا ہر وہ شخص جس کی بیوی اپنے گھر سے چیختی ہوئی باہر بھاگ جائے۔ ایسا ہی نہیں کرے گا؟ ان کو نہ بتانا مشکوک ہوسکتا تھا۔۔۔'' اسکی آواز ڈوب گئی۔

ہیری نے شراب نوشی یا دواؤں کی زیادتی کی علامات دیکھنے کی کوشش کی۔ اسے ایسا کچھ نظر نہیں آیا۔

پیسٹی نے اپنے اطراف ایک بار پھر نظر ڈالی۔

''کیا اب تم بہتر محسوس کر رہی ہو''

اسنے سر ہلایا ''میں معذرت خواہ ہوں۔'' اسنے کہا۔ ''تمہیں رات کے وقت یہاں اس طرح بلانے پر''

''اور میں اسی لئے یہاں ہوں۔۔۔مجھے بتاؤ۔۔۔تمہیں اب تو کوئی آوازیں سنائی نہیں دے رہیں۔۔۔کیوں؟''

''نہیں''

''اور وہ پرندہ؟ کیا یہ کوئی حادثہ ہوسکتا ہے؟''اس نے اس بارے میں ایک لمحے کوسوچا۔''اچھا۔۔پیٹر سور ہا تھا۔۔۔ہوسکتا ہے کہ میں نے اسے کبھی پہلے دیکھنے کے دوران میز کے کنارے پہ چھوڑ دیا ہو''اسنے بالکل معمول کے لہجے میں کہا۔''ہوسکتا ہے کہ نو کرنے ایسا کیا ہو۔ہوسکتا ہے کہ میں اس سے ٹکرا گئی ہوں۔''

پولیس افسر نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا اور قریب آتے ہوئے بولا''کیا میں تم سے کچھ بات کرسکتا ہوں،ڈاکٹر''

وہ دونوں راہداری کے ایک کونے میں کھڑے ہوگئے۔

''میرا خیال ہے کہ مجھے اسے پولیس سٹیشن لے جانا پڑے گا۔یہ کچھ دیر پہلے بہت ہی آپے سے باہر ہورہی تھی۔مگر یہ تمہارے اوپر ہے۔کیا تمہارے خیال میں یہ''ED''ہے؟''

جذباتی پریشانی۔۔۔ایک تشخیص۔۔۔اگر وہ ہاں کہہ دیتا تو پیسٹی کو سیدھا اسپتال میں لے جا کر داخل کروادیا جاتا۔

یہ ایک بہت نازک لمحہ تھا۔ہیری مخمصے میں تھا۔

۔۔۔۔میں تمہاری مدد کرسکتا ہوں اور تم میری۔۔۔۔۔

اسنے پولس افسر سے کہا''مجھے ایک منٹ دو''

وہ پیسٹی کی طرف واپس آیا۔اس کے پاس بیٹھ گیا۔''ایک مسئلہ ہے۔پولیس تمہیں اسپتال لے جانا چاہتی ہے۔اور اگر تم یہ دعوی کرو کہ پیٹر تمہیں پاگل کرنے کی کوشش کر رہا ہے یا تکلیف پہچانا چاہتا ہے تو حقیقت یہ ہے کہ جج تمہاری باتوں پہ یقین کرنے والا نہیں ہے''

''میں؟ میں تو کچھ نہیں کر رہی۔یہ تو وہ آوازیں ہیں۔یہ وہی ہیں۔۔میرا مطلب۔۔۔یہ پیٹر ہے''

''مگر یہ تمہارا یقین نہیں کریں گے۔بس ایسا ہی ہے۔اب یا تو تم اوپر چلی جاؤ اور اپنی زندگی اسی طرح گزارتی رہو یا یہ تمہیں اسپتال لے جائیں گے۔اور ایسا تم نہیں چاہتیں۔میرا یقین کرو۔کیا تم اپنے آپ کو سنبھال سکتی ہو؟''

اس نے اپنے ہاتھوں پہ اپنا سر گرالیا''ہاں ڈاکٹر۔۔میں ایسا کرسکتی ہوں''

''شاباش پیسٹی۔۔۔میں تم سے کچھ اور بھی پوچھنا چاہتا ہوں۔میں تمہارے شوہر سے تنہائی میں ملنا چاہتا ہوں۔کیا میں اسے فون کر کے آنے کے لئے کہہ سکتا ہوں؟''

''کیوں''اسکا چہرہ شک سے بھر گیا۔

''کیونکہ میں تمہارا ڈاکٹر ہوں اور میں اس بات کی تہہ تک پہنچنا چاہتا ہوں جو تمہیں پریشان کر رہی ہے''

پیسٹی نے پولیس والے کی طرف دیکھا۔پھر ہیری سے کہا''ضرور''

''بہت خوب''

جب پیسٹی لفٹ میں چلی گئی تو پولس افسر نے کہا''میں نہیں جانتا ڈاکٹر۔۔مگر یہ تو مجھے بالکل پاگل لگتی ہے۔۔۔اس طرح کی چیزیں۔۔۔یہ لوگ واقعی بہت بھونڈے ہوسکتے ہیں۔میں نے ایسا ہوتے لاکھوں بار دیکھا ہے''

''اس کے ساتھ کچھ مسئلہ ہے لیکن یہ خطرناک نہیں ہے''

''تم واقعی یہ موقع لینا چاہتے ہو؟''

ایک لمحے بعد اسنے جواب دیا''ہاں۔۔میں یہ موقع لینا چاہتا ہوں''

''کل رات وہ کیسی تھی میرے جانے کے بعد''اگلی صبح ڈاکٹر ہیری نے پیٹر سے پوچھا۔وہ دونوں ہیری کے آفس میں بیٹھے تھے۔

''ٹھیک لگ رہی تھی۔پرسکون''پیٹر نے مریم کی لائی کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔''آخر اس کے ساتھ ہو کیا رہا ہے؟''

''میں معافی چاہتا ہوں۔میں تمہاری بیوی کی حالت کی خصوصیات کے بارے میں تم سے تبادلہء خیال نہیں کرسکتا۔یہ خفیہ باتیں ہیں''

پیٹر کی آنکھیں ایک لمحے کو غصے سے لال ہوگئیں''پھر تم نے مجھے کیوں یہاں بلایا ہے؟''

''کیونکہ مجھے اسکا علاج کرنے میں تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔تم چاہتے ہو کہ وہ ٹھیک ہوجائے۔۔کیوں''

''ظاہر ہے میں ایسا چاہتا ہوں۔میں اس سے بہت محبت کرتا ہوں''وہ کرسی پر آگے کی طرف جھکا''لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہو کیا رہا ہے۔۔۔کچھ مہینے پہلے تک وہ ٹھیک ٹھاک تھی۔۔جب اسنے تم سے ملنا شروع کیا۔۔اگر تم سچ جاننا چاہتے ہو تو اسکے بعد سے ہی معاملات بگڑے ہیں''

''جب لوگ اپنے معالج سے ملتے ہیں تو بعض اوقات وہ ایسے معاملات کا سامنا کرتے ہیں جن سے انکا سابقہ پہلے کبھی نہیں پڑا ہوتا۔میرا خیال ہے کہ پیسٹی کے معاملے میں بھی ایسا ہی ہوا ہے۔اور ایسا ہونا بہت چکرا دینے کا عمل ہوسکتا ہے۔''

''اسکا دعوی ہے کہ میں کوئی بھوت یا روح بننے کی اداکاری کر رہا ہوں''پیٹر نے طنزاً کہا''مجھے تو یہ صرف چکرا دینے کے عمل سے کہیں زیادہ لگتا ہے''

''وہ ایک گھومتے ہوئے رستے پہ نیچے گر رہی ہے۔میں اسے وہاں سے باہر کھینچ سکتا ہوں۔۔لیکن ایسا کرنا بہت مشکل ہوگا۔اور مجھے اس میں تمہاری مدد کی بھی ضرورت پڑے گی''

پیٹر نے کندھے اچکائے''میں کیا کرسکتا ہوں؟''

ہیری نے وضاحت کی''سب سے پہلے تمہیں میرے ساتھ

ایمانداری سے کام لینا ہوگا''

''ظاہر ہے۔۔بالکل''

''کسی بھی وجہ سے وہ اپنے باپ کو تم سے ملا رہی ہے۔اپنے باپ کے خلاف اس کے دل میں بہت بغض بھرا ہوا ہے اور وہ اسے تمہارے اوپر نکال رہی ہے۔کیا تمہیں معلوم ہے کہ وہ تم سے کیوں ناراض ہے؟''

کچھ دیر وہاں بالکل خاموشی رہی۔

''چلو۔۔۔مجھے سب کچھ بتا دو، یہاں تم جو بھی کہو گے، خفیہ رہے گا۔صرف میرے اور تمہارے درمیان''

''اسے یہ احمقانہ گمان ہوسکتا ہے کہ شائد میں اس کے ساتھ کسی اور عورت کے معاملے میں دھوکہ کر رہا ہوں''

''کیا تم کر رہے ہو؟''

''کیا تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے جو تم مجھ سے ایسا سوال پوچھ رہے ہو؟''

ہیری نے رسان سے کہا''میں تو صرف سچ کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہوں''

رینڈولف نے اپنے آپ کو قابو میں کیا''نہیں۔۔میں اسکے ساتھ کوئی دھوکہ نہیں کر رہا۔۔۔یہ سب اس کی اپنی خرافات ہے''

''اور تم کچھ ایسا بھی نہیں کر رہے جو اسکو بہت اندر تک پریشان کر دے یا اسکی حقیقت کو سمجھنے کی حس پہ اثر انداز ہو؟''

''نہیں'' پیٹر نے کہا

''اسکی قیمت کیا ہوگی؟''

ہیری نے ایک دم پوچھا۔

پیٹر نے آنکھ جھپکائی''یعنی۔۔اسکی ذاتی حیثیت؟''

''بینک بیلنس''

''میں حتمی طور پہ نہیں جانتا۔تقریباً گیارہ ملین ڈالرز''

''اور سارا پیسہ اسکا ہے۔۔۔کیوں؟''ہیری نے سر ہلایا

پیٹر کے چہرے پہ ایک سایہ سا آ کے گزر گیا''مطلب کیا ہے تمہارا؟''

''میرا مطلب ہے کہ اگر پیسٹی پاگل ہو جائے، یا خودکشی کر لے تو سارا پیسہ تمہیں مل جائے گا؟''

''جہنم میں جاؤ'' پیٹر دہاڑا۔وہ اتنی تیزی سے کھڑا ہوا کہ ہیری کو لگا کہ یہ آدمی اسے مار ہی نہ بیٹھے۔لیکن اسنے اپنی جیب سے بٹوہ نکالا، اور اسمیں سے ایک کارڈ نکال کے اسکے سامنے میز پر پھینکا۔''یہ ہمارا وکیل ہے۔اس کو فون کر کے پوچھو کہ ہمارا باہمی سمجھوتہ کیا ہے۔پیٹریشیا کے پاگل ہو جانے یا مر جانے کی صورت میں اسکا سارا پیسہ سیدھا ٹرسٹ کو چلا جائے گا۔مجھے ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں ملے گی''

ہیری نے کارڈ پیچھے ہٹایا''اسکی کوئی ضرورت نہیں ہے۔۔۔اگر میں نے تمہارا دل دکھایا ہے تو میں معافی چاہتا ہوں''اسنے کہا''میرے مریضوں کی دیکھ بھال میرے لئے سب سے مقدم ہے۔میرے لئے یہ جاننا ضروری تھا کہ ایسی کوئی وجہ نہیں ہے جس سے اسکو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو''

ہیری نے اپنے کف کے بٹن ٹھیک کر کے جیکٹ اٹھا کر پہنی

''تمہاری معذرت قبول کر لیتا ہوں''

ہیری نے سر ہلایا اور پیٹر کی طرف بغور دیکھا۔ایک نفسیاتی معالج کی سب سے بڑی صلاحیت کسی کی شخصیت کو فوراً بھانپ لینا ہوتی ہے۔اس نے اب اس آدمی کو اوپر سے نیچے تک دیکھا اور اپنے فیصلے پر پہنچ گیا''میں پیسٹی کے ساتھ کچھ ایسا کرنا چاہتا ہوں جس کے لئے مجھے تمہاری مدد کی ضرورت پڑے گی۔''

''تمہارا مطلب ہے اسکا خیال رکھنا؟''

''نہیں۔۔۔یہ تو اسکے لئے سب سے بری چیز ہوگی۔جب مریض اپنے اتنے برے وقت سے گزر رہے ہوں تو انکی ناز برداری نہیں کرنا چاہیے۔معالج کو نہ صرف خود مضبوط ہونا پڑتا ہے بلکہ ان کو بھی زبردستی مضبوط بنانا پڑتا ہے۔''

''مطلب؟''

''پیچھے پڑنے کی حد تک نہیں لیکن اسکو زندگی میں شامل رہنے کے لئے دباؤ ڈالتے رہو۔وہ ہتھیار ڈالنا چاہے گی۔۔۔چاہے گی کہ کوئی اسکے ناز اٹھائے۔۔مگر ایسا نہ ہونے دینا۔اگر وہ کہے کہ وہ بہت پریشان ہے اور خریداری کے لئے نہیں جا سکتی، یا باہر کھانے پہ نہیں جا سکتی تو اسکی بات نہ ماننا۔اس بات پہ اصرار کرنا کہ وہ ایسا ہی کرے جیسا اسے کرنا چاہئے''

''کیا تمہیں یقین ہے کہ ایسا کرنا ہی اسکے لئے بہترین ہے؟''

یقین؟ ہیری نے اپنے آپ سے سوال کیا۔نہیں۔۔اسکا تو اسے رتی برابر یقین نہیں تھا۔لیکن وہ فیصلہ کر چکا تھا۔اسے پیسٹی کو سخت دباؤ میں رکھنا تھا۔اسنے پیٹر سے کہا''ہمارے پاس اور کوئی راستہ نہیں ہے''

لیکن پیٹر کے جانے کے بعد ہیری کو ایک ایسی بات یاد آئی جو اسکے ایک میڈیکل کالج کے پروفیسر اکثر کہا کرتے تھے۔وہ کہتے تھے کہ اپنے مریض کے مرض کے اوپر پورے زور سے حملہ کرو۔یا تو خود مر جاؤ یا اسے مار دو۔

ہیری کو اس بات کا خیال عرصے بعد آیا تھا۔اسنے سوچا، کاش آج بھی نہ آیا ہوتا۔

اگلے دن، پیسٹی اسکے دفتر میں کسی پہلے سے طے شدہ وقت کے بغیر داخل ہوئی۔

بروکلین کے کلینک میں تو یہ روزمرہ کا معمول تھا لیکن یہاں، پارک ایونیو کے شاندار دفتر میں ایسا ہونا بعید از قیاس تھا۔ہیری اسکے چہرے سے

اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ کتنی ناراض ہے اسلئے اسنے اسکے اس طرح منہ اٹھائے چلے آنے کو زیادہ مسئلہ نہیں بنایا۔

وہ صوفے پر دھڑ سے گری اور اپنے بازوؤں کو اپنے گرد کس لیا جبکہ ہیری نے اٹھ کر دروازہ بند کر دیا۔

''کیا بات ہے پیسٹی؟'' اسنے پوچھا۔

اسکا حلیہ بے حد بدتر تھا۔ کپڑے پر شکن اور داغوں سے بھرے ہوئے، بال گندے اور ہاتھوں کے ناخن غلیظ۔

''ہر چیز بالکل صحیح چل رہی تھی'' اسنے سانس بھری ''کہ آج صبح، جب میں اسٹڈی میں کھڑی تھی۔۔۔ میں نے اپنے والد کی روح کو دوبارہ سنا۔ اسنے کہا۔۔۔ وہ تقریباً یہاں آ چکے ہیں۔۔۔ اب تمہارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔۔۔ اور میں نے پوچھا۔۔۔ کیا مطلب ہے تمہارا؟ اور اس نے کہا۔۔ ذرا اپنی بیٹھک میں تو جھانکو۔۔۔ اور جب میں نے وہاں دیکھا تو مجھے ایک اور پرندہ نظر آیا۔ ٹوٹا ہوا۔۔۔ بکھرا ہوا'' اسنے اپنا پرس کھول کر ہیری کو ٹوٹے ہوئے سیرامک کے ٹکڑے دکھائے ''اب۔۔۔ صرف ایک بچا ہے۔۔۔ اور اگر وہ ٹوٹ گیا تو میں مر جاؤں گی۔۔۔ مجھے پتا ہے ایسا ہی ہوگا۔۔۔ پیٹر اسکو آج رات توڑنے والا ہے۔۔ اور اسکے بعد وہ مجھے ہلاک کر دے گا''

''وہ تمہیں ہلاک نہیں کرنے والا پیسٹی۔۔'' ہیری نے اطمینان سے کہا۔۔ اسکی ہسٹیریائی کیفیت کو نظر انداز کرتے ہوئے۔۔

''میرا خیال ہے کہ مجھے کچھ دن کے لئے اسپتال چلے جانا چاہئے۔ ڈاکٹر''

ہیری اپنی جگہ سے اٹھا اور صوفے پر اسکے برابر بیٹھ کر اسکا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا ''نہیں''

''کیا؟''

''ایسا کرنا ایک غلطی ہوگی'' ہیری نے کہا

''کیوں؟'' وہ تقریباً رو پڑی

''کیونکہ تم ان مسئلوں سے بچ نہیں سکتیں۔۔ تمہیں انکا سامنا کرنا ہے''

''میں ہسپتال میں اپنے آپ کو محفوظ سمجھوں گی۔ کوئی مجھے وہاں مارنے کی کوشش نہیں کر سکتا''

''کوئی تمہیں مارنے والا نہیں ہے پیسٹی۔۔ میرا یقین کرو''

''نہیں۔۔۔ پیٹر۔۔''

''لیکن پیٹر نے تو کبھی تمہیں تکلیف پہنچانے کی کوشش نہیں کی۔۔۔ کیا کی ہے؟''

ایک توقف ''نہیں''

''ٹھیک ہے۔ اب میں تم سے جیسا کہہ رہا ہوں ویسا ہی کرو۔۔ تم سن رہی ہو نا۔۔؟''

''ہاں''

''چاہے پیٹر تم سے وہ الفاظ کہنے کی اداکاری کر رہا تھا۔۔ یا تم انہیں تخیلاتی طور پر سن رہی تھیں۔۔ وہ حقیقی نہیں تھے۔۔۔ اسے دہراؤ''

''میں۔۔۔''

''انہیں دوبارہ کہو''

''وہ حقیقی نہیں تھے۔۔''

''اب کہو۔۔ کوئی بھوت یا روح نہیں تھی۔۔ میرے والد مر چکے ہیں''

''کوئی بھوت یا روح نہیں تھی۔۔ میرے والد مر چکے ہیں''

''شاباش'' اسنے ہنس کر کہا ''ایک بار پھر''

اسنے یہ سب ایک منتر کی طرح کئی بار دہرایا۔ ہر مرتبہ پہلے سے زیادہ پرسکون انداز میں۔ بالآخر ایک ہلکی سی مسکراہٹ اسکے ہونٹوں پہ آ گئی۔۔ لیکن پھر اسنے جھنجھلا کر کہا ''لیکن پرندہ۔۔۔'' اسنے پھر اپنا پرس کھولا اور ٹوٹے ہوئے سیرامک کے ٹکڑے اپنے لرزتے ہاتھوں میں لے لئے۔

''پرندے کے ساتھ جو بھی ہوا، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ صرف چینی کا ایک ٹکڑا ہے''

''لیکن۔۔'' اسنے سر جھکا کر ٹوٹی ہوئی باقیات پر پھر نظر ڈالی

ہیری آگے کو جھکا ''میری بات سنو۔۔ اور بغور سنو۔۔ میں چاہتا ہوں کہ تم گھر جاؤ۔۔ اور اس آخری پرندے کو اٹھا کر ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالو''

''تم چاہتے ہو کہ میں۔۔۔''

''ایک ہتھوڑا اٹھاؤ اور اسے ریزہ ریزہ کر دو''

اسنے احتجاج کرنا چاہا لیکن پھر مسکرا کر بولی ''کیا میں ایسا کر سکتی ہوں؟''

''تم شرطیہ کر سکتی ہو۔۔ صرف اپنے آپ کو ایسا کرنے کی اجازت دے دو۔ گھر جاؤ۔۔ وائن کا ایک خوبصورت گلاس پیو۔۔ ہتھوڑا اٹھاؤ اور اسے توڑ ڈالو'' اسنے اپنے ڈیسک کے نیچے رکھے کوڑے دان کو ہاتھ بڑھا کر اٹھایا اور اسکے سامنے کر دیا ''یہ محض چینی کے ٹکڑے ہیں پیسٹی''

ایک لمحے کے بعد پیسٹی نے وہ ٹکڑے کوڑے دان میں پھینک دیئے۔

''شاباش پیسٹی۔۔'' اور اپنے آپ کو آمادہ کرتے ہوئے۔۔۔ ہیری نے اسے گلے لگا لیا۔

اس شام، پیسٹی گھر پہنچی تو اس نے پیٹر کو ٹی وی کے سامنے بیٹھا پایا۔

''تم دیر سے آئی ہو۔ کہاں تھیں؟''

''کچھ نہیں۔۔ ذرا خریداری کر رہی تھی۔۔۔ وائن لائی ہوں''

''ہمیں جیک اور لوئس کے ہاں جانا ہے رات کے کھانے پر۔ مجھ سے یہ مت کہنا کہ تم بھول گئیں''

''میرا دل نہیں چاہ رہا'' اس نے کہا ''میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔۔میں۔۔''

''نہیں۔ہم جا رہے ہیں۔تم اس سے فرار حاصل نہیں کر سکتیں'' اسنے اسی عجیب، بے ترتیب سے لہجے میں کہا جیسے وہ پچھلے ہفتے سے کہہ رہا تھا۔

''ٹھیک ہے۔لیکن کیا میں کم از کم کچھ ضروری کام تو کر سکتی ہوں اس سے پہلے؟''

''ضرور۔۔میں بس یہ نہیں چاہتا کہ ہمیں دیر ہو جائے''

پیسٹی باورچی خانے میں گئی، ایک مہنگی وائن کی بوتل کھولی، اور ایک بڑا گلاس بالکل اسی طرح بھرا جیسے ڈاکٹر ہیری نے اس سے کہا تھا۔اس نے ایک گھونٹ بھرا۔وہ بہت اچھا محسوس کر رہی تھی۔بہت ہی اچھا۔''ہتھوڑا کہاں ہے؟''

''ہتھوڑا؟ اسکی تمہیں کیا ضرورت پڑ گئی؟''

''مجھے کچھ ٹھیک کرنا ہے''

''میرا خیال ہے کہ وہ فرج کے ساتھ والی دراز میں ہے''

اسے ہتھوڑا وہیں مل گیا۔اسے تھامے وہ بیٹھک میں آئی۔میز پر رکھے آخری سیرامک کے پرندے۔۔۔الو، پر ایک نظر ڈالی۔

پیٹر نے ہتھوڑے کی طرف ایک نظر دیکھا اور پھر ٹی وی پر نظریں جما دیں ''کیا ٹھیک کرنا ہے تمہیں؟''

''تمہیں۔۔۔'' پیسٹی نے جواب دیا اور پیٹر کے سر پہ ہتھوڑے کا ایک بھرپور وار کیا۔۔اپنی پوری طاقت کے ساتھ۔

ایسے کوئی درجن بھر وار، پیٹر کو مار ڈالنے میں کرنے پڑے۔اور جب اسکا کام تمام ہوا تو پیسٹی نے پیچھے ہٹ کے خون کے اس انہونے نمونے کا جائزہ لیا جو پیٹر کے خون نے قالین اور صوفے پر جا بجا بنایا تھا۔اسکے بعد وہ اپنے بیڈ روم میں گئی اور بستر کے سرہانے رکھی ڈائری اٹھا لی۔وہی جسے ڈاکٹر برنسٹن نے رکھنے کا مشورہ دیا تھا۔بیٹھک میں واپس آ کر وہ اپنے شوہر کے بے جان جسم کے پاس بیٹھ گئی اور ایک لمبا مضمون لکھا کہ آخر کار کیسے اس نے ان بھوتوں اور روحوں کو اس سے باتیں کرنے سے روک دیا۔بالآخر اسے سکون مل گیا تھا۔وہ اتنا کچھ پھر بھی نہ لکھ سکی جتنا وہ لکھنا چاہتی تھی۔اپنی انگلی کو قلم، اور خون کو سیاہی بنا کر لکھنے میں بڑا وقت خرچ ہوتا ہے۔

جب وہ لکھ کر فارغ ہوئی تو اسنے ہتھوڑا اٹھایا اور پرندے کو مار مار کے سرمہ بنا ڈالا۔اسکے بعد اسنے حلق کے بل زور زور سے چیخنا شروع کر دیا۔''بھوت مر گئے۔۔۔بھوت مر گئے۔۔بھوت مر گئے''

اس سے پہلے کہ اس کی آواز بیٹھ جاتی۔۔پولس اور طبی عملہ موقع پر پہنچ گئے۔جب پولس پیسٹی کو اٹھا کے لے جانے آئی، وہ آنکھیں بند کئے سکون سے پڑی تھی۔

ایک ہفتے بعد، ہیری قیدیوں کے ہسپتال کی انتظار گاہ میں بیٹھا ہوا تھا۔وہ جانتا تھا کہ اسکی حالت اس وقت دیکھنے کے قابل تھی۔کئی دنوں سے اس نے شیو نہیں کیا تھا اور اسکے کپڑے شکن آلود تھے۔دراصل یہ وہی کپڑے تھے جن میں وہ رات کو سو گیا تھا۔اسکی نظریں گندے فرش پر جمی تھیں۔

''تم ٹھیک تو ہو؟'' ایک لمبے، دبلے پتلے، ہلکی داڑھی والے آدمی نے اس سے پوچھا۔اس نے انتہائی عالیشان سوٹ پہنا ہوا تھا اور مہنگا چشمہ لگایا ہوا تھا۔وہ پیسٹی کا وکیل دفاع تھا۔

''میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ یہ کر گزرے گی'' ہیری نے اس سے کہا ''مجھے یہ تو معلوم تھا کہ میں یہ خطرہ مول لے رہا ہوں۔مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ کچھ نہ کچھ غلط تھا۔مگر میرا خیال تھا کہ ہر چیز میرے قابو میں ہے''

وکیل نے اس کی طرف ہمدردی سے دیکھا۔''میں نے سنا ہے کہ تمہیں بھی مشکلات کا سامنا ہے۔۔تمہارے مریض۔۔''

ہیری تلخی سے ہنسا ''مجھے چھوڑ کر جا رہے ہیں۔۔۔اچھا۔۔کیا تم ایسا نہیں کرو گے؟ میرے جیسے معالج پارک اوینیو پہ دس پیسے میں درجن ملتے ہیں۔۔وہ میرے پاس آنے کا خطرہ کیوں مول لیں؟۔۔۔ہو سکتا ہے میں انہیں مروا دوں یا ان سے ایسا کروا دوں''

جیلر نے دروازہ کھول کر آواز دی ''ڈاکٹر برنسٹن۔۔اب تم اپنے قیدی سے مل سکتے ہو''

وہ آہستہ آہستہ کھڑا ہوا۔۔اپنے آپ کو دروازے کی چوکھٹ سے سہارا دیتا ہوا۔۔۔

وکیل نے ایک بار پھر اسے دیکھا اور کہا ''ہم دونوں اگلے کچھ روز میں اس بات کا فیصلہ کرنے کے لئے مل سکتے ہیں کہ اس سارے کیس سے کیسے نمٹنا ہے۔پاگل پن کا دفاع اس ریاست میں انتہائی مشکل ہے لیکن اگر تم میرے ساتھ ہو تو میں ایسا کر سکتا ہوں۔ہم اسے جیل سے باہر رکھنے کی کوشش کریں گے۔۔۔ڈاکٹر۔تم ٹھیک رہو گے؟''

ہیری نے سرسری سا سر ہلایا۔

وکیل نے خلوص سے کہا ''میں تمہارے لئے نقد رقم کا انتظام کر سکتا ہوں۔کچھ ہزار۔۔۔تمہاری ماہرانہ چشم دید گواہی کے عوض''

''شکریہ'' ہیری نے کہا۔لیکن کچھ ہی لمحوں کے بعد اسے اس رقم کا خیال بھی نہ رہا۔اسکا دماغ صرف مریضہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

کمرہ اسکی توقعات کے مطابق بے حد مختصر تھا۔

سفید چہرے اور مچی ہوئی آنکھوں والی پیسٹی بستر پہ لیٹی کھڑکی سے باہر جھانک رہی تھی۔ہیری کی آمد پہ اسنے اس پہ نگاہ ڈالی، ایسا نہیں لگا کہ وہ اسے پہچان پائی ہے۔

''اب کیسی ہو تم؟'' ہیری نے پوچھا۔

''تم کون ہو؟'' اسنے سانس بھر کے کہا۔

ہیری نے اسکے سوال کا بھی کوئی جواب نہیں دیا ''تم بہت برے حالات میں نہیں لگ رہیں پیسٹی''

''میرا خیال ہے کہ میں تمہیں جانتی ہوں۔۔ہاں۔۔تم؟۔۔۔رکو۔۔۔کیا تم بھوت ہو؟''

''نہیں، میں کوئی بھوت نہیں ہوں'' اس نے اپنا اٹیچی کیس میز پر رکھ دیا۔پیسٹی کی آنکھیں اٹیچی پہ پھسلیں جب ہیری نے اسے کھولا۔

''میں بہت دیر نہیں رک سکتا۔میں اپنی پریکٹس بند کر رہا ہوں۔ ڈھیروں چیزیں ہیں جو توجہ طلب ہیں۔لیکن میں تم تک کچھ چیزیں پہنچانا چاہتا تھا''

''چیزیں؟'' اسنے بچے کی سی آواز میں پوچھا۔''میرے لئے۔۔ جیسے کرسمس۔۔۔میری سالگرہ''

''اونہوں'' اس نے کیس کے اندر سے کچھ باہر نکالا۔''یہ پہلی چیز ہے'' اسنے ایک فوٹو کاپی باہر نکالی۔''یہ ایک مضمون ہے ایک نفسیاتی جریدہ سے۔میں نے اسے اسی رات ڈھونڈا تھا جب تم نے پہلی بار مجھے بھوتوں اور روحوں کے بارے میں بتایا تھا۔تمہیں یہ ضرور پڑھنا چاہئے''

''میں تو پڑھ ہی نہیں سکتی'' پیسٹی نے کہا۔''مجھے نہیں معلوم کیسے؟'' اسنے ایک ہونق سا قہقہہ لگایا۔''میں یہاں کے کھانے سے خوفزدہ ہوں۔میرا خیال ہے کہ یہاں چاروں طرف جاسوس پھیلے ہوئے ہیں۔وہ میرے کھانے میں کچھ ملانے والے ہیں۔گندی۔۔غلیظ چیزیں۔یا زہر۔یا ٹوٹا ہوا شیشہ۔۔'' ایک اور ہونق قہقہہ۔

ہیری نے وہ مضمون اسکے برابر بستر پہ رکھ دیا اور کھڑکی کی طرف چلا۔باہر کوئی درخت نہیں تھے۔کوئی پرندے نہیں۔صرف بدرنگا، سلیٹی مین ہیٹن کا صدر علاقہ۔

اسنے پیسٹی کی طرف پھر دیکھتے ہوئے کہا'' صرف بھوتوں کے بارے میں ہے۔۔یہ مضمون''

اسکی آنکھیں ایک لمحے کو سکڑیں اور پھر ان میں خوف در آیا ''بھوت؟'' اسنے سرگوشی میں کہا'' کیا یہاں بھوت ہیں؟''

ہیری کو بہت ہنسی آئی ''دیکھا پیسٹی۔۔بھوت ہی سب سے پہلا اشارہ تھا۔تمہارا ان کا ذکر کرنے کے بعد یہ کہنا کہ تمہارا شوہر تمہیں پاگل بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔میں نے سوچا کہ کچھ ایسا ہے جو صحیح نہیں لگ رہا۔تو میں گھر گیا اور تمہارے کیس پر چھان بین کرنا شروع کر دی۔''

پیسٹی اسکی طرف خاموشی سے دیکھتی رہی۔

''یہ مضمون صرف دماغی صحت کے مسئلوں کی صحیح تشخیص کی اہمیت کے بارے میں ہی ہے۔دیکھو۔۔کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ کسی ایسے شخص کو اس کا فائدہ ہو جاتا ہے جو دیکھنے میں دماغی طور پر منتشر لگتا ہے۔۔۔۔تو وہ ذمہ داری سے بری الذمہ ہو جاتا ہے۔ایسے سپاہی جو جنگ نہیں لڑنا چاہتے۔ایسے لوگ جو بوگس بیمے کا دعوی کریں، وہ لوگ جو جرائم میں ملوث ہوں'' وہ پیچھے مڑا ''اور وہ لوگ جو جرم کرنے ہی والے ہوں''

''مجھے بھوتوں سے ڈر لگتا ہے'' پیسٹی کی آواز بلند ہو گئی۔''مجھے بھوتوں سے ڈر لگتا ہے۔۔میں نہیں چاہتی کہ کوئی بھی بھوت یہاں ہو۔۔۔مجھے بھوتوں سے ڈر۔۔۔''

ہیری ایک لیکچر دیتے ہوئے پروفیسر کی طرح بولتا رہا ''اور بھوت وہ ہیولے ہیں جو سمجھ بوجھ والے لوگ دوسروں کو یہ بتانے کے لئے اکثر استعمال کرتے ہیں کہ وہ پاگل ہیں''

پیسٹی نے اپنا منہ بند کر لیا۔

''انتہائی اثر انگیز مضمون'' ہیری نے پھر کہا۔''دیکھو۔۔بھوت اور روحیں تخیلاتی دماغوں کی پیداوار ہوتے ہیں۔لیکن درحقیقت یہ ایسا پیچیدہ جسمانی نظریہ ہے جو اصلی پاگل لوگ بالکل سمجھ ہی نہیں سکتے۔نہیں۔۔دراصل پاگل یہ سمجھتے ہیں کہ وہ شخص انکے ساتھ وہاں موجود ہے جو ان سے بات کر رہا ہے۔انکے خیال میں نپولین، ہٹلر، مارلن منرو انکے ساتھ درحقیقت کمرے میں موجود ہوتے ہیں۔تمہیں یہ دعوی نہیں کرنا چاہئے تھا کہ تم نے اپنے والد کے بھوت کی آواز سنی۔۔تمہیں درحقیقت اپنے والد کو سننا چاہئے تھا۔''

ہیری نے اپنی مریضہ کے چہرے پر پھیلے شدید دھچکے کے تاثرات کا مزہ لیا۔اسنے کہا ''پھر کچھ ہفتے پہلے، تم نے اعتراف کیا کہ ہو سکتا ہے کہ آوازیں صرف تمہاری ذہنی اختراع ہو۔حقیقی مریض کبھی ایسا اعتراف نہیں کریں گے۔وہ تو یہ قسمیں کھائیں گے کہ وہ بالکل باہوش وحواس ہیں'' وہ آہستہ آہستہ ٹہلا ''کچھ اور چیزیں بھی تھیں۔تم نے یقیناً کہیں پڑھ لیا تھا کہ خراب اور اجڑی ہوئی ظاہری حالت دماغی بیماری کی علامات ہوتی ہیں۔تمہارے کپڑے پھٹے ہوئے اور گندے ہوتے تھے۔تمہارے بٹن غلط لگے ہوتے تھے، لیکن تمہارا میک اپ ہمیشہ بالکل مثالی ہوتا تھا۔حتیٰ کہ اس رات بھی جب پولس نے تمہاری بلڈنگ پہ مجھے فون کر کے بلایا۔صحیح دماغی بیماری میں، میک اپ وہ پہلی چیز ہوتا ہے جو رخصت ہوتا ہے۔یا پھر مریض اپنے چہرے اس سے بگاڑ لیتے ہیں۔اس کا تعلق اپنی شناخت چھپانے کے مسئلے سے ہوتا ہے۔۔۔اگر تمہیں یہ جاننے سے کوئی دلچسپی ہو''

''ہاں، اور یاد ہے؟ تم نے کہا تھا اگر کوئی بھوت کبھی کسی سیشن میں آ سکے تو؟ بہت ہی مزے کی بات تھی وہ۔مگر نفسیات کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ مذاق دراصل ہمارے روزمرہ کے تجربات پر مبنی تصورات اور نظریات کا طنزیہ تقابل ہوتا ہے۔ظاہر ہے کہ یہ پاگلوں کے دماغی رویئے کے بالکل برعکس ہے''۔

''اس ساری بکواس کا کیا مطلب ہے'' پیسٹی نے کف اڑاتے

ہوئے کہا۔

''کہ پاگل مذاق نہیں کرتے۔''اسنے خلاصہ پیش کیا۔''اس بات نے مجھے بتایا کہ تم اتنی ہی ہوش وحواس میں تھیں جتنی کہ ہوسکتی تھیں''ہیری نے پھر اپنے اٹیچی کے اندر جھانکا۔''اگلی بات''اسنے مسکراتے ہوئے اوپر دیکھا۔''اس مضمون کو پڑھنے کے بعد اور اس فیصلے کے بعد کہ تم اپنی بناوٹی تشخیص کر رہی ہو،اوران سب باتوں کو سننے کے بعد جوتم لاشعوری طور پر اپنی شادی شدہ زندگی کے حوالے سے مجھے سنا رہی تھیں۔۔میں نے اندازہ لگالیا کہ تم کسی ایسی وجہ سے،جس کا تعلق تمہارے شوہر سے ہے،مجھے استعمال کرنا چاہ رہی ہو۔تو میں نے ایک ذاتی جاسوس سے کام لیا''

''خدایا۔۔۔تم نے کیا کیا؟''

''یہ رہی اسکی رپورٹ''اسنے فائل بستر پر ڈال دی۔''اسکے مطابق،تمہارے شوہر کا واقعی کسی سے معاشقہ چل رہا تھا اور وہ تمہارے بچت اکاؤنٹ سے خفیہ طور پر جعلی چیک بھنوا رہا تھا۔تم اس کے اس معاشقے،اور رقم کے بارے میں باخبر تھیں اور تم نے اپنے وکیل سے اسے طلاق دینے کے بارے میں بات بھی کی تھی۔لیکن پیٹر بھی جانتا تھا کہ تمہارا ابھی معاشقہ چل رہا ہے۔۔۔اپنی دوست سیلی کے شوہر سے۔پیٹر اس بات کو تمہیں طلاق دینے سے باز رکھنے کے لئے بلیک میل کے طور پر استعمال کر رہا تھا''

پیسٹی اس کو ہکا بکا دیکھے گئی۔

ہیری نے رپورٹ کی طرف اشارہ کیا''اور ہاں،تم خود بھی اس کو دیکھ سکتی ہو۔تم ظاہر کرنا چاہتی ہو کہ تم پڑھ نہیں سکتیں؟ بیکار ہے۔پڑھائی کا پاگل پن سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔اسکا تعلق نشوونما اور IQ سے ہے''

پیسٹی نے رپورٹ کو کھولا،اس کو کہیں کہیں سے پڑھا اور پھر اسے ایک طرف کراہیت سے پٹخ دیا''کمینے۔۔۔۔''

ہیری نے کہا''تم پیٹر کو قتل کرنا چاہتی تھیں اور اس کے لئے تم مجھ سے اپنے پاگل پن کی گواہی لینا چاہتی تھیں۔اپنے دفاع کے لئے۔تم ایک نجی اسپتال میں جاتیں،ایک سال تک وہاں تمہاری ضروری جانچ پڑتال اور کیس کی سماعت کی جاتی اور۔۔۔تم سارے امتحانوں میں کامیاب ہوکر رہا کر دی جاتیں''

پیسٹی نے اپنا سر زور زور سے ہلایا''مگر تم جانتے تھے کہ میرا مقصد پیٹر کو قتل کرنا تھا۔۔۔اور تم نے مجھے ایسا کرنے دیا۔۔۔بلکہ تم نے تو ایسا کرنے کے لئے میری حوصلہ افزائی کی''

''اور جب میں پیٹر سے ملا تو میں نے اس کی حوصلہ افزائی کی کہ تم کو زچ کرے۔وہ وقت چیزوں کو آگے بڑھانے کا تھا۔میں تمہارے ساتھ سیشنز کرتے کرتے تھک گیا تھا''پھر اسکا چہرہ افسوس اور پچھتاوے سے بجھ سا گیا''میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ تم اسے واقعی مار ڈالوگی۔میرے خیال میں تم صرف اسکی عزت نفس کو مجروح کروگی مگر۔۔میں کیا کہہ سکتا ہوں؟ نفسیات ایک لامحدود سائنس ہے''

''مگر تم پولیس کے پاس کیوں نہیں گئے؟''اسنے سرگوشی میں ہیجانی لہجے میں پوچھا۔

''اوہ!اس کا تعلق اس تیسری چیز سے ہے جو میں تمہارے لئے لایا ہوں''

۔۔۔۔۔ میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں اور تم میری۔۔۔۔۔

اسنے اٹیچی میں سے ایک لفافہ اٹھایا اور پیسٹی کے ہاتھ میں دے دیا۔

''یہ کیا ہے؟''

''میرا معاوضہ''

اسنے اس لفافے کو اٹھا کر اس میں رکھا کاغذ باہر نکالا۔سب سے اوپر''برائے پیش کردہ خدمات''لکھا تھا اور اس سے نیچے لکھا تھا۔۔''دس ملین ڈالرز۔۔''

''کیا تم پاگل ہوگئے ہو؟''پیسٹی کی جیسے سانس رک گئی۔

اس موجودہ جگہ اور ان ساری باتوں کے پس منظر میں،جو ان کے درمیان ہوئی تھیں،ہیری کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ پیسٹی کے الفاظ کے چناؤ پر ہنسے''پیٹر اتنا اچھا تھا کہ اس نے مجھے تمہاری بالکل صحیح قیمت بتا دی تھی۔میں تمہارے لئے ایک ملین چھوڑ رہا ہوں۔۔۔جو تمہیں یقیناً اپنے اس وکیل کا معاوضہ بھرنے کے لئے چاہیے ہوگی۔بہت مہنگا دکھائی دیتا ہے وہ۔اب۔۔۔مجھے یا تو نقد رقم چاہئے یا پھر میں ایک مصدقہ چیک لوں گا،تمہاری سماعت میں گواہی دینے سے پہلے۔دوسری صورت میں مجھے عدالت کے ساتھ تمہارے سلسلے میں اپنی ایماندارانہ تشخیص بانٹنا پڑے گی''

''تم مجھے بلیک میل کر رہے ہو؟''

''میرا خیال ہے،کر تو رہا ہوں''

''کیوں؟''

''کیونکہ اس پیسے سے میں کچھ اچھا کر سکوں گا۔اور ان لوگوں کی مدد کر سکوں گا جنہیں دراصل مدد کی ضرورت ہے''اسنے اپنے معاوضے کی طرف اشارہ کیا''میں تمہاری جگہ ہوتا تو یہ چیک فوراً لکھ دیتا۔نیویارک میں اب سزائے موت رائج ہے،تم جانتی ہی ہو۔اوہ۔۔ایک اور بات۔۔میں اس کھانے میں زہر والی بات کو بھی بھول جاتا کیونکہ یہاں،اگر تم کھانے کی ذرا سی بھی برائی کرو تو یہ تمہیں ٹیوب پہ ڈال دیتے ہیں''اسنے اپنا اٹیچی کیس اٹھایا۔

''ٹھہرو''پیسٹی نے لجاجت سے کہا۔''ابھی مت جاؤ،چلو،اس کے بارے میں بات کرتے ہیں''

''معافی چاہتا ہوں''ہیری نے دیوار گیر گھڑی کی طرف اشارہ کیا''ہمارا وقت ختم ہو چکا ہے''

''شباب کا موسم''

پروفیسر زہیر کنجاہی (راولپنڈی)

آیا آیا شباب کا موسم — لایا لایا عتاب کا موسم
غُنچوں کلیوں کو چُپ لگی ہے کیوں — ہے سوال و جواب کا موسم
تتلیوں کو جو بے قراری ہے — شاید آیا گلاب کا موسم
ہم دُعائیں وہ گالیاں دے گا — آ رہا ہے عذاب کا موسم
کشتیوں پر شکار کرتے ہو — تُم کو بھائے چناب کا موسم
لفظ بکھرے ہوئے ہیں پھولوں پر — آؤ دیکھیں کتاب کا موسم
آنسوؤں میں چڑھی ہے طغیانی — دِل سے اُٹھّا عذاب کا موسم
مجھ کو دیکھو زہیر کیسا ہوں — کیا ہے خانہ خراب کا موسم

○

کرامت بخاری (لاہور)

یہ کس ویران وادی کا سفر ہے — بڑی زرخیز لیکن بے ثمر ہے
مرے دامن میں جب سے ہے محبت — سُنا ہے حادثوں کو بھی خبر ہے
نہ کیوں صحرا میں عکسِ آب دیکھوں — یہ پانی کی پُرانی رہ گزر ہے
کھُلی جب سے تلاطم کی حقیقت — اُسی دن سے طبیعت بے خطر ہے
ہر اِک ارماں کو بن جانا ہے حسرت — تو پھر یہ زیست کس اُمید پر ہے
نئے قصے پُرانے تذکروں سے — نئی سوچوں پہ ماضی کا اثر ہے
وہی جو باخبر کہتا ہے خود کو — وہی سب سے زیادہ بے خبر ہے

○

صابر عظیم آبادی (کراچی)

کیا طرفہ تماشا ہے خوشی بھی ہے الم بھی — کرتے ہیں کرم اور وہ ڈھاتے ہیں ستم بھی
اُمید کی کرنوں سے چمکتی نہیں قسمت — اس بات پر قائم ہیں بہت روز سے ہم بھی
طوفان کا خطرہ ہی نہیں صرف مکینو — بے چین ہیں بڑھنے کو سمندر کے قدم بھی
میرے ہی مسائل کا نہیں ذکر جہاں میں — اک مسئلۂ غور طلب ہے ترا غم بھی
ہوتے ہیں جہاں صبحِ مسرّت کے اُجالے — ہوتی ہے نمودار وہیں شامِ الم بھی
جب اتنا کیا تھا مجھے رُسوا تو سرِ بزم — رکھ لیتے مرے پیار کا تھوڑا سا بھرم بھی
ڈر لگتا ہے اس طرزِ جفا سے مجھے صابر — لے لیں نہ مرے ہاتھ سے وہ لوح و قلم بھی

○

سید سعید نقوی

(نیویارک)

گفتگو چاہے ناخدا سے کرو — اپنی نظریں سدا اٹھا کے کرو
اب تو یہ دل بھی ہم سے کہتا ہے — عشق جب بھی کرو بتا کے کرو
جب بھی کرنا ہو سجدہ ہائے اَنا — اپنی دستار کو اٹھا کے کرو
ان کی معراج چاہیے تم کو — رقص بسمل کو بھی دکھا کے کرو
صحن گل سے مجھے بھی نسبت ہے — ذکر میرا کبھی صبا سے کرو
نیکیوں کا حساب رکھتا ہے — اب جو سجدہ کرو دکھا کے کرو
گر یہ سیکھا ہے کامیابی کا — بات جو بھی کرو گھما کے کرو
اسکی آنکھوں میں تو نمی ہے سعیدؔ — بات اس سے نظر چرا کے کرو

سیفی سرونجی

(بھارت)

غم نہیں مجھ سے محبت نہیں کرتا کوئی — یہ بڑی بات ہے نفرت نہیں کرتا کوئی
ظلم ہوئے لاکھ بغاوت نہیں کرتا کوئی — اب مرے شہر سے ہجرت نہیں کرتا کوئی
سینکڑوں حادثے سڑکوں پہ ہوا کرتے ہیں — اب کسی موت پہ حیرت نہیں کرتا کوئی
مسجدیں شہر کی دن رات بھری رہتی ہیں — یہ الگ بات عبادت نہیں کرتا کوئی
میں ہوں کمزور یہی راز ہے میرا سیفیؔ — مجھ سے ٹکرانے کی ہمت نہیں کرتا کوئی

شگفتہ نازلی

(لاہور)

فی البدیہہ سا بولنے کو' ایک لمحہ چاہیے — کانوں میں رَس گھولنے کو' ایک لمحہ چاہیے،
کتنے ہی لمحے گزر جاتے ہیں کچھ سوچے بغیر — خوب صورت سوچنے کو' ایک لمحے چاہیے،
کتنا عرصہ گھوم لیں ہم دوسری دنیاؤں میں — گھر کی جانب لوٹنے کو' ایک لمحہ چاہیے،
کیسا ہی محتاط ہو کوئی آڑی ترچھی راہ پر — پر قدم کے ڈولنے کو' ایک لمحہ چاہیے،
ساری کاوش ساری محنت جُوں اکارت ہوگئی — کیوں کہ کہنے ٹوکنے کو' ایک لمحہ چاہیے،
دوسری جانب کوئی آسودہ سی دستک تو ہو — ورنہ کھڑکی کھولنے کو' ایک لمحہ چاہیے،
کتنی محنت سے پروئی جاتی ہے مالا کوئی — موتیوں کے رولنے کو' ایک لمحہ چاہیے،

○

شوکت جمال

(دوہئ)

شکل وصورت سے وہ بس اللہ کی بندگی لگی — گفتگو اس کی مجھے لیکن شکرقندی لگی
گوشوارے بھردیے قاضی نے سب چپ دیکھ کر — خامشی میری اسے آدھی رضامندی لگی
کل براتی لے گئے دلہن کی ماں کو ہال سے — ان کو دلہن سے زیادہ وہ لدی پھندی لگی
زیروبم رکھا کسی شاعر نے مجموعے کا نام — افسروں نے زیروبم سمجھا، سو پابندی لگی
دل کا سودا اس لیے پھر ملتوی کرنا پڑا — کاروبارِ دل کی منڈی آج بھی مندی لگی

○

مراق مرزا

(بھارت)

مری اڑان کا روشن نشاں ہے سورج میں — میں ہوں عقاب مری داستاں ہے سورج میں
بندھی فلک سے ہے رفتارِ زندگی کی ڈور — چھپا ہوا کہیں اک بادباں ہے سورج میں
تمام ارض وسما اُس کے ہی حصار میں ہیں — گزرتے وقت کا ہر کارواں ہے سورج میں
ہے کس کے حکم سے جاری یہ رات دن کا سفر — یہ کس کی ذات ازل سے عیاں ہے سورج میں
مرے وجود کی حد ہے زمیں تک، لیکن — مرے خیال کا ہر آسماں ہے سورج میں
تمام فکر کی صورت میں اک صدا ہے مراقؔ — جو چاند میں ہے وہی لامکاں ہے سورج میں

○

نوید سروشؔ

(میرپورخاص)

نئی رتوں کے عذاب میں تھا — شگفتگی کے سراب میں تھا
ہمیشہ رشتہ رہے گا تم سے — نجومیوں کے حساب میں تھا
جو ہے صداقت، کتاب میں ہے — یہی ہمارے نصاب میں تھا
میں اپنا رستا بدلتا کیسے — وفاؤں کے ارتکاب میں تھا
اُسی تو لمحے سروشؔ چوکا۔ — جو وقت کے احتساب میں تھا۔

○

انور جاوید ہاشمی

(کراچی)

بدن مثال کہاں کینوس سے نکلا ہے
یہ واقعہ تو فریبِ ہوس سے نکلا ہے

کنارِ راہ گزر جس کی منتظر آنکھیں
گزرتا سامنے سے اگلی بس سے نکلا ہے

ہزار جستجو اس کے وصال کی رکھیے
وہ ماہ رو کہاں میٹھے برس سے نکلا ہے

زبان کیا تھی مگر نیٹ پر لگا ہم کو
سخن کا پھول کسی کیکٹس سے نکلا ہے

ہم اُس کی ہاں میں ملاتے رہیں گے ہاں کب تک؟
کہ، ہاشمی وہ کہاں پیش و پس سے نکلا ہے

○

قیصر مسعود

(دوحۂ قطر)

کیا ملے گا اچھال کر پتھر
پاس رکھو سنبھال کر پتھر

آؤ پھر سے محبتیں کر لیں
اپنے دل سے نکال کر پتھر

تم نے اپنے شکم پہ باندھے ہیں
ہم نے کھائے ابال کر پتھر

کوئی تجھ سے مراد کیا مانگے
تو ہی سب سے سوال کر پتھر

سر بسر ہیں جو آئینہ صورت
کچھ تو ان کا خیال کر پتھر

بت کدوں کی بھی لاج رہ جائے
کوئی ایسا کمال کر پتھر

کتنے انسان سو گئے قیصر
اپنے جسموں پہ ڈال کر پتھر

○

شان بھارتی

(دھنباد، بھارت)

کس اختیار سے ہم روشنی میں ڈوب گئے
کھُلی جو آنکھ تو پھر تیرگی میں ڈوب گئے

عجیب طور سے راس آیا عمر کا دریا
اُسی سے پار لگے تھے اُسی میں ڈوب گئے

وہ جاہلانہ تکلّم پہ سرفراز.....
ہم اپنے لہجے کی شائستگی میں ڈوب گئے

بدلنا ہو گا اب انداز اپنے رونے کا
تمام بچے اچانک ہنسی میں ڈوب گئے

عجیب چیز تھی رنگینیٔ فریبِ بہار.....
جدھر نگاہ اُٹھی سادگی میں ڈوب گئے

سمجھ میں آیا نہ اُن کو شناوری کا مزاج
سمندروں سے نکل کر ندی میں ڈوب گئے

وہ جن کے دم سے اُجالوں کا تھا بھرم اے شان
غضب ہوا کہ وہی تیرگی میں ڈوب گئے

○

سرفرازنواز

(بھارت)

دنیا کہتی ہے مرے بیٹے تو کالا ہے بہت
تیرے دم سے مرے آنگن میں اجالا ہے بہت

زخم یاروں نے دئے ہیں مجھے اب تک جتنے
میں نے بھی ان کو تجربات میں ڈھالا ہے بہت

دل کی حالت کو سمجھتے کہاں دنیا والے
اپنے ہونٹوں پہ تبسم کو سنبھالا ہے بہت

راز یہ راز ہی رہتا ہے کہاں تک دیکھیں
اس نے پوچھا ہے بہت میں نے بھی ٹالا ہے بہت

بھوک محتاج نہیں میری شکم سیری کی
ماں کے ہاتھوں سے مجھے ایک نوالہ ہے بہت

وہ بھی اپنا ہے نوازؔ اور یہ دل بھی اپنا
کب گیا دل سے، اسے دل سے نکالا ہے بہت

○

عزیز نبیل

(دوحۂ قطر)

نہ جانے کیسی محرومی پسِ رفتار چلتی ہے
ہمیشہ میرے آگے آگے اک دیوار چلتی ہے

وہ اک حیرت کہ میں جس کا تعاقب روز کرتا ہوں
وہ اک وحشت مرے ہمراہ جو ہر بار چلتی ہے

نکل کر مجھ سے باہر لوٹ آتی ہے مری جانب
مری دیوانگی اب صورتِ پرکار چلتی ہے

عجب اندازِ ہم سفری ہے یہ بھی قافلے والو
ہمارے درمیاں اک آہنی دیوار چلتی ہے

غزل کہنا بھی اب اک کارِ بے مصرف سا لگتا ہے
نیا کچھ بھی نہیں ہوتا بس اک تکرار چلتی ہے

نبیلؔ اِس عشق میں تم جیت بھی جاؤ تو کیا ہوگا
یہ ایسی جیت ہے پہلو میں جس کے ہار چلتی ہے

○

سمیع نوید

(میانوالی)

تری نگاہ کے احسان کو بھی لے ڈوبا
وہ ایک درد جو مسکان کو بھی لے ڈوبا

مجھے خبر نہ تھی اور سوچ کے سمندر میں
میں اپنے ساتھ ہی شیطان کو بھی لے ڈوبا

یہاں خیال کے سودے میں ہی خسارا تھا
ترا وجود تو نقصان کو بھی لے ڈوبا

نگاہِ ناز کے نادان سے اشارے پر
وجود وجد میں وجدان کو بھی لے ڈوبا

جسے وصال کی بارش سے خوف آتا تھا
وہ اک نگاہ میں طوفان کو بھی لے ڈوبا

نوید حُسن کے شعلہ مزاج برزخ میں
میں اپنی ذات کے عرفان کو بھی لے ڈوبا

○

ہوا کے دوش پر

(ایک عام آدمی کی داستان حیات)

فیروز عالم

(کیلی فورنیا، امریکہ)

قسط.....۴

سالگرہ اور اسٹیج ڈرامہ

۱۹۴۷ سے ۱۹۵۰ تک ہمارے خاندان کے ان کنبوں کے علاوہ جو تقسیم کے وقت یوپی میں مقیم تھے سب ہی گھرانے میر پور خاص آ کر آباد ہو چکے تھے۔آپ کے لئے یہ شاید حیرت کا باعث ہو کہ جن لوگوں نے میر پور خاص بسایا ان لوگوں میں میری اماں کے ماموں زاد بھائی اور سید علی اصغر کے بیٹے صفات ماموں بھی شامل تھے۔وہ تقسیم سے پہلے یوپی میں پولس کے علیٰ افسر تھے اور انکے گھرانے کا معیار زندگی اور طور طریقے بھی ویسے ہی افسرانہ تھے مگر تقسیم کی اکھاڑ پچھاڑ سے وہ دلبرداشتہ اور اپنے مستقبل کی طرف سے غیر یقینی کا شکار تھے۔

اسی زمانے میں ذوالفقار بھائی جان جو پہلے ہی جودھپور ریلوے میں بڑی اہم پوسٹ پر فائز تھے اپنی ملازمت کی وجہ سے میر پور خاص میں بھی اسی پوسٹ پر تعینات ہو گئے۔انکا بنگلہ بڑا تھا اور انہوں نے جسکو بھی ضرورت تھی اسکی مدد کے لئے اپنے گھر کے دروازے کھول دئے۔صفات ماموں تو ویسے بھی انکے برادر نسبتی تھے۔انہوں نے بھی انکے یہاں عارضی رہائش اختیار کی اور اپنے مستقبل کے لئے اپنی بیگم کے مشورے سے یہ فیصلہ کیا کہ دودھ کا کاروبار شروع کیا جائے۔انکا خیال ہوگا کہ مستقبل میں یہ ترقی کر کے ایک بڑی ڈیری فارم کی شکل اختیار کر لیگا۔اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں جنہیں یہ یاد ہے کہ صفات ماموں نے گائیں خرید کر انکی دیکھ بھال شروع کی اور انکے گھر کی خواتین نے دودھ نکال کر بیچنے کا کام کیا۔خاندان والے اس پر حیران و پریشان تھے کہ کہاں صفات ماموں کا مرتبہ اور افسرانہ ٹھاٹ اور کہاں دودھ کا کاروبار!! وہ تو خدا کا شکر ہوا کہ سب نے اور خاص طور پر ذوالفقار بھائی جان نے انہیں سمجھایا اور زور دیا کہ وہ کراچی جا کر اپنے کوائف حکومت کے ارباب اختیار کو پیش کریں۔انہیں یقین تھا کہ ایسے اعلیٰ تربیت یافتہ شخص کو تو حکومت ہاتھوں ہاتھ لیگی۔کچھ ہی دنوں بعد انکی سمجھ میں یہ بات آ گئی اور انہوں نے کراچی کی راہ پکڑی اور انکو فوراً ہی وہاں سندھ پولس میں انسپکٹر کی جگہ پر کیماڑی میں تعینات کر دیا گیا۔یہ شاید انکی زندگی کا سب سے اہم موڑ اور خوش قسمت ترین لمحہ تھا۔اس کے بعد اللہ نے انکو بڑی عزت دی اور انہوں نے قابل رشک زندگی گذاری۔

اس دور کی دو تقریبات ایسی ہیں جنکا یہاں تذکرہ میرے لئے اہم بھی ہے اور دلچسپی کا باعث بھی۔

سعادت ماموں جان، جنکا میں تفصیلی تذکرہ پچھلے باب میں کر چکا ہوں، پاکستان بننے کے بعد میر پور خاص میں انسپکٹر آف ورکس کے عہدے پر ایک شاندار بنگلے میں رہ رہے تھے۔اپنے ذوق کے مطابق انہوں نے نہ صرف اپنے بنگلے کو خوبصورتی سے سجایا تھا بلکہ اسکے اطراف باغیچہ بھی نہایت نفاست اور دلفریب انداز سے ترتیب دیا تھا۔انکے سب سے بڑے بیٹے فرحت حسین کی پہلی بیٹی ناہید نسرین ان کی سب سے بڑی پوتی ہیں۔وہ شاید اس وقت چند سال کی تھیں۔سعادت ماموں نے اس غیر یقینی اور پر آشوب دور میں بھی ماحول کو خوشگوار بنانے کے لئے اس کی سالگرہ بڑی دھوم دھام سے منانے کا فیصلہ کیا۔اس میں انکی اکلوتی بیٹی اور ناہید کی بھوپی خورشید بانو کا بڑا ہاتھ تھا۔انکے بنگلے کے نفاست سے ترشے ہوئے لان میں میز کرسیاں لگی تھیں اور مہمان زرق برق لباس میں چہل قدمی اور خوش گپیاں کر رہے تھے۔ پھر کیک کٹنے اور کھانے کے بعد ایک مختصر محفل موسیقی بھی ہوئی جس میں سعادت ماموں جان ہی کے بیٹوں اور انکی بیٹی خورشید بانو، جنہیں ہم خشن آپا کہتے ہیں، نے مہمانوں کی تفریح طبع کا سامان فراہم کیا۔میرے ہوش سنبھالنے کے بعد یہ پہلی تقریب ہے جو مجھے یاد ہے وہ بھی ایک خواب کی طرح مگر اسکا ایک دلنواز سا تاثر اب بھی قائم ہے۔دوسری اہم چیز جو اس تقریب کی نسبت سے مجھے یاد ہے اور میرے لئے اہم ہے وہ یہ ہے کہ سعادت ماموں جان کے بیٹے عشرت حسین کو جو اس وقت ڈاؤ میڈیکل کالج میں تعلیم حاصل کر رہے تھے میں نے پہلی دفعہ دیکھا۔میرے دادا ڈاکٹر مظفر حسین سے پہلے اور انکے بعد ہمارے خاندان میں کوئی ڈاکٹر نہیں بنا تھا اس لئے عشرت بھائی جان کی اس نسبت سے بڑی شہرت تھی اور سب انہیں بڑی عزت اور اشتیاق سے دیکھا کرتے تھے۔میں نے انکا تذکرہ بہت سنا تھا۔جیسا میں نے پہلے بھی لکھا ہے میرے والد نے تو میرے ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی اتنی دفعہ میرے کان میں یہ کہا تھا کہ میرا بیٹا اپنے دادا جیسا ڈاکٹر بنے گا بلکہ وہ تو یہ کہتے تھے کہ اپنے دادا سے بھی بڑا ڈاکٹر بنے گا کہ مجھے بھی ہوش سنبھالتے ہی اس بات کی آگاہی ہو گئی تھی کہ میں بھی اسی راہ پر چلنے والا ہوں جس پر عشرت بھائی جان چل رہے ہیں۔مجھے اس تقریب کی یہ بات بھی یاد ہے کہ میں نے اپنے چھوٹے اور ناپختہ ذہن سے انہیں بار بار دیکھا اور اپنے آپ کو بتایا کہ ایسے ہوتے ہیں ڈاکٹر بننے والے۔۔کیا ان میں کوئی خاص بات ہے؟؟ پھر سوچا ہیں تو ایک انسان ہی، میرے ہی جیسے۔۔ہاں مجھ سے بڑے ہیں اور مجھ سے خوبصورت بھی۔پھر نہ جانے خیالات گڈمڈ ہو گئے مگر یہ بات اپنی جگہ پر حقیقت ہے کہ اپنے دادا کو تو میں نے نہیں دیکھا تھا مگر بعد میں اپنے ڈاکٹر بننے کی جدوجہد کے دوران مجھے جس انسان کا بار بار خیال آتا تھا کہ وہ ڈاکٹر ہیں تو وہ عشرت بھائی جان ہی تھے۔

دوسری تقریب اگر اسے تقریب کہا جائے، بہت بڑے پیمانے پر

منعقد کی گئی تھی۔

ذوالفقار بھائی جان کو اسٹیج اور موسیقی سے خاص لگاؤ تھا۔ وہ اپنے کالج کے زمانے میں اور اسکے بعد اپنی ملازمت کے دور میں بھی کئی اسٹیج ڈراموں میں کام کر چکے تھے۔ انہوں نے کئی ڈراموں کی ہدایت کاری کے فرائض بھی انجام دئے تھے اور انہوں ہی نے جودھپور ریلوے میں ڈرامہ کلب کی بنیاد رکھی تھی۔ اب اس نوزائدہ ملک کی عملی مدد کرنے کے لئے انہوں نے یہ پراگرام بنایا کہ امدادی کاموں کے لئے رقم اکھٹی کرنے کے لئے ایک اسٹیج ڈرامہ کیا جائے اور اسکی آمدنی مہاجرین کی امداد اور کشمیر میں جدوجہد کے لئے مختص کی جائے۔

میں ظاہر ہے اسوقت بہت چھوٹا تھا اسلئے یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ یوں تو مجھے بھی کچھ خواب جیسا یاد ہے مگر زیادہ تر اس ڈرامے کی یاد اس وجہ سے ہے کہ اس کے کئی سال بعد بھی ہمارے گھر میں اسکا تذکرہ ہوتا رہا۔

کشمیر ہی کے حوالے سے ایک کہانی لکھی گئی کہ وہاں ظلم اور طاقت کے استعمال کے باوجود حریت کے پروانے کیسی بے جگری سے ڈوگرہ اور بھارتی فوج سے مقابلہ کر رہے ہیں اور عورتیں بھی بہادری سے اپنے مردوں اور جانباز سپاہیوں کا ساتھ دے رہی ہیں انکے گھر میں روزانہ رات دیر گئے ڈرامے کی ریہرسل ہوتی اور سارے خاندان والے وہیں جمع ہوجاتے تھے۔ چائے کے لمبے لمبے دور چلتے اور ہم بچوں کی عید ہوجاتی کہ ہمیں رات گئے تک کھیلنے کا موقع مل جاتا۔ ڈرامے میں کام کرنے والے اسّی فیصد لوگ ہمارے اپنے ہی خاندان سے تھے اور ان میں کردار اور عمر کی مناسبت سے کچھ خواتین بھی شامل تھیں۔

ذوالفقار بھائی جان ہی کے بنگلے کے بہت بڑے آنگن میں ریلوے کے عملے اور دوسرے افسران کے تعاون سے اسٹیج بنایا گیا۔ اس کے سیٹس کے لئے میرپورخاص ہی کے ایک پینٹر (جسکا نام شاید آج بھی لوگوں کو یاد ہو یعنی شفیع پینٹر) سے مختلف پردے پینٹ کروائے گئے۔ موسیقی کے لئے علیحدہ سے سازندوں کا انتظام کیا گیا تھا اور پھر تین دن تک یہ ڈرامہ اسٹیج ہوا۔ لوگوں میں اس ڈرامے کے سلسلے میں زبردست جوش وخروش پایا جاتا تھا اور اسکی بہت زیادہ پذیرائی ہوئی۔

کہا جاتا ہے کہ اسکی پیشکش کسی بھی پیشہ ورانہ ڈرامہ کمپنی کی پیشکش سے کم تر نہیں تھی۔ کئی سال بعد میرپورخاص کے ریلوے ملازمین نے سالانہ ڈرامہ کرنے کی روایت ڈالی جسکا تذکرہ میں مناسب وقت پر کرونگا مگر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس روایت کی بنیاد ہمارے خاندان ہی نے ذوالفقار بھائی جان کی قیادت میں رکھی تھی۔

اس کے بعد حالات تیزی سے تبدیل ہوئے اور یہ کنبہ جس نے پاکستان کو دل وجان سے قبول کیا تھا اسے اپنے اس فیصلے کی قیمت ادا کرنی پڑی۔

سب سے پہلے سعادت ماموں کا تبادلہ پنجاب کے ایک دور دراز شہر کیمبل پور ہوگیا اور وہ میرپورخاص سے ایسے جدا ہوئے کہ پھر شاید اپنی باقی زندگی میں صرف ایک ہی دفعہ میری اماں سے ملنے میرپورخاص آئے۔

اس کے بعد پاکستان ریلوے کے نئے اور غیر منصفانہ قوانین اور برتاؤ نے اُن سب لوگوں کے لئے شدید مسائل پیدا کردئے جنہوں نے رضاکارانہ طور پر اپنی ملازمتوں کو جودھ پور ریلوے سے پاکستان کی نارتھ ویسٹرن ریلوے کو منتقل کیا تھا انہوں نے سوچا تھا کہ وہ ذہنی یکسوئی سے اس نئے ملک کی خدمت کرینگے۔ مگر انکے یہ خواب مکمل نہ ہوسکے۔ اسکا تذکرہ آئندہ باب میں آئیگا۔

ریلوے کالونی

میرپورخاص کا ریلوے محلّہ جسے ریلوے کالونی کہتے تھے اس قدر بڑا تھا کہ یہ باقی پورے شہر کا نصف تھا۔ اگر ریلوے اسٹیشن کو مرکز مان لیا جائے تو اسکے چاروں طرف ریلوے ملازمین کے رہائشی مکانات تھے۔ اسکے شمال مشرق میں کھڈرولائن کا محلّہ تھا، جنوب مشرق میں لوکو کے ملازمین کی کالونی تھی، اسٹیشن کے سامنے افسران کے بنگلوں کی قطاریں تھیں جنوب مغرب میں کیرج کے عملے اور ٹکٹ چیکروں کے مکانات تھے اور شمال مغرب میں ہمارا محلّہ جس میں ریلوے کے مختلف شعبوں کے ملازمین رہتے تھے۔

اگر میں یہ کہوں کہ ریلوے افسران کی سول لائن کو چھوڑ کے ہمارا محلّہ سب سے اچھا تھا تو اس میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ اس کی ایک بڑی وجہ اس کا محل وقوع تھا۔ جہاں اور تین محلّوں کے پاس یا تو جنگل تھا یا ان کے نزدیک کارخانے اور ملیں تھیں وہاں ہمارے محلے کے بالکل پیچھے سول ہسپتال روڈ تھی جس کے دونوں جانب نیم کے سایہ دار درخت تھے اور جس کا اختتام سول ہسپتال پر ہوتا تھا۔ اسکی پشت سے ایک لمبی سڑک شہر کے سب سے بارونق چوک کو جاتی تھی جسکے مقابل شہر کا مین پوسٹ آفس، تار گھر اور ٹیلیفون کا محکمہ تھا۔ اس سڑک کے دونوں جانب وکیلوں کے دفتر اور ڈاکٹروں کے کلنک تھے۔ اور اس سے بڑھ کر یہ کہ سب سے اہم پلیٹ فارم، جہاں سے حیدرآباد جو سندھ کا دوسرا بڑا شہر تھا گاڑیاں جاتی تھیں، اس محلے کے اور خاص طور سے ہمارے گھر کے بالکل سامنے تھا۔ دن بھر بلکہ رات کے گیارہ بجے تک ایسی رونق رہتی تھی کہ پھر وہ رونق میں نے امریکی شہروں میں بھی نہیں دیکھی، خیر امریکی شہروں میں تو رونق بالکل نہیں ہے ہاں یورپ کے شہر کہیں زیادہ بارونق ہیں۔

ہمارے گھر کے بالکل سامنے ایک بہت بڑا اور گھنا نیم کا درخت تھا۔ یہ درخت حقیقت میں اس قدر بڑا تھا کہ یہ پورے شہر میں مشہور تھا اور اسی نسبت سے ہمارا گھر انہ اور خاص طور سے میری والدہ میرپورخاص میں نیم والی خالہ مشہور ہوگئیں تھیں۔ یہ درخت مکمل طور پر ہمارے گھر کو اپنے سائے میں لئے تھا اور اسکی وجہ سے ہمارا گھر ہمیشہ ٹھنڈا رہتا تھا سخت گرمیوں اور تیز دھوپ کے زمانے میں محلے والے ہم سے حسد کیا کرتے تھے۔ ہمارے گھر کے پیچھے جو کوارٹروں کی لائن تھی اس کے متوازی، ذرا سے فاصلے پر بھی نیم کے گھنے درختوں کی ایک قطار تھی جس نے محلے کے اطراف ایک فصیل سی بنادی تھی۔ کبھی گرمیوں کی شام کو جب ہم اپنے صحن میں بستروں پر لیٹتے تو ہمیں نیلے آسمان کے پس منظر میں گہرے سبز رنگ کی یہ فصیل

نظر آتی جو ہماری نگاہوں کے لئے ایک دلفریب منظر پیش کرتی تھی۔

ہمارے گھر کے سامنے کوئی دوسو گز کے بعد لوہے کا جنگلہ تھا جسے تاڑیاں کہتے تھے۔ اسکے فوراً بعد ریلوے کی پٹڑی تھی اور پھر ایک صاف ستھرا اور پختہ بنا ہوا پلیٹ فارم تھا جس پر مختلف اسٹالز تھیں جن میں مسافروں کی سہولت کے لئے کتابیں، کھانے پینے کی اشیاء اور چائے اور دوسرے لوازمات فروخت ہوتے تھے۔ گاڑی کے آتے ہی کئی قسم کی آوازوں سے ماحول گونج اٹھتا تھا۔ چائے گرم، چٹ پٹے چھولے، گرما گرم پکوڑے، سوڈا لیمن اور پلاّ مچھلی کی آوازیں ایک خاص لحن اور ترنم سے ہمارے کانوں میں پڑتی تھیں۔ اس پلیٹ فارم سے اٹھارہ گھنٹوں میں آٹھ گاڑیاں آتی اور آٹھ گاڑیاں جاتی تھیں ابھی ایک گاڑی کا ہنگامہ ختم ہوتا نہیں تھا کہ دوسری گاڑی کی تیاریاں شروع ہو جاتی تھیں۔ جو لوگ اس شور و ہنگامے کے عادی نہیں تھے وہ ہمارے یہاں آ کر بڑے پریشان ہوتے تھے اور حیرت سے پوچھتے تھے کہ اس شور شرابے میں ہم کیوں کر آرام کرتے ہیں اور خاص طور پر بچوں کی پڑھائی کیسے ہوتی ہے تو ہم صرف انہیں چھیڑنے کے لئے یہ کہا کرتے تھے کہ اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے۔

حقیقت تو یہ تھی کہ ہمیں تو یہ ہنگامہ بہت اچھا لگتا تھا اور اگر کبھی کسی وجہ سے کچھ دنوں کے لئے یہاں گاڑیاں آنا بند ہو جاتی تھیں تو ہمارا دم گھٹنے لگتا تھا اور میری اماں کہا کرتی تھیں کہ ''اللہ معاف کرے۔ کیسا موت کا سا سناٹا ہے''

دوسو گز کی یہ میدانی پٹی اور اسکے ساتھ ساتھ لوہے کی تاڑیاں بھی شرقاً غرباً چوتھائی میل تک پلیٹ فارم کے ساتھ ساتھ چلی گئی تھیں مگر اسی کے ساتھ خوبصورتی کی یہ بات تھی کے تاڑیوں کے ذرا اندر قطار سے سرس کے درخت تھے جو بالکل ایک ہی قد و قامت کے تھے اور موسم بہار میں ان درختوں پر بہت نازک نازک پھول لگتے تھے اور انکی مہک سے پورا محلّہ خوشبو میں بس جاتا تھا۔ کبھی صبح اٹھ کر ہم دیکھتے تھے کہ زمین پر پھول بکھرے ہوئے ہیں اس سے ماحول میں جادوئی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی۔

میں بڑے دکھ سے یہ لکھ رہا ہوں کہ بعد میں بڑی لائن ڈالنے کی وجہ سے ریلوے نے یہ سب کچھ توڑ دیا سارے درخت کاٹ ڈالے گئے جس میں ہمارا پیارا نیم بھی شامل تھا اور وہ تاڑیاں اور سرس کے پھولوں سے لدے درخت بھی بلڈوزر کا نوالہ بن گئے۔ اسی کے ساتھ ہمارے گھر کا وہ ہوادار ٹیرس بھی توڑ دیا گیا۔ کیا ہوا اگر اب وہ خوبصورت ماحول نہیں؟ میرے ذہن اور میرے تخیّلات میں تو وہ مناظر ویسے ہی زندہ اور جاوداں ہیں جیسے جب تھے۔ انہیں تو کوئی نہیں مٹا سکتا۔ میں تو اب بھی ''ایک ذرا گردن جھکائی دیکھ لی'' کے مصداق جب چاہے انہیں دیکھ سکتا ہوں۔

میر پور خاص

میر پور خاص تقسیم ہند سے پہلے جودھپور سے حیدر آباد کی مین لائن پر ایک بہت بڑا اور اہم جنکشن تھا۔ یہ چھوٹی لائن جسے میٹر گیج کہتے ہیں کا اسٹیشن تھا۔ اگر چہ میر پور خاص سندھ میں واقع تھا مگر اس کا ریلوے اسٹیشن جودھپور ریلوے کی ملکیت تھا اور اسکا انتظام بھی جودھپور ریلوے ہی کے افسران کی ذمہ داری تھی۔ اسکی تعمیر کی خاص وجہ یہ تھی کہ کراچی کو بمبئی سے براہ راست اور چھوٹے ترین راستے سے ملا دیا جائے تا کہ ان دونوں ساحلی شہروں کے تاجروں کے لئے، جو زیادہ تر ہندو اور پارسی برادری سے تعلق رکھتے تھے، سہولت ہو جائے۔ بعد میں میر پور خاص کو مرکز بنا کر سندھ کے دوسرے چھوٹے شہروں کو بھی اس سے ملا دیا گیا۔ یہاں سے نواب شاہ، حیدر آباد، ڈگری اور تھر کے دوسرے علاقوں کو گاڑیاں جاتی تھیں۔ میر پور خاص اور جودھپور کے درمیان تقریباً دوسو میل کے فاصلے میں صرف باڑ میر ایک نسبتاً بڑا اسٹیشن تھا مگر وہاں بھی ریلوے کا اتنا بڑا اسٹاف نہیں تھا۔ پھر اتنی بہت سی ریل گاڑیوں کی آمد و رفت کے لئے جو انجن درکار تھے انکی دیکھ بھال کے لئے ایک بہت بڑا یارڈ اور لوکو شیڈ تھا۔ دراصل میر پور خاص یوں تو حیدر آباد سندھ سے بہت چھوٹا تھا مگر اسکا ریلوے کا یارڈ، اس سے وابستہ ملازمین کی تعداد، انکی کالونیاں، ریلوے کے میکینکل ESTABLISHMENTS/ ریلوے ہسپتال، بچوں کے اسکول اور دوسری سہولتیں حیدر آباد سے کہیں زیادہ بڑی اور وسیع تھیں۔

اسی نسبت سے اس کا ریلوے پلیٹ فارم تھا جس کے لئے مشہور تھا کہ یہ پورے پاکستان میں سب سے طویل پلیٹ فارم ہے۔ یہ پختہ تھا اور اسکی سطح جودھپور کے سرخ پتھروں سے مزین تھی۔ کراچی میں سندھ چیف کورٹ، اسمبلی بلڈنگ اور کلفٹن کی چوبرجی بھی اسی تراشیدہ پتھر سے تعمیر ہوئی ہیں۔ اس وجہ سے یہ بہت خوبصورت لگتا تھا۔ پلیٹ فارم سے متصل دفاتر اور دوسری انتظامی عمارتیں سرخ اینٹوں سے بنی تھیں اور ان کے سامنے محراب نما برآمدے تھے۔ ان تمام عمارتوں پر سال میں دوبار رنگ و روغن ہوتا تھا۔ عمارتوں کی دونوں جانب گاڑیوں کی آمد و رفت کے لئے بڑے بڑے سائبان تھے اور اس طرح اسکا نقشہ کچھ ایسا بن جاتا تھا کہ ایک بہت بڑا عقاب دونوں جانب پر پھیلائے کھڑا ہے۔ شہر کے بہت سے لوگ صرف تفریحاً شام کو ریلوے پلیٹ فارم پر ٹہلنے آتے تھے۔ ایسا پر اثر اور پر شکوہ منظر تھا کہ میر پور خاص میں رہنے والے اور وہاں پل بڑھ کر جوان ہونے والے کسی بھی فرد کے ذہن سے یہ منظر مٹ نہیں سکتا اور ہم سب جو اس دور کی پیداوار ہیں اس بات پر متفق ہیں کہ ہمیں اس ریلوے اسٹیشن پر انتہائی ناز تھا۔ میں سالوں سے میر پور خاص نہیں گیا ہوں مگر مجھے بتایا گیا ہے کہ اب دیکھ بھال کی کمی، توجہ کے فقدان اور ناقدری کے سبب یہ سب ایک کھنڈر کی شکل اختیار کر گیا ہے۔

ایسا ہونا تو نہیں چاہئے تھا مگر جب میرے افغان دوست مجھے بتاتے ہیں کہ امیر تیمور کے مقبرے کا یہ عالم ہے کہ وہاں اب صرف ٹوٹے پھوٹے پتھر اور ایک لمبوترا مینار ہی رہ گیا ہے تو میرے ذہن میں سوال اٹھتا ہے کہ ایسا کیوں ہے کہ یورپ اور انگلینڈ میں تو عام جاگیرداروں تک کی بارہ سو سال پرانی حویلیاں MANOR HOMES آج بھی ویسی ہی خوبصورت اور اچھی حالت میں ہیں اور ہمارے یہاں ماضی سے منسوب ہماری کسی بھی چیز کو محفوظ نہیں کیا گیا۔

پھر میر پور خاص کا ریلوے اسٹیشن تو قومی تناظر میں ایک انتہائی بے حقیقت چیز تھی اس کی بربادی کا توڈکر ہی کیا!!

پہلی مشکل

میر پور خاص میں رہائش اختیار کرنے اور جودھ پور ریلوے سے پاکستان کی نارتھ ویسٹرن ریلوے میں ملازمت کی منتقلی کے بعد جو سب سے بڑی مشکل درپیش آئی وہ یہ تھی کہ نارتھ ویسٹرن ریلوے نے جو متحدہ ہندوستان کی سب سے بڑی اور باعزت ریلوے تھی اور جسکی پٹریوں کا تمام کا تمام جال صرف بڑی لائن پر مشتمل تھا جودھ پور ریلوے جیسی چھوٹی لائن اور ریاستی ریلوے کمپنی کو اپنے ہم پلہ اور برابر ماننے سے انکار کر دیا اور یہ تجویز پیش کی کہ جودھ پور ریلوے کے ہر ملازم کو ایک یا دو درجے گرا کر ملازمت میں رکھا جائیگا۔

اس فیصلے سے جودھ پور ریلوے کے ہر ملازم کی زندگی میں زبردست فرق پڑنا لازمی تھا۔ نہ صرف تنخواہوں میں کمی ہو جاتی بلکہ طریقہ زندگی بھی بدل جاتا۔ اس کی مثال یہ ہے کہ میرے ابّا جو پاکستان آنے سے پہلے اکیس سال کی ملازمت کا تجربہ رکھتے تھے اور اس وجہ سے سینئر کیڈر میں آچکے تھے انہیں اب نسبتاً آسان ڈیوٹیاں دی جاتی تھیں اور خاص طور سے مال گاڑیوں کی ڈیوٹی سے وہ مستثنیٰ تھے۔ یہ مشکل کام نئے بھرتی ہونے والے گارڈوں کے ذمہ تھا۔ اب انکے گریڈ گرانے سے انکو ایک بار پھر بالکل نئے رکھے جانے والے گارڈوں کی طرح مشکل کام، لمبی ڈیوٹیاں اور مال گاڑیوں پر جنکے کوئی اوقات نہیں ہوتے بھی کام کرنا پڑتا۔ اس کے علاوہ یہ عزت کا بھی سوال تھا اور اصول کا بھی کیونکہ جودھ پور ریلوے کے عملے کی ٹریننگ کل ہند ریلوے ٹریننگ سینٹرز ہی میں انہی گارڈوں کے ساتھ ہوئی تھی جنہوں نے بعد میں نارتھ ویسٹرن سمیت دوسری ریل کمپنیوں میں ملازمت اختیار کی تھی۔ انہوں نے ایک ہی جیسے کورس کئے تھے اور ایک ہی جیسے محکماتی امتحان پاس کئے تھے۔

جودھپور سے آنے والے تمام گارڈز اس بات پر اڑ گئے ان میں سلطان احمد، محمد احمد، جمیل الرحمان، مکرم الدین، قدرت اللہ اور دوسرے چند گارڈز تھے جو اس جنگ میں پیش پیش تھے۔ انکا کہنا یہ تھا کہ اگر اس مسئلے پر ہمیں اپنی نوکریوں سے مستعفی بھی ہونا پڑا تو ہم یہ تکلیف گوارا کر لینگے مگر اس بے عزتی کو گوارا نہیں کریں گے۔ ان لوگوں نے ریلوے بورڈ کو درخواستیں دیں اور سب نے مل کر ایک وکیل کیا۔ کل گیارہ گارڈ تھے۔ بقول انکے ہم ریلوے بورڈ کو ہلا دینگے۔ معاملہ بہت آگے بڑھ گیا۔ ریلوے بھی اپنی جگہ پر اڑی تھی۔ ایک وفد وزیر اعظم لیاقت علی خان سے بھی ملا مگر انہوں نے بھی صرف زبانی وعدہ کیا اور کوئی ٹھوس مدد نہیں کی۔

اب ان تمام گارڈوں نے فیصلہ کیا کہ انکے پاس استعفیٰ دینے کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں۔ میر پور خاص کے ریلوے ریسٹ ہاؤس میں میٹنگ ہوئی۔

یہ تمام گارڈز میرے ابّا سے عمر میں اوسطاً دس سال بڑے تھے اور انکے سب کے بچے نہ صرف جوان تھے بلکہ اپنے پیروں پر کھڑے تھے اور ایسی ملازمتیں کر رہے تھے کہ انکے لئے اپنے والدین کو سپورٹ کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ ادھر میرے ابا کے بچے تو بہت چھوٹے تھے۔ میں آپ کو بتا ہی چکا ہوں کہ میرے ابّا کے شروع کی پانچ اولادیں تو یکے بعد دیگرے پیدائش کے بعد ہی فوت ہو چکی تھیں۔ اس وقت سلطان بھائی جان شاید چھٹی یا ساتویں جماعت میں تھے۔ دردانہ ابھی پیدا بھی نہیں ہوئی تھی اور میں تین چار سال کا تھا۔

ایسی حالت میں اتنا سنگین اور جذباتی قدم اٹھانا ممکن ہی نہیں تھا۔ گارڈوں نے سمجھایا کہ یہ تو صرف دھمکی ہے ہمیں یقین ہے کہ ریلوے ہمیں ہاتھ جوڑ کر فوراً واپس بلا لیگی۔ مگر میرے ابّا نے انہیں نہایت خاکساری سے اپنے حالات بتا کر کہا کہ وہ استعفیٰ نہیں دینگے اور جیسے بھی ہو اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے یہی نوکری کرتے رہینگے۔ آخر کار میرے ابّا اور ایک دوسرے گارڈ عبدا لغفور صاحب نے استعفیٰ نہیں دیا باقی نو گارڈوں نے استعفیٰ دیدیا۔

اس کے بعد ان مستعفی گارڈوں نے بہت ہاتھ پیر مارے، کئی کئی دفعہ وفد لیکر وزیر اعظم اور گورنر جنرل کے پاس گئے مگر یہ لوگ دوبارہ نوکری پر نہیں چڑھ سکے۔ ان میں سے کچھ کے حالات بہت دگرگوں ہو گئے۔ کچھ نے اپنے پیسے سے چھوٹے موٹے کاروبار کئے مگر انہیں کاروبار کا کوئی تجربہ نہ تھا اس لئے وہ پیسہ بھی ڈوب گیا۔ یہ بیچارے دن رات ابّا اور دوسرے ریلوے ملازمین کے پاس آکر اس بات پر پچھتاتے تھے کہ جلد بازی اور جذبات میں غلط فیصلہ کیا۔

ادھر شروع میں تو ابا کا درجہ گرایا گیا اور کچھ مہینے دوبارہ مال گاڑیوں کی ڈیوٹی بھی کرنی پڑی مگر جلد ہی ریلوے نے انکی کارکردگی دیکھ کر انہیں انکے پرانے سینئر گریڈ میں دوبارہ فائیز کر دیا اور یہ اپنی نوکری گزشتہ معمول کے مطابق ہی کرنے لگے۔ ہم بچوں میں اس سے خوشی کی لہر دوڑ گئی اور جب پہلی دفعہ ابّا دوبارہ مسافر گاڑی کے گارڈ انچارج بن کر گاڑی لیکر گئے تو میں انہیں دور تک چھوڑنے ان کے ساتھ پلیٹ فارم پر گیا۔

مجھے ہمیشہ اس بات کا خیال آتا ہے اور اس سے میرے دل میں اپنے ابّا کی عزت اور احترام اور بڑھ جاتا ہے کہ انکی زندگی میں انکے بیگم بچوں کی بہبود سب سے افضل اور مقدم تھی اور اس میں اگر انہیں زیادہ محنت و مشکل بھی درپیش آئی تو انہوں نے اس سے کبھی جی نہیں چرایا۔

نارتھ ویسٹرن ریلوے کے اس فیصلے سے یوں تو بہت سے لوگ متاثر ہوئے مگر اس سے جو فرد شدید ترین طور پر متاثر ہوا وہ ذوالفقار بھائی جان تھے۔ وہ خود کہتے تھے کہ انکی زندگی کے اتار چڑھاؤ ایسے عبرت ناک ہیں کہ اس سے دوسروں کو سبق لینا چاہئے۔ وہ یہ بھی کہتے تھے (اگرچہ یہ صرف انکا اپنا خیال تھا اور انکی خاکسار فطرت کی عکاسی کرتا تھا کہ شاید انہوں نے کسی لمحے غرور کا کوئی کلمہ بولا ہو جس کی سزا میں انکو بارہ سال کی گردش مکمل کرنی پڑی)۔ حالانکہ میری

نظر میں اسکی توجیہ یہ ہے کہ جوش وجذبات میں انسان سے ایسے فیصلے ہو ہی جاتے ہیں اور انکا خمیازہ بہرحال پھر اسی کو بھگتنا پڑتا ہے۔

جودھپور ریلوے ایک بہت ہی پس ماندہ علاقے میں بنائی گئی تھی جہاں عام آبادی میں تعلیم کا فقدان تھا۔ چھوٹے چھوٹے گاؤوں میں لوگوں نے پڑھے لکھے لوگ اور انگریز افسروں جیسی شان والے دیسی نہیں دیکھے تھے اس لئے یہاں کا رواج ہو گیا تھا کہ عام لوگ اور ریلوے کا نچلے درجے کا عملہ ریلوے کے بڑے اور بااختیار افسروں کی بیحد عزت کرتا تھا اور انہیں راجہ اور بادشاہوں کا درجہ دیتا تھا۔ ذوالفقار بھائی جان اس زمانے کے لحاظ سے ریلوے کے بڑے افسر تھے اور انکے زیر انتظام ایک بڑا علاقہ تھا۔ یہ جب کبھی معائنے کے لئے اپنے دورے پر نکلتے تھے تو ہر جگہ انکو نہ صرف جھک جھک کر سلام کیا جاتا تھا بلکہ لوگ دو قطاروں میں ہاتھ جوڑ کر اور گردنیں جھکا کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ حتیٰ کہ اس قسم کے غلامانہ سلوک میں چھوٹے موٹے افسر جیسے اسٹیشن ماسٹر وغیرہ بھی شامل تھے۔ یہ ایک طرز زندگی تھا جس کے یہ عادی ہو گئے تھے۔ اگرچہ یہ خود بیحد منکسر المزاج اور خاکسارانہ فطرت کے مالک تھے اور چاہتے تھے کہ لوگ اس روش کو ترک کر دیں مگر انگریزی راج کے زمانے میں حکومت کی عزت اور رعب و دبدبہ قائم رکھنے کے لئے پورے ملک ہی میں اس قسم کے طریقے رائج تھے اور دانستہ یا نا دانستہ طور پر یہ بھی اس قسم کے طور طریقوں کے عادی ہو گئے تھے۔

پاکستان کے قیام کے فوراً بعد میرپورخاص میں انہوں نے شروع میں جودھپور ریلوے کے زیر انتظام اپنی وہی ملازمت شروع کی اور اسی ٹھاٹ باٹ سے رہنے لگے۔ انکے ماتحت نارتھ ویسٹرن ریلوے کا ایک اسٹیشن ماسٹر تھا جو انکو ہر معاملے میں جواب دہ تھا اب جب جودھپور ریلوے نے اپنا تمام چارج نارتھ ویسٹرن کو منتقل کیا تو اسی اصول کے تحت ان کو حکم ملا کہ انکا درجہ گرا دیا جائیگا اور نہ صرف انہیں نچلے درجے کا اسٹیشن ماسٹر بنایا جائیگا بلکہ قسمت کی گردش انہیں یہ بھی دکھا رہی تھی کہ اب وہ اسی اسٹیشن ماسٹر کے ماتحت ہونگے جو کبھی انکے ماتحت تھا۔ ماضی میں انہوں نے تو بہت شاندار زمانہ گذارا تھا، کل ہند کے سب سے باعزت ریلوے ٹریننگ اسکول چندوسی سے اعلیٰ درجے کا پیشہ ورانہ امتحان پاس کیا تھا اور جودھپور ریلوے میں اپنی کارکردگی سے اپنے انگریز افسروں کی آنکھ کا تارہ تھے۔ انکی انا یہ ناانصافی کیسے برداشت کرتی۔ شروع میں تو منطقی کوشش کی کہ پاکستان ریلوے انکی قدر و منزلت پہنچانے مگر جب محسوس ہوا کہ ریلوے اپنی پالیسی تبدیل نہیں کرے گی تو انہوں نے نتیجے کی پرواہ کئے بغیر آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً استعفیٰ دیدیا۔ ریلوے کو یہ استعفیٰ منظور کرنے میں کوئی دیر نہیں لگی اور یہ چند ہی دنوں میں بے روزگار ہو گئے۔ جلد ہی بنگلہ بھی خالی کرنا پڑا اور یہ اپنے بچوں کو لیکر جو ابھی چھوٹے ہی تھے، کہ سب سے بڑے بیٹے انصار حسین بھی ابھی صرف گیارہ بارہ سال ہی کے تھے، قسمت آزمانے کراچی چلے گئے۔ وہاں رہنے کا بھی ٹھکانا نہ تھا اور اسکے بعد یہ تقریباً نو سال تک اپنے برادر نسبتی صفات حسین کے ساتھ انکے پولیس کے بنگلے میں رہے۔ یہ کیسے انقلابات زمانہ ہیں کہ پاکستان بننے کے بعد صفات حسین دودھ کا کاروبار کرنے اور اپنا گھر نہ ہونے کی وجہ سے انکے یہاں کچھ مہینے رہے تھے اور اب یہ انکے یہاں پناہ گزین تھے۔

کراچی میں اپنے ایک بیٹے اور پانچ بیٹیوں کے ساتھ شروع میں یہ جن مشکلات اور دشوار ترین حالات سے گزرے اسکا ذکر آئندہ کسی باب میں آئیگا مگر یہاں اسکا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ کئی سالوں کی مشقت اور مسلسل محنت کے بعد اور اپنی صلاحیتوں کے زور پر انہوں نے ایک بار پھر کامیابی کی منزلیں طے کیں اور اللہ نے ایک بار پھر انکی زندگی میں فارغالبالی اور عزت اور مرتبہ عطا کیا اور یہ ایک بار پھر خاندان کے صف اول کے افراد میں شمار کئے جانے لگے۔ بعد میں تو یہ اور انکی اولاد یہ کہتی تھی کہ شاید اللہ تعالیٰ کی اس میں بہت مصلحت تھی کہ انکی ریلوے کی نوکری چھوٹ گئی ورنہ جو عروج اور ترقی اس کنبے کو بعد میں کراچی میں حاصل ہوئی وہ شاید میرپورخاص اور ریلوے کے دیگر چھوٹے شہروں میں رہنے کی وجہ سے کبھی حاصل نہ ہوتی۔

بقیہ: ایک صدی کا قصّہ

ہیں۔ شانتارام جی کو اپنی ساٹھ سالہ فلمی زندگی میں کافی اعزازات سے نوازا گیا۔ سب سے زیادہ ایواڈ تو اُنہیں فلم ''دو آنکھیں بارہ ہاتھ'' کے لئے ملے جن میں 1958 میں نیشنل فلم ایواڈ، 1958 میں اسی فلم کے لئے برلن فلم ایواڈ اور ocic ایواڈ، 1959 میں گولڈن گلوب ایواڈ اور سیمیل گولڈ وین ایواڈ، 1985 میں دادا صاحب پھالکے ایواڈ اور 1992 میں پدم وبھوشن ایوارڈ۔

بالآخر انڈین فلم انڈسٹری کا یہ نابغہ روزگار فلم ساز، ہدایتکار، اداکار 30 اکتوبر 1990 کو ان گنت و بے شمار کارہائے نمایاں انجام دے کر قریب نوّاسی برس کی عمر میں سفرِ آخرت پر روانہ ہو گیا۔

وی۔ شانترام نے فلم کی تکنیک میں جو عظیم کارنامے انجام دیئے اس کی پیروی کرنا نہ صرف جونیئر و نوآموز ہدایتکاروں کے لیے باعث اعزاز ہے بلکہ اُن کے لازوال کارہائے نمایاں کی بڑے سینئر اور نامور ہدایتکار بھی پیروی کرنا فخر کی بات گردانتے ہیں۔

اپنی بات ختم کرنے سے قبل ایک واقعہ رقم کرنا لازمی ہے۔ اقا صاحب کی زندگی میں ایک بڑے اور نامور ہدایتکار سے انٹرویو کے دوران دریافت کیا گیا کہ تمہاری کوئی ایسی خواہش ہے جسے پورا کر کے تم خود کو مکمل تصور کرو۔ اپنے وقت کے اس بڑے اور نامور ہدایتکار نے ٹھنڈی سانس بھر کر مختصر جواب دیا:

''وی۔ شانترام کا اسسٹنٹ بننا''

اِقراء

(یعنی اسے بھی پڑھیے)

صفوت علی صفوت

(یو۔ایس۔اے)

ہمارے ذہن میں جب تتلی کا تصور آتا ہے تو ایک ناتواں، خوبصورت، رنگ برنگی، پھولوں پر اُڑتی ہوئی، ہمارے دلوں کو بھاتی ہوئی ایک چیز نظر آتی ہے۔ شاعروں اور ادیبوں نے تتلیوں کو اسی رنگ میں پیش کیا ہے۔ مگر شمالی امریکہ میں ایک ایسی تتلی رہتی ہے جسے ہم Monarch Butterfly کہتے ہیں۔ میں پیار سے اِسے ''شاہی تتلی'' کہتا ہوں۔ یہ بھی ہمارے ملک کی تتلیوں کی طرح ہے مگر دیکھنے میں کچھ بڑی لگتی ہے۔ اسکے پَر بمشکل چار انچ کے برابر ہوتے ہیں اور اس شاہی تتلی کا وزن ایک اونس سے بھی کم ہوتا ہے۔

سائنس دانوں نے جب اس تتلی کی اُڑان پر تحقیق شروع کی تو اُنکی حیرت انتہا کو پہنچی۔ یہ تتلی جنوبی کینیڈا سے اُڑتی ہوئی۔ عظیم جھیلوں سے گذرتی ہوئی۔ امریکہ کے میدانوں کو پار کرتی ہوئی، بالآخر میکسیکو میں پہنچتی ہے۔ یہ سفر تقریباً دو ہزار میل لمبا ہے یہ ننھی مُنّی جان اس دو ہزار میل کے سفر میں نہ صرف سرد اور گرم موسم سے مقابلہ کرتی ہے بلکہ ہر طرح کے پرند اور جانور اسے ہڑپ کرنے کے چکر میں ہوتے ہیں۔ مگر خدا کی قدرت دیکھئے کہ یہ اپنی منزل کی جانب ایک قافلے کی صورت میں اُڑتی رہتی ہے۔ میکسیکو پہنچ کر لاکھوں کی تعداد میں اپنی اگلی نسل کو پیدا کرنے میں لگ جاتی ہے۔ اور نئی نسل کے پیدا ہوتے ہی اپنی موت کے آگے ہار مان لیتی ہے۔ اگلی نسلی جوان ہو کر کینیڈا پہنچ جاتی ہے۔ اور یہی عمل دُہرایا جاتا ہے۔ یہ شاہی تتلی اسی عبادت میں لگی رہتی ہے۔

سائنس دان اس چکر میں تھے کہ ان تتلیوں کو اتنا لمبا راستہ کیسے یاد رہتا ہے زمین کی مقناطیسی قوت، کیمیاوی تخلیق، وغیرہ وغیرہ ان تمام باتوں پر تحقیق کرنے لگے۔ ایک انتہائی چھوٹا (Micro) ٹرانسمیٹر لگانے کے بعد چند تتلیوں کو اُن کے راستہ سے کئی سو میل دور چھوڑ دیا گیا۔ خدا کی قدرت دیکھئے کہ یہ تتلیاں جب اُڑیں تو ایسا راستہ اختیار کیا جو واپس اُنہیں اپنے اُسی راستہ پر لے گیا۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ اپنی منزل پر میکسیکو پہنچنے میں کامیاب ہوگئیں۔ اللہ اکبر۔

مچھلی کی ایک قسم ہے جسے سامن (Salmon) کہتے ہیں۔ یہ مچھلی اپنے انڈے میٹھے صاف پانی یعنی دریاؤں اور اُن میں شامل ہونے والی چھوٹی چھوٹی ندیوں میں دیتی ہیں۔ یہ پانی کی ندیاں ارتفاعی یا پہاڑی علاقوں میں پائی جاتی ہے۔ انڈے دینے کے بعد نر اور مادہ اپنا کام اور کارِ قدرت کے بعد مرجاتے ہیں۔ انڈے مختلف بائیولوجیکل (Biological) منازل طے کرتے ہوئے تقریباً تین سال اِنہیں ندیوں اور دریاؤں میں بسر کرتے ہیں۔ پھر ایک ایسا وقت آتا ہے کہ سمندر کی جانب روانہ ہوتے ہیں۔ اس دوران صرف (ایک اندازے کے مطابق) دس فی صد کے قریب انڈے مچھلی بن پاتے ہیں۔ سمندر کے اُترنے سے پہلے اُس پانی میں کچھ عرصہ گزارتے ہیں جہاں کا پانی آدھا نمکین اور آدھا صاف میٹھا ہوتا ہے۔ آخر کار یہ مچھلیاں سمندر میں اُتر جاتی ہیں۔ پھر سمندر میں یہ تقریباً چار سال گذارتی ہیں۔

سمندر میں جوان ہوتی ہیں۔ سمندری بڑی مچھلیوں اور دوسری آفات کا مقابلہ کرتی ہیں۔ پھر ایک ایسا موقع آتا ہے کہ انڈے دینے کی قدرتی تمنا پائی جانے لگتی ہے اور ان میں سے بعض تو ہزار میل کا سفر سمندر میں کرتے ہوئے۔ اُنہیں دریاؤں اور ندیوں کی جانب بڑھنے لگتی ہیں جہاں اُنکی اپنی پیدائش واقع ہوئی تھی۔ ہر قسم کی تکلیف اور آفات کا مقابلہ کرتے ہوئے وہیں پہنچ جاتی ہیں۔ انڈے دیتی ہیں اور وہی عمل دوبارہ شروع ہوجاتا ہے۔ یاد رہے کہ سمندر کے نیچے ایک ہزار میل کا سفر۔ ہوائی سفر ایک لاکھ میل کے۔ یوں یہ سامن مچھلی اپنی عبادت میں سال سال تک لگی رہتی ہے۔ اللہ اکبر اللہ اکبر۔

پیشتر کہ ہم فکر فردا کا تذکرہ کریں۔ پیشتر کہ ہم اپنی عبادت اور منزل کی بات کریں آپ کے سامنے ایک دو مثالیں اور بھی دینا چاہوں گا۔

(باقی اگلے شمارے میں ملاحظہ کیجیے)

..... بل گیٹس کا شمار دنیا کے دوسرے امیر ترین شخص کے طور پر کیا جاتا ہے۔ ان کے اثاثوں کی مالیت کا اندازہ پچھتّر ارب ڈالر سے زیادہ لگایا گیا ہے۔ کچھ عرصہ قبل تک بل گیٹس کی شہرت اور شناخت کا راز ان کا صاحب زر ہونا تھا۔ آج کی دنیا بل گیٹس کو دولت مند شخص کے ساتھ ایک رحم دل اور فیاض انسان کے طور پر جانتی ہے۔ بل گیٹس نے اب تک انسانی فلاح کے لیے اُنتیس ارب ڈالر کے بھاری عطیات دیئے ہیں۔ قابلِ ذکر امر یہ ہے کہ بل گیٹس نے وصیت میں اپنی اولاد کے لیے صرف اتنی دولت چھوڑنے کا حکم دیا ہے جس سے وہ جدوجہد کر کے اپنے باپ کی طرح کامیاب انسان بن سکے .....

''شام تجھے سلام''

ناصر ملک

(لیہ)

سفر کی روایات کا آغاز تخلیقِ انساں کے واقعے سے تعلق رکھتا ہے اور بلاشبہ یہ روایت انسان کے برابر قدامت کی حامل ہے۔ کائنات کے پہلے انسان کو ہی اس روایت کا بانی قرار دیا جاسکتا ہے اور پہلے سفر کی رُوداد کو جو سینہ بہ سینہ اور مابعد ورق بہ ورق چلتی ہوئی عہدِ موجود کی ذہنی تابندگیوں کا حصہ بنی، کو پہلے سفر نامے کا عنوان دیا جاسکتا ہے۔ اسے آدم کا دنیا پر وُرود کہا جائے یا حضرت انسان کو جنت سے نکالے جانے کا واقعہ لکھا جائے، یہ بہر طور ایک سفر نامے کا مقام رکھتا ہے۔ اس خوب صورت اور علم کش روایت کی پاسداری کرتے ہوئے قمر علی عباسی اس جہانِ نیرنگیِ فسوں کے قریہ قریہ مشاہدے میں سرگرداں ہے۔ حرکت زندگی کی علامت ہے اور حرکت سفر کے تحیرات پر استوار ہوتی ہے۔ یہ سفر دو قرنوں کے بیچ، دو تہذیبوں کے مابین یا دو خطوں کو ملانے والا بھی ہوسکتا ہے اور یہ ایک ہی عہد میں بستے ہوئے مختلف سرحدی پنجروں کے اسیروں میں تبادلۂ احوال کا موزوں ترین ذریعہ بھی ہوسکتا ہے۔ اپنی ہر نوع میں نقلِ ماحول کا عمل علم کا زینہ بنتا ہے اور علم کائنات کے سربستہ رازوں کی کلید ہے۔

الیگزینڈر مقدونیہ سے نکل کر جہاں گردی کرتا ہوا تقریباً آدھی دنیا کو دیکھنے کے بعد جب وطن لوٹا تو اس کے مالِ غنیمت میں دنیا جہان کا مال و متاع اور ہیرے اور زیورات موجود تھے مگر لفظوں کی سوغات عدم تھی۔ اس نے اپنی یادوں کو قرنی استحکام دینے کی جہت نہیں کی تھی۔ اس نے کیا دیکھا..... یہ عمل محو ہو گیا۔ اس نے کیا اجاڑا..... یہ سوال تاریخ کا حصہ بن گیا۔ اگر وہ لفظ شناس ہوتا، لفظ کی اہمیت سے واقف ہوتا تو آج فاتح اور حملہ آور کے تشخص سے کہیں بہتر اعتبار اسے مؤرخ اور سفر نگار کے طور پر ملتا۔

عظمتِ جود و جبروت کے مالکِ لازوال نے قمر علی عباسی کے زادِ سفر میں جہاں شوقِ آوارگی جہاں رکھ دیا تھا، وہیں اسے ودیعتوں، محسوسات اور مشاہدات کو خالصتاً ادبی رنگوں میں آراستہ کر کے صفحۂ قرطاس پر ثبت کرنے کا ہنر بھی سونپ دیا۔ اس کی تحریر میں تغزل کا شائبہ، نظم پارے کی سلاست اور بات سے بات نکالنے کا جداگانہ وصف چراغِ شب سے ضمانتیں طلب کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اسے یہ قرینہ ہے کہ سانس لیتی ہوئی صبح کی روشنی کو کیسے کرن کرن کھول کر شب گزیدہ آنکھ کیلئے پردۂ سیمیں کرنا ہے۔ اپنی نگاہوں دیکھے ہوئے زندہ و جاوید روپ کو حیطۂ تحریر میں لانا سفر نامہ لکھنے کا حقیقی اعجاز ہے اور قمر علی عباسی کا اندازِ بیاں اس مسیحائی سے منور دکھائی دیتا ہے۔ وہ کسی بھی خطۂ ارضی کی تہذیب کے بدن سے گندے پانی کے کیڑوں کو، تمدنی مقدر کی رسوائیوں کو اور انسانی جبلتوں کے خمیر سے اُٹھنے والے دھویں میں سے حقیقی نتائج اخذ کرتا ہے تو اس گھڑی بہت پختہ تجزیہ کار، کہنہ مشق ادیب اور وعدہ گاہِ حقیقت کو سمجھنے والا مؤرخ معلوم ہوتا ہے۔ وہ لفظوں کی الوہی بنت کاری سے وہ آتش کدہ تعمیر کرتا ہے جس کی سپیدی کے آگے سحر کا روایتی سورج گویا سیاہ بختی کی چادر اوڑھ لیتا ہے۔ کمالِ ہنر یہ نہیں کہ جو دیکھا جائے، اسے مصور کر دیا جائے بلکہ حقیقی معانوں میں معراجِ فن یہ عمل قرار پائے گا کہ پسِ منظر میں مخفی جولانیوں، انسانی عروج و زوال کی داستانوں، فکری تابناکیوں اور خیرہ کن حقائق کو اپنے مافی الضمیر اور قاری کے دلچسپی کے اسباب کے ساتھ ایسی چابک دستی سے پیش کیا جائے کہ طبیعت پر ناآسودگی نہ اُترے۔ قمر علی عباسی کے سفر نامے ''شام تجھے سلام'' میں یہ وطیرۂ تحریر جا بہ جا ملتا ہے اور قاری کو اپنے سحر میں لے لیتا ہے۔ اسی سفر نامے کا ایک پیراگراف ملاحظہ ہو:

''ہم دیر تک آنکھیں بند کیے ان کے حضور کھڑے رہے۔ اپنے اپ کو خوش نصیب سمجھتے رہے جو یہاں آئے ہیں۔ اپنے خاندان، احباب کیلئے اللہ سے سب کچھ مانگ لیا۔ وہ سنتا ہے۔ ہمارے گمان سے زیادہ عطا کرتا ہے۔'' (ص:۴۴)

دیکھا جائے تو قمر علی عباسی اپنی ہیئت کے بنیادی افکار سے جڑے ہوئے دکھائی دیتا ہے۔ وہ اپنے سفر نامے کو لطیف تبلیغ کا ذریعہ بھی بناتا ہے اور اپنے ایمان و ایقان کا پرچار اس طریقے سے کر جاتا ہے کہ سفر نامے کی حیثیت متاثر نہیں ہوتی۔

عمومی طور پر سفر ناموں کا قاری ناشناسا تہذیب و تمدن کے تخیلاتی سفر پر نکلتے ہی بساطِ فہم کو کشادہ، طبیعت کو اجنبی ماحول پر مائل اور خود کو تماشائے آشوبِ زر و جاہ کیلئے ناموزوں تصور کر لیتا ہے اور چند صفحات کے بعد کتاب بند کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ سفر نگار کی برقِ فراست ایسے میں میدانِ عمل میں اُترتی ہے اور اسے اپنی تحریر کی غلام گردشوں میں الجھانے کیلئے پینترے پر پینترا بدلتی ہے اور کامیابی سے ہمکنار ہونے کیلئے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لا دیتی ہے۔ یہ کام اس قلم کار کے حصے آتا ہے جو قاری کی نفسیات اور ضروریات کو بخوبی سمجھتا اور کچھ لکھتے ہوئے از بر رکھتا ہو۔ قمر علی عباسی اسی قبیل کا حساس فرد ہے۔ وہ ایک جال بنتا ہے جس میں اپنے قاری کو دم بہ دم غیر محسوس انداز میں جکڑتا جاتا ہے۔ اس کی تحریر کو پڑھنے والا شخص سطر سطر پھسلتا جاتا ہے اور آخری حرف پر رک کر بے اختیار گنگنانے لگتا ہے کہ اک میں کہ ہوں ناواقفِ اسرارِ رگِ جاں..... اک وہ کہ خدا بھی جسے پتھر میں نظر آئے..... پھر اسی اشک اشک تارِ نظر سے اس کے ناآسودہ خوابوں کی جڑیں آن ملتی ہیں۔

سفرنامہ شگفتہ بیانی سے معمور، معلومات سے بھرپور اور قاری کی دلچسپی کے لوازمات کا مرقع ہوتا ہے۔ قمر علی عباسی عام نوع کے واقعات کو اپنے مخصوص طرزِ نگارش سے یوں پیش کرتا ہے کہ اسے پڑھنے والا شخص آخری سطر پر جا کر آنکھیں موند لینے اور گہری سانسیں لینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ جس طرح کسی بھی واقعے کو ان گنت دیکھنے والے ان گنت تأثرات سمیٹتے ہیں، اسی طرح ان میں سے ہر ایک تأثر کو رقم کرنے والوں کے زاویۂ بیاں بھی مختلف ہوتے ہیں۔ قمر علی عباسی واقعات میں ڈکشن، ڈرامائی تأثر اور معلومات شامل کر کے اپنی تحریر کو بلاشبہ منفرد کر دیتا ہے۔ وہ تاریخ کی اہمیت سے روشناس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بیان کیے جانے والے مقام کا مختصر تاریخی سفر بیان کر کے اپنے سفرنامے کو حوالہ جاتی دستاویز بنانے کی سعی کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

''زینو بیا ہال، ملکہ کے نام پر قائم کیا گیا ہے۔ اس میں اٹھارہ سو مہمانوں کی گنجائش ہے۔ ایک ہزار اسکوائر میٹر پر تعمیر ہے۔ پانچ فوارے، پانچ بڑے پردے مہمانوں کو ناچ گانے دکھاتے ہیں۔ یہ ہال تقریبات، سیمینار، کانفرنس اور سمپوزیم کیلئے مناسب ہے۔ ہال میں قدیم دمشق کی مصوری دیکھی جا سکتی ہے۔'' (ص:۵۵).....''۱۹۶۷ء میں اسرائیل اور مشرق وسطیٰ کے ملکوں میں چھ دن جنگ ہوئی۔ شام آگے آگے تھا۔ اس لیے اسرائیل نے گولان ۱۸۰۰ پر قبضہ کر لیا۔ آبادی کو بے دخل کر دیا۔ شام آج بھی اس سے محروم ہے۔'' (ص:۱۱۱)

مختلف کردار سفر کی روئیداد کو آگے بڑھاتے ہیں۔ قمر علی عباسی ایسے کرداروں کا انتخاب بڑی فراست سے کرتے ہیں اور ان کے مکالموں میں برجستگی اور شگفتگی کا عنصر شامل کرتے ہوئے داستان کو آگے بڑھاتے ہیں۔ ان کے مکالموں میں ثقیل الفاظ، غیر ضروری تراکیب، معمے اور عقدے شامل نہیں ہوتے۔ وہ عام انسانوں کی عام بول چال پر اپنی عمارت استوار کرتے ہیں جس سے قاری لطف اندوز ہوتا ہے۔ ان کے ہاں الفاظ برتنے کا سلیقہ قابلِ ستائش ہے۔ ان کی تحریر میں افسانوی فضا کا رچاؤ دل کش ہے اور شگفتہ بیانی کا وصف انہیں دوسرے بہت سے سفرنگاروں سے الگ رکھتا ہے۔ سفرنامے کے کیسۂ خستہ جاں میں سمٹے ہوئے رختِ سفر کی اکائی بجا طور پر حسنِ بیاں ہے اور قمر علی عباسی اس رعنائی سے بخوبی آشنا نظر آیا۔ اس کے ہاں ترتیب میں تنوع، بیان میں غیر معمولی روانی اور بے ساختگی اور گفتگو کی شیرینی میسر آتی ہے جو کمالِ فن ہے۔

''شام تجھے سلام'' کا مطالعہ بہت جاں افروز، دل کشا اور بھرپور ثابت ہوا۔ اپنے مشاہدات کا نتیجہ اخذ کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے، ''ہم کچھ نہیں بولے۔ لمحوں میں جان گئے کہ یہ روشنی، اجالا اور نور بزرگوں کی آرام گاہ سے نکل رہا تھا کہ ہم انہیں سلام کر سکیں۔'' (ص:۱۷۴).....میں اتنی خوبصورت رُودادِ سفر پر قمر علی عباسی کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے اپنی تحریر کو سمیٹتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ اُس کے ہنر کو مہمیز کرے اور مزید حسنِ بیاں عطا کرے (آمین)۔

''غالب اور درگت''

''غالب اور درگت'' خوب اور بہت خوب ہے۔ راز صاحب نے غالب کی غزلوں پر مزاحیہ غزلیں کہی ہیں۔ اس کام سے انہیں غالب کی برابری مقصود نہ تھی۔ انہوں نے صرف غالب کا مشہور نام اور کلام ہی استعمال کیا ہے ورنہ ان کی شاعری میں دورِ حاضر کے مکمل مسائل کا بیان آ گیا ہے۔ ان کے شعروں میں طنز ایسا بھرپور ہے کہ پڑھ کر جی کھِل اٹھتا ہے اور کاٹ دل میں اتر جاتی ہے.....**کالی داس گپتا رضا**

ہائے اور ہُو کی یہ صدا کیا ہے
کرپشن کے سِوا وبا کیا ہے

برسوں دھندا کیا ہے ردّی کا
گھر سے اُن کے ہمیں ملا کیا ہے

مرغ چوری کا روز کھاتا ہوں
میں نہیں جانتا سزا کیا ہے

میں چلا ہوں بدیش دورے پر
یہ نہ پوچھو کہ مدّعا کیا ہے

رہ کے صحبت میں اُن کی چلے گا پتہ
گھوڑا کیا چیز ہے گدھا کیا ہے

نیتا تسکین دینے آئے ہیں
آج بستی میں بم پھٹا کیا ہے؟

بیوی امید سے ہے پچپن[۵۵] میں
''یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے''

۔ ٹی این راز ۔
(ایڈیلیڈ، آسٹریلیا)

''سیلابی پانی''

کپڑے لادو

(سیلاب کی ماری ایک ماں کی فریاد)

نقاش کاظمی

(کراچی)

اِک ماں رو رو کر کہتی ہے
بچہ دُودھ نہیں پیتا ہے
میرا بچہ، شمشما ہا
جو میرے کپڑوں۔ میرے بدن کی بو سے
نفرت کرتا ہے
معصوم سا بچا۔
میں تو کیکر کے پتّوں اور سیلابی پانی سے
اپنی بھوک اور پیاس بجھا لیتی ہوں
میرے دودھ کی خوشبو بھی
اور آنچل و دامن
سب بدبو سے مہک گئے ہیں
تم جو ''ہیلی کاپٹروں'' میں بیٹھ کے
چکّر لگاتے ہو۔ اور روز آتے ہو
اب جب تم اِمداد کو آؤ
کچھ مت لاؤ
بلکہ اپنے گھر کے اُترن
پھٹے پرانے کپڑے لادو
اس بچے کو دودھ پلا کر
میں پالوں گی۔
کپڑے لادو۔

○

''نغمۂ جاں سوز''

پروفیسر خیال آفاقی

(کراچی)

وہ دل سے جاں سے گذر گئے، تری آرزو، تری چاہ میں
وہ آج بھی ہیں بسے ہوئے، غمِ زندگی کی نگاہ میں

کبھی درد بن کے تڑپ اُٹھے، کبھی ٹیس بن کے بلک پڑے
کبھی نور بن کے سُلگ اُٹھے، کبھی اشک بن کے چھلک پڑے
کبھی کھو گئے کسی ساز میں، کبھی ڈھل گئے کسی آہ میں

کبھی اپنے آپ میں کھو گئے، کبھی بے قرار سے ہو گئے
کوئی صبح آ کے جگائے گی، اسی انتظار میں سو گئے
یہی سوچتے، یہی سوچتے، اسی آرزو، اسی چاہ میں

وہی رازدار جنوں ہوئے، جو تری نظر کو سمجھ گئے
جنہیں تیرے غم سے گریز تھا، غمِ دو جہاں میں الجھ گئے
وہی بچ گئے کہ جو آ گئے، ترے ایک غم کی پناہ میں

وہ جو ہم رکابِ نجوم تھے، مجھے راستہ نہ دکھا سکے
وہ جو تیز گامِ خرام تھے، مجھے دو قدم نہ چلا سکے
میں پہنچ گیا ترے روبرو، وہ کھڑے ہیں آج بھی راہ میں

ترے اک خیال کے ماسوا، نہ رکھا کسی سے بھی واسطہ
تری یاد سے ہے بندھا ہوا، مرے روز و شب کا یہ سلسلہ
کوئی ایک لمحہ ترے سوا جو کٹا تو جیسے گناہ میں

○

تیسری آنکھ کھلنے والی ہے

پرتپال سنگھ بیتابؔ
(جموں کشمیر)

پہلے پہل گیرائی و گہرائی کم تھی
بُہت کم
مگر میں اپنی نظموں کو
سلیقے سے بیاض میں سیج کر رکھتا تھا
ایک ایک نظم کا اِندراج اور حساب
باقاعدہ رہتا تھا
آج گیرائی و گہرائی زیادہ ہے
مگر نظم اکثر کہیں بھی
کاغذ کے کسی بھی پُرزے پر
تحریر ہو جاتی ہے
کبھی کِسی اخبار کے ٹکڑے پر
کبھی کِسی ڈِبّے یا ڈِبیہ پر
کبھی کبھار تو در و دیوار پر بھی۔
وقت قریب ہے جب
جِس راہ سے گزروں گا
اُس راہ پر نظم تحریر کرتا ہُوا
آگے بڑھا چلا جاؤں گا
کوئی کیا کہے گا؟
اس بات کا تو ہوش بھی نہ ہوگا

○

بے نام خلش

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی
(بھاگل پور، بہار)

سارا کچھ اپنا ہو کر بھی
اپنا کیا ہے
کچھ اپنا ہونے کا احساس
کہاں ڈھونڈوں
ہاں اور نہیں کا زہر
ہر وقت۔ ہر کسی پر
اپنا اثر دکھاتا رہتا ہے
یہ کیسی ساعت ہے جب میں
اپنی شناخت میں
خود نکل پڑا ہوں
لایعنی معنوی جہت کا
بیکراں سمندر سامنے ہے
اور ساحل ساحل میری آوازیں ہیں
آؤ۔ میری آواز کی پہنچ میں
آ جاؤ.....
ہم مل کر کانٹوں کے تن من میں
غوطہ زن ہو سکیں
اور اک دوجے کو چاند ستارہ
کہہ سکیں.....
اپنے قتل کا اک سانحہ بن سکیں
اپنے سایے سے ڈر کر
اپنے آنگن میں بگولے بھر سکیں
اور حدود ذات کے پھیلاؤ میں
اپنی پیمائش کر سکیں
عقوبت۔ بھلائی۔ جزا
اور اپنا آستانہ!

○

محسن تیرے بغیر پشاور اُداس ہے

یُونس صابؔر
(پشاور)

روزنامہ مشرق میں طٰہٰ خاں جی نے
لکھا تھا ''وُہ مُحسن ہے احسان بھی وُہ''
بڑا سُخور اور نفیس انسان بھی وُہ
باہر جا کر پاک وطن آتا جاتا
بائی پاس سے بچ نکلا لیکن پھر بھی
غزل بہانہ کر کے یادوں کی خاطر
شعر وسخن کی ہر محفل کو گرماتا

شوکتؔ، اشرفؔ، قاصرؔ اور ارباب رجاؔ
خٹک پریشاںؔ، نیّرؔ، فارغؔ اور رضا
خاطرؔ اور فرازؔ تو جانِ جاناں تھے
ان سجنوں کی جدائی وہ سہتا کب تک
آخر سوہنڑا محسنؔ بھی دم توڑ گیا
اپنے پیچھے اک سُونا گھر چھوڑ گیا

صابؔر ! دیکھ لیا کرتا ہُوں البم میں
دل کی دھڑکن بنی ہوئی کچھ تصویریں
تڑپا جاتی ہیں ہمعصروں کی یادیں

○

ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ
(دہلی، بھارت)

''جگنوؤں کے شہر میں''

جگنوؤں کے شہر کا باسی ہوں
میں نے دیپک کی لو نہیں دیکھی

آج سورج سے میں مخاطب ہوں
اتنی ہمت کہاں کہ بات کروں
کچھ اندھیرے میں ساتھ لایا ہوں
کیا عجب وہ کرن عطا کردے
میرے ہونٹوں کو اِک خدا دے کر
مجھکو اپنے سے آشنا کر دے

ایک قطعہ

زندگی کا اٹوٹ حصّہ ہو
کس تعلق سے تم یہ کہتے ہو
جب وہ شہر میں نہیں ہوتے
حواس باختہ سے رہتے ہو

○

''سراپا تخلیقیت''

پروین کمار اشک
(پٹھان کوٹ، بھارت)

تیری تقریر!
آکاش وانی!!
تیری تحریر!
ادب صحیفہ!!
تیرا خطاب!
شہہ سمندر!!
تیری قوم!
صرف تخلیقیت!!
تیرا عشق!
صرف تخلیقیت!!
تیرا وطن!
صرف تخلیقیت!!
تیرا مذہب!
صرف تخلیقیت!!
تیرا کردار!
صرف تخلیقیت!!
اے سراپا تخلیقیت گوپی چند نارنگ!
خدا کرے کہ تم اسی طرح!
برسہا برس تک!
اپنے لمسِ تخلیقیت سے!
بنجر زمینوں کو!
سرسبز کرتا رہے!
آمین!!

''یوسفِ ثانی''

غالب عرفان
(کراچی)

زندگی جس نے بخش دی فن کو
ناز جس پر کرے ہر اک فن کار

فلمی دنیا کی رونقوں کے بیچ
روشنی جس سے پھوٹے وہ مینار

ختم جس پر فنِ اداکاری!
آگہی جس پر خود ہوئی ہو نثار

زندہ تہذیب کا نمائندہ
جس کا تاریخ ساز ہو کردار

ایک انسان جس کی سانسوں میں
سانس لیتا ہو زندگی کا وقار!

بزمِ عرفاںؔ میں یوسفِ ثانی
جنہیں کہتے ہیں سب دلیپ کمار

○

شجر

آصف رضا
(یو۔ایس۔اے)

میں نے جڑ سے اکھاڑنا چاہا
اُس شجر کو جسے محبت سے
میں نے خوں دے کے اپنا پالا تھا۔
میری آنکھوں کا جو اجالا تھا
جب نہ اکھڑا تو میں نے اُس کا تنا
تیز آرے سے کاٹنا چاہا
آہ لیکن!
بلند چیخ اُس کی
میرے کانوں نے دلخراش سُنی!
اُس سے پھوٹا لہو کا فوارہ!

میرے آنگن میں آج بھی ہے کھڑا
وہ شجر
اب زمین میں اُس کی جڑیں
اور گہری ہیں

اُس کو نہ منہ پھیر کر کراہت سے
روز میں اپنا خون دیتا ہوں
شاخ کے ہاتھ سے ثمر اُس کا، تلخ
نفرت کے ساتھ لیتا ہوں

○

ماہیے

کرشن گوتم
(چندی گڑھ، بھارت)

(۱)
پھر یاد تمہاری ہے
پیار اک لفظ نہیں
سانپوں کی پٹاری ہے

(۲)
کیا رکھا اشاروں میں
یار تو ملتے ہیں
چلتی تلواروں میں!

(۳)
سُکھ سارے نہیں ملتے
کل کا بھروسہ کیا
مِت پیارے نہیں ملتے

(۴)
ساتھی تنہائی کا
دل میں رہے میرے
تیرا تیر جدائی کا

(۵)
کیسا دِل جانی ہے؟
بھیجا نہ خط جا کر
پردیس کا پانی ہے

(۶)
جیسے ہیں ہمارے ہیں
پیار میں روتے ہوئے
راوی کے کنارے ہیں

آئینوں کا سوداگر

جہانگیر اشرف
(برمنگھم، برطانیہ)

آئینوں کا سوداگر
آئینے بیچتا ہے
آئینہ وہی کہتا ہے
جو وہ دیکھتا ہے

آئینہ ہر صورت کی حقیقت کو عیاں کرتا ہے
مکر و فریب کا چاک گریباں کرتا ہے
کسی کو پریشاں اور کسی کو حیران کرتا ہے۔

آئینہ وہی کہتا ہے
جو وہ دیکھتا ہے

آئینہ جھوٹ و منافقت کی تہیں کھولتا ہے
پھُولوں کو ہی نہیں
کانٹوں کو بھی جھیلتا ہے

آئینہ وہی کہتا ہے
جو وہ دیکھتا ہے
آئینوں کا سوداگر
آئینے بیچتا ہے۔

○

بھری دوپہر

فیصل عظیم
(کینیڈا)

آئینے میں دیکھ رہا تھا
اس کے بالوں میں کچھ بوڑھے لٹکے ہوئے تھے
اور کچھ بچے جھول رہے تھے
ایک سفید سا دھبہ تھا جو گھر تھا اس کا
خشکی جھاڑی تب یہ جانا
قبر کی مٹی چپکی ہوئی تھی
اور بالوں میں گرد مسافت کی تھی شاید
جو بوڑھوں، بچوں اور گھر کے بیچ جمی تھی
اور چاندی کے تار
کسی موسیقی کے آلے سے ٹوٹ کے بکھرے ہوئے تھے
ہر منظر کے پہلو میں لیکن وہ خود بھی اٹکا ہوا تھا
سوچ رہا تھا۔۔۔۔
کالے بالوں میں چاندی کے تار ابھی تو نو وارد ہیں
آئینے سے نظر چرا کر
اپنے سر کو جھاڑ کے، اپنے بال بنا کر باہر لپکا
اور باہر کی گرد میں اٹ کر پھر مٹی کے سنگ ہوا ہے
سر میں چاندی پھیل رہی ہے
مٹی اوڑھ کے لیکن وہ بے رنگ ہوا ہے

○

کون چھپا ہے

مسکین احمد منصور

(حیدرآباد، سندھ)

سارے رنگ دھنک کے لے کر
میں نے اِک تصویر بنائی
نیچے لکھا نام کسی کا

نام میں لیکن حروف نہ نکتے
چاند، ستارے، پھول بنا کر
اسے چھپایا۔

پڑھے وہی جو دل سے چاہے
پھولوں، تاروں اور چندا کو
روشنیوں کو اور خوشبو کو،
میں نے سوچا!

بند کرو یہ آنکھیں اپنی
دل کی آنکھیں کھول کے دیکھو
تارے، چاند اور پھول کے پیچھے
کون چھپا ہے؟

○

''ابھی اِک کام باقی ہے''

(منیر نیازی صاحب کی نظم سے متاثر ہو کے)

شگفتہ نازلی

(لاہور)

کِسی اَنجان رستے پہ.....
کِسی اَن دیکھے معبد میں.....
دُعا کو ہاتھ اُٹھانا ہے.....
دُعا کے حرفوں کو.....
تقدیس سے ترتیب دینی ہے.....
یقیں خود کو دلانا ہے.....
ابھی اِک کام باقی ہے.....!

کِسی دارالمطالعے میں.....
مجھے کچھ دیر رُکنا ہے.....
کِسی نایاب سی تحریر کا.....
کوئی ورق مجھ کو پلٹنا ہے.....
پلٹ کر سوچنا ہے.....
سوچ کر پھر سے پلٹنا ہے.....
اَبھی اِک کام باقی ہے.....

○

گیت

شائستہ سحر
(میرپورخاص)

پریتم من کی آنکھیں کھول
مور پپیہے تو بھی بول

زہر بھری رُت بیت گئی
اب تو کان میں امرت گھول

روح میں بھر دے اجیارا
تیرے میٹھے میٹھے بول

پی لے جام محبت کا
آ میری بانہوں میں ڈول

آخر کو ہم آن ملے
یہ دنیا، یہ دھرتی گول

کب تلک من میں ٹھہرے گا
اے میرے پردیسی بول

تیرے دوارے کھڑی ہے جوگن
لے کر اپنا دل کشکول

○

میں کہاں ہوں

(معمارانِ قوم کے نام)

تصور اقبال (اٹک)

زمیں پہ رہ کر میں آسماں ہوں۔
مگر کہاں ہوں؟
ہر اک کی نظروں سے میں پنہاں ہوں۔
زمانے بھر کی یہ کم نگاہی نہ کوئی دیکھے نہ کوئی سمجھے۔
نہ میری توقیر کوئی جانے۔ نہ میرے رتبے کو کوئی مانے۔
محفل کا کوئی مجھ کو چراغ سمجھے۔
اندھیروں کو دُور کرنے کا کوئی مجھ کو سُراغ سمجھے
نہ اپنی پلکوں پہ کوئی مجھ کو بٹھانا چاہے۔
نہ میرے سر پر پیغمبرانہ عقیدتوں کا سنہری تمغہ سجانا چاہے۔
زمانہ لیکن ہر اک قدم پر مجھے ہی کیوں آزمانا چاہے۔
میں آسماں ہوں۔ مگر کہاں ہوں؟
کہ میرے کندھوں پہ اک اپاہج معاشرے کا
اور اس جہالت کی گہری کھائی میں گرنے والی معاشرت کا
نہ جانے کتنا ہی بوجھ رکھ کر یہ حکم صادر کیا گیا ہے۔
کہ تُو نے ہی اِن اندھیری راتوں کو روشنی میں بدل کر صبح کا پیام دینا ہے۔
حیات پُر خار کو ترقی کی راہ پر گامزن بھی کرنا ہے۔
اور اس جہالت میں خوابِ غفلت میں
سوئی دنیا کو درس دے کر جگانا ہوگا
محبتوں کا عقیدتوں کا شجر بھی کوئی لگانا ہوگا۔
زمانے بھر کو دکھانا ہوگا۔
کہ تجھ میں اقوام کے مقدّر بدل کے رکھ دینے کی خدا نے بڑی
صلاحیتیں رکھی ہیں
انہیں اُبھارو۔ انہیں نکھارو۔
اور اپنا آج اور کل سنوارو

وی شانتارام

دیپک کنول
(ممبئی، بھارت)

وی۔شانتارام اُن برگزیدہ فلمی ہستیوں سے ایک ہیں جن کا نام آج بھی بالی وڈ میں نہایت عزت واحترام سے لیا جاتا ہے۔

وی۔ شانتا رام 18 نومبر 1901 کو کولہا پور کے ایک جین گھرانے میں پیدا ہوئے۔اُن دنوں کولہا پور ایک آزاد ریاست تھی جو بعد میں ہندوستان میں مدغم ہوگئی اور اسکا نام مہاراشٹر پڑا۔ماں باپ نے اپنے بچے کا نام راجہ رام وانکوندرے رکھا۔شانتارام کی پڑھائی لکھائی کی طرف کوئی رغبت نہ رہی۔بچپن میں ہی اُنھوں نے ریلوے میں چھوٹے موٹے کام کرنے شروع کردئے۔بعد میں اُنھوں نے گندھروانا ٹک منڈلی میں پردہ کھینچنے کے کام سے اپنے سفر کا آغاز کیا۔شانتارام کافی وجیہہ اور دراز قد تھے۔تھیٹر کے ایام میں وہ مشہور فلم ساز بابو راؤ پینٹر کے رابطے میں آگئے۔اُنھوں نے بابو راؤ پینٹر کی ''مہاراشٹر فلم کمپنی'' میں شامل ہوکر فلم بنی کے بارے میں جانکاری حاصل کی۔اس بات سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ شانتارام نابغہ روزگار تھے۔پڑھا لکھا نہ ہونے کے باوجود وہ کافی ذہین اور تیز تھے۔وہ بہت جلد فلم کی باریکیوں سے واقف ہوگئے۔اسی بیچ بابو راؤ پینٹر نے اُنہیں 1925 میں اپنی فلم ''ساوکاری پاش'' میں اداکاری کرنے کا موقع فراہم کیا۔اُنہوں نے اس فلم میں ایک باغی کسان کا رول بخوبی نبھایا۔

اس طرح ہندوستان کے فلمی اُفق پر ایک درخشندہ ستارے کا جنم ہوا تھا۔وی۔شانتارام نے 1927 میں پہلی بار ''نیتا جی پالکر'' نام کی فلم کی ہدایت دی۔اس فلم نے اُن کے ارادوں کو ایک نئی سمت دی۔شانتارام نے چار تکنیشنز کو اپنے ساتھ شامل کرکے ''پربھات فلم کمپنی'' کی داغ بیل ڈال دی۔کمپنی کے یہ چار حصہ دار تھے،وی۔جی۔ ڈاملے،کے۔آر۔دھیبر،ایس۔فتح لال اورایس۔بی۔کلکرنی۔ یہ چاروں فلم کے مختلف شعبوں سے وابستہ تھے اور اپنے اپنے کام میں ماہر تھے۔ان لوگوں کے پاس تجربہ تو بے پناہ تھا،بس کمی تھی تو روپے پیسے کی۔

فلمیں بنانے کے لئے تجربے سے کہیں زیادہ سرمایے کی ضرورت پڑتی ہے جس کا فقدان تھا۔ان پانچوں نے اپنی بے پناہ لگن اور جنون سے ناممکن کو ممکن کرکے دکھایا۔1932 میں شانتارام کی ہدایت کاری میں پہلی بار ''ایودھیا چہ راجہ'' نامی مراٹھی فلم بنی۔یہ فلم دادا صاحب پھالکے کی فلم ''راجہ ہریش چندر'' کی کہانی پر مبنی تھی۔اس فلم کو بنانے کا مقصد دادا صاحب کو خراجِ عقیدت پیش کرنا تھا۔یہ فلم تیکنکی اعتبار سے کافی کمزور تھی البتہ اس فلم نے فلم انڈسٹری کو درگا کھوٹے جیسی خوبصورت اور لاجواب اداکارہ دی۔

1933 میں اُنہوں نے ''سائرندھری'' نام کی ایک مراٹھی فلم بنائی جسے لے کر وہ جرمنی چلے گئے۔یورپ میں رنگین فلموں کا دور شروع ہوا تھا۔شانتا رام بھی اپنی یہ فلم اسی ارادے سے جرمنی کی ''Agfa labotries'' میں لے کر چلے گئے تھے تاکہ وہ اسے رنگوں میں ڈھال سکیں پر اُنہیں بڑی مایوسی ہوئی جب اُنہیں یہ کہہ کر فلم واپس کی گئی کہ فلم اسقدر پیلی تھی کہ اُس پر کوئی اور رنگ چڑھ ہی نہیں سکتا تھا۔اگر اُن کا یہ تجربہ کامیاب رہتا تو ہندوستان کی پہلی رنگین فلم کا سہرا وی۔شانتارام کے سر بندھتا نہ کہ آدیشیر ایرانی کے سر جنھوں نے ''کرشن کنہیا'' جیسی پہلی رنگین فلم بنا کر فلمی تاریخ مَیں اپنا نام درج کرا لیا تھا۔شانتا رام اس لیبارٹری کے کام سے اتنے متاثر ہوئے کہ وہ کچھ ہفتے جرمنی میں ہی رہے اور اُنہوں نے بڑی گہرائی سے اُن کے کام کا جائزہ لیا۔اُسی سال اُنہوں نے 'پربھات اسٹوڈیو'' کو کولہا پور سے پونا منتقل کردیا۔اُنہوں نے اپنے پارٹنرز کے ساتھ مل کر ایک نہیں چار فلمیں بنائیں۔وہ بھی یکے بعد دیگرے۔ان فلموں کے نام تھے ''گوپال کرشنا''''خونی خنجر''''رانی صاحبہ'' اور ''اودے کال''۔یہ چاروں کی چاروں فلمیں وی۔شانتا رام کی ہدایت میں بنیں۔

1934 میں اُنہوں نے ''امرت منتھن'' نام کی فلم بنائی۔ یہ فلم بودھ ازم اور اس کی مذہبی رسومات پر مبنی فلم تھی۔پہلی بار کلوز اپ اور لانگ شاٹس نے فلمی نقادوں کو متاثر کیا۔1935 میں اُنہوں نے ''مہاتما'' نام کی فلم بنائی۔یہ فلم ذات پات اور چھوا چھوت کی بدعت کے خلاف ایک جرات مندانہ کاوش تھی جسے قارئین نے بیحد سراہا۔اس فلم کو لے کر سنسر بورڈ اور شانتا رام جی میں کچھ دنوں تک تنا تنی چلتی رہی۔سنسر بورڈ کو مہاتما لفظ پر اعتراض تھا۔مہاتما شبد،گاندھی جی کے نام کے ساتھ منسوب تھا اسلئے سنسر بورڈ نے شانتا رام جی سے کہا کہ وہ مہاتما لفظ بدل دیں جسے اُنہوں نے بدلنے سے انکار کردیا۔وہ اپنی ضد کے پکے تھے۔وہ سنسر بورڈ کے آگے جھکنے کے لئے تیار نہ تھے۔بات بہت بڑھ گئی جس کے سبب فلم ریلیز نہ ہوسکی۔ڈسٹری بیوٹر پریشان تھے۔آخر ڈسٹری بیوٹروں نے پربھات ٹاکیز سے فلم خرید کر،شانتارام جی سے پوچھے بنا فلم کا ٹائٹل مہاتما سے دھرماتما کرکے فلم ریلیز کردی۔اس فلم میں تھیٹر کے مہارتھی بال گندھروانے سنت ایکناتھ کا کردار نبھایا تھا۔

شانتا رام جی کی فلمیں موضوعاتی اعتبار سے اُچھوتی ہوا کرتی تھیں۔اُنہوں نے زیادہ تر دھارمک اور سماجی فلمیں بنائیں جن میں ایک پیغام ہوا

کرتا تھا۔1936 میں اُنہوں نے فلم ''سنت تکارام'' بنائی۔سنت تکارام مہاراشٹر کا ایک جانا مانا صوفی کوی تھا جس کے کلام کو مہاراشٹر بھر میں بڑی قدر و منزلت سے سنا اور پڑھا جاتا تھا۔اس کردار کو وشنو پنت پیگنس نے بڑی خوبی سے نبھایا تھا۔اس فلم میں اسقدر سادگی اور نفاست تھی کہ 1937 کے وینس فلم فیسٹول میں اس فلم کو اعزاز سے نوازا گیا۔ یہ پہلی ہندوستانی فلم تھی جسے بیرون ملک سراہا گیا تھا۔1936 میں ہی اُنہوں نے ایک اور فلم ''امر جیوتی'' ناظرین کے سامنے پیش کی۔یہ پہلی فلم تھی جو ایک عورت کے گرد گھومتی تھی۔یہ فلم بھی موضوع کے اعتبار سے اچھوتی تھی۔اس میں ایک عورت کو سماج کے خلاف بغاوت کرتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔یہ پربھات ٹاکیز کی ایسی پہلی فلم تھی جس میں ایکشن اور مار دھاڑ تھی۔1937 میں اُنہوں نے ایک اور فلم ''دنیا نہ مانے'' پیش کی۔یہ فلم بھی عورت کے گرد ہی گھومتی تھی۔اس فلم کو پبلک نے بیحد سراہا1939 میں اُنہوں نے فلم ''آدمی'' بنائی۔یہ فلم شانتا رام جی کی یادگار فلموں سے ایک ہے۔اس فلم میں اُنہوں نے عورتوں پر ہونے والے ظلم و نا انصافی کو فلم کے پردے پر پیش کیا۔1941 میں اُنہوں نے فلم ''پڑوسی'' بنائی۔ یہ فلم ہندو مسلم فسادات پر بننے والی ایک شاہ کار فلم ہے۔

یہ پربھات ٹاکیز کے ساتھ اُنکی آخری فلم تھی۔1942 میں انہوں نے پربھات ٹاکیز سے علیحدگی اختیار کرلی۔ برسوں کا ساتھ چھوٹ گیا۔وی۔شانتا رام نے پربھات ٹاکیز سے الگ ہوکر ''راج کمل کلامندر'' نام کی اپنی ذاتی فلم کمپنی کی نیو ڈال دی۔اس کمپنی کے بینر تلے اُنہوں نے اپنی پہلی فلم ''شکنتلا'' بنائی۔اس فلم نے کامیابی کے سارے ریکارڈ توڑ دئے۔ یہ فلم 40 ہفتے چلی۔1946 میں اُنہوں نے ''ڈاکٹر کوٹنس کی امر کہانی'' بنائی۔یہ ڈاکٹر کوٹنس کی سچی کہانی تھی جسے خواجہ احمد عباس نے فلمی سانچے میں ڈھالا تھا۔اس فلم کی دیش اور بدیش میں خوب پزیرائی ہوئی۔1946 میں اُنہوں نے ''جیون یاترا'' 1947 میں ''لوک شاعر رام جوشی'' 1955 میں فلم ''جھنک جھنک پائل باجے'' 1959 میں ''نو رنگ'' 1963 میں ''سہرا'' اور 1971 میں ''جل بن مچھلی، نرتیہ بن بجلی'' بنائی۔یہ چاروں فلمیں ڈانس پر آدھارت تھیں۔

وی۔شانتا رام کی سب سے منفرد اور عظیم فلم جس نے وی۔شانتا رام کو شہرت کی معراج تک پہونچا دیا وہ فلم تھی ''دو آنکھیں بارہ ہاتھ''۔اس فلم کی نہ صرف اُنہوں نے ہدایت دی بلکہ ہیرو کا کردار بھی بہ نفس نفیس ادا کیا۔یہ ایک لا جواب فلم تھی جسے پوری دنیا میں سراہا گیا۔اس فلم میں جو رول اُنہوں نے خود ادا کیا تھا یہ رول اُنہوں نے پہلے دلیپ کمار صاحب کو پیش کیا تھا مگر کسی کارن اُنہوں نے یہ رول کرنے سے معذوری ظاہر کی۔ مجبوراً شانتا رام جی کو یہ رول خود ہی ادا کرانا پڑا۔

''دو آنکھیں بارہ ہاتھ'' ہر لحاظ سے ایک شہکار فلم تھی۔وہ چاہے کہانی ہو، مکالمے ہوں، فوٹو گرافی ہو، ڈائرکشن ہو یا اداکاری ہو۔شانتا رام جی نے ہر شعبے میں اپنے جوہر دکھائے تھے۔یہ کہانی چھ مجرموں اور ایک پولیس افسر کے بیچ نفرت اور محبت کی ایک ایسی کہانی ہے جو شروع سے آخر تک فلم بین کو باندھ کے رکھتی ہے۔اس فلم کو پہلی بار سان فرانسسکو کے فلمی فیسٹیول میں دکھایا گیا۔یورپ کے فلم سازوں نے اس فلم کو خوب سراہا۔

شانتا رام جی بڑے رومان پسند آدمی تھے۔اُنہوں نے ایک نہیں تین تین شادیاں کیں۔اُنکی پہلی بیوی کا نام ولما تھا جن سے کئی بچے ہوئے۔اُن کے ایک بیٹے کو میں ذاتی طور پر جانتا تھا جس نے ورلی سی فیس میں ایک ریکارڈنگ اسٹوڈیو کھولا تھا۔اُسکے ہاتھوں میں آدھے درجن سے زیادہ اُنگوٹھیاں ہوا کرتی تھیں۔ بڑا ہی منظقی قسم کا آدمی تھا اور ساتھ ہی بلا کا مے نوش۔ چند سال پہلے اُسکا دیہانت ہوگیا۔دوسری بیوی کا نام جے شری تھا جو کہ ایک مشہور فلم اداکارہ تھی۔اس سے اُن کے تین بچے ہوئے۔ دو لڑکیاں اور ایک لڑکا۔ بڑی بیٹی کا نام راج شری ہے جو ایک مشہور فلم ایکٹرس تھی جس نے کئی کامیاب ہندی فلموں میں اداکاری کی۔ایک بار وہ گوا کے آوٹ ڈور پر تھی تبھی اُسنے بیچ پر کھڑے ایک انگریز کو دیکھا جو سیر کی غرض سے انڈیا آیا تھا۔لانبے قد اور چھریرے بدن کے اس بانکے نوجوان کو وہ پہلی نظر میں دل دے بیٹھی۔اُسنے یہ بات اپنی ہیر ڈریسر کو بتادی۔ہیروئنوں کی قابل اعتماد ساتھی اُنکی ہیر ڈریسر ہوا کرتی ہیں۔

اس سے پہلے کہ کسی سے صلح و مشورہ کیا جائے اُسنے ترت پھرت اُس آدمی سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا۔یہ بات جب شانتا رام جی تک پہونچی تو وہ راج شری کے اس فیصلے سے کافی دکھی ہوئے۔ وہ اس شادی کے حق میں نہ تھے پر بیٹی کی ضد کے آگے اُنکی ایک نہ چلی۔اُنہوں نے ہندو ریتی رواج کے مطابق اُن کے لگن کروادئے اور بڑے تام جھام کے ساتھ بیٹی کو وداع کیا۔راج شری کی شادی کا یہ فیصلہ اُس کے لئے سم قاتل ثابت ہوا۔راج شری جو کہ کامیابی کی بلندیوں کو چھو رہی تھی اچانک اپنے کیریر کو ٹھوکر مار کر اپنے شوہر کے ساتھ یورپ چلی گئی۔جن پروڈیوسروں کی فلمیں وہ اُدھوری چھوڑ کر چلی گئی تھی اُنہوں نے اُس کے خلاف عدالت میں ہرجانے کا کیس ٹھونک دیا۔راج شری کے لئے ڈھیر ساری مشکلیں کھڑی ہوگئیں اور وہ برسہا برس تک ہندوستان سے دور رہی۔

جے شری سے اُنکا ایک بیٹا ہے جسکا نام کرن شانتا رام ہے۔ جو مراٹھی فلموں کا مقبول ڈائرکٹر ہے۔وہ ممبئی کا شیرف بھی رہ چکا ہے۔تیسری شادی اُنہوں نے فلمی اداکارہ سندھیا سے کی جو ''دو آنکھیں بارہ ہاتھ'' میں اُنکے مقابل کام کر چکی ہے۔ سندھیا سے اُنکے چار بچے ہیں جن میں سے ایک بیٹی نے ہندوستان کے نامی کلاسیکل گلوکار پنڈت جس راج سے شادی کی ہے۔

وی۔شانتا رام بالی وڈ میں انّا صاحب کے نام سے جانے جاتے

باقی صفحہ ۱۰۱ پر ملاحظہ کیجیے

رباعیات

اکبرالہ آبادی

(●)

کھولی ہے زبان خوش بیانی کے لئے
اٹھّا ہے قلم گہر فشانی کے لیے
آیا ہوں میں کوچۂ سخن میں اکبر
نظّارۂ شاہد ِمعانی کے لئے

کیاتم سے کہیں جہاں کو کیسا پایا
غفلت ہی میں آدمی کو ڈوبا پایا
آنکھیں تو بے شمار دیکھیں لیکن
کم تھیں بخدا کہ جن کو بینا پایا

غفلت کی ہنسی سے آہ بھرنا اچھّا
افعالِ مضر سے کچھ نہ کرنا اچھّا
اکبر نے سنا اہلِ غیرت سے یہی
جینا ذلّت سے ہو تو مرنااچھّا

ہو علم اگر نصیب تعلیم بھی کر
دولت جو ملے تو اس کو تقسیم بھی کر
اللہ عطا کرے جو عظمت تجھ کو
جو اہل ہیں اس کے ان کی تعظیم بھی کر

بے سُود ہے گنج ومال ودولت کی تلاش
ذلّت ہے دراصل جاہ وشوکت کی تلاش
اکبؔر تُوسرورِ طبع کو علم میں ڈھونڈ
محنت میں کر سکون وراحت کی تلاش

گر جیب میں زر نہیں تو راحت بھی نہیں
بازو میں سکت نہیں تو عزّت بھی نہیں
گر علم نہیں تو زور وزر ہے بیکار
مذہب جو نہیں تو آدمیت بھی نہیں

چغلیاں اک دوسرے کی وقت پر جڑتے بھی ہیں
ناگہاں غصّہ جو آجاتا ہے لڑ پڑتے بھی ہیں
ہندو ومسلم ہیں پھر بھی ایک اور کہتے ہیں سچ
ہیں نظر آپس کی ہم ملتے بھی ہیں لڑتے بھی ہیں

کہتاہوں مَیں ہندو ومسلماں سے یہی
اپنی اپنی روش پہ تم نیک رہو
لاٹھی ہے ہوائے دہر پانی بن جاؤ
موجوں کی طرح لڑو مگر ایک رہو

مسکین گدا ہو یا ہو شاہِ ذی جاہ
بیماری وموت سے کہاں کس کو پناہ
آہی جاتاہے زندگی میں اک وقت
کرنا پڑتاہے سب کو اللہ اللہ

روزی مل جائے مال و دولت نہ سہی
راحت ہو نصیب شان و شوکت نہ سہی
گھربار میں خوش رہیں عزیزوں کے ساتھ
دربار میں باہمی رقابت نہ سہی

ہر ایک کو نوکری نہیں ملنے کی
ہر باغ میں یہ کلی نہیں کھلنے کی
کچھ پڑھ کے تو صنعت و زراعت کو دیکھ
عزّت کے لئے ہے کافی اے دل نیکی

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین

وقار جاوید (راولپنڈی)

برادرم گلزار جاوید صاحب، آداب۔

پیار اور شکریہ دو ایسے لفظ ہیں جنکو انسان اپنے اندر محسوس کرتا ہے تو یہ مٹھاس کی طرح وجود میں گھل جاتے ہیں۔ جزبات میں ڈھل کر اسکی ساری حیات پر چھا جاتے ہیں اور پھر خوشبو بن کر چہار سو بکھرتے ہیں۔ وہ جدھر جاتا ہے ان جزبات کا پرچار و پرسار خود بخود ہوتا رہتا ہے۔

ایک واقع بیان کرتا ہوں۔ آٹھ دس سال پہلے میں پاکستان گیا تو لاہور میں اپنے یار بیلی مرحوم آغا سہیل کے گھر کو مہینے بھر کے لئے اپنا ٹھکانہ بنایا۔ وہاں سے اپنے گاؤں گیا۔ ننکانہ صاحب، پنجا صاحب گیا۔ ہفتہ دس دن کراچی میں حسن عابد اور راحت سعید کی صحبت میں بھی رہ آیا اور آغا سہیل کے گھر سے واپس ہندوستان لوٹ آیا۔ واپس آکر شکریہ کا خط نہ آغا سہیل کو لکھا نہ حسن عابد کو اور نہ راحت سعید کو۔ چند سال قبل ڈاکٹر قمر رئیس لاہور گئے تو واپس آکر کہنے لگے کہ آغا سہیل تم سے بہت ناراض ہیں۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہ آیا تو کہنے لگے دنیا داری بھی کوئی چیز ہے۔ میں نے آغا سہیل کو خط لکھا تو اسکا ایسا محبت بھرا جواب آیا کہ جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ کسی ناراضگی کا کوئی تذکرہ نہیں۔

سو بھائی میرے گوشہ شائع کرنے کے لئے شکریہ تو ادا کروں گا نہیں کیونکہ اس لفظ کی وقعت کم ہو جاتی ہے۔ ہاں یہ ضرور محسوس کیا ہے کہ ہندوستان پاکستان کے کچھ گوشوں تک اس چراغ کی روشنی پہنچ گئی ہے جو قصبہ داؤد کی مٹی میں گھڑا گیا تھا مولوی امام دین نے جسکی نوک پلک سنواری تھی۔ چاچا برکت علی نے جسے پالش کیا تھا اور وہاں کے سیدھے سادے لوگوں نے اس میں خلوص کی باتی رکھ دی تھی۔ محبت کا تیل ڈال دیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس چراغ کو روشن کرنے کا کام لکھنؤ کے ادبی حلقہ نے کیا۔ باقی کی کہانی تو بس اتنی ہے کہ رخشندہ روحی جیسی بے لوث خدمت کرنے والی خاتون نے میرے اور آپکے درمیان ای میل سے رابطہ بنائے رکھا اور یہ کام بھلی بھانت نپٹ گیا۔ ورنہ اس سے پہلے کئی مہینے سے یہ رکا ہوا تھا۔

بھائی جان اب ایک کرم یہ کیجئے کہ اس پرچہ کی دو تین کاپیاں قصبہ داؤد میں بھجوا دیجئے۔ وہاں لڑکوں اور لڑکیوں کے اسکول ہیں۔ ان کے ہیڈ ماسٹرز کو یہ پرچے بھیجے جاسکتے ہیں۔

فیروز عالم کی 'داستانِ حیات' قیمتی ادبی سرمایہ بن کر ادب کے دوش پر پسر جائیگی ایسی امید کرنی چاہئے۔ طاہرہ اقبال کی 'الست بلتست' نے خیالات کی اتنی عظیم امارت کھڑی کی ہے کہ قاری اسکی رنگا رنگی میں کھو کر رہ جاتا ہے۔ اور آپکی 'عید ملن پارٹی' کرشن چندر کی 'ایک گدھے کی سرگزشت' کی یاد دلا رہی ہے۔ یہ سب غلام ذہنیت کے پیدا کردہ اندھیرے ہیں یہ چھٹیں گے تو عوام کے چہروں پر خوشحالی کی جھلک دیکھنے کو ملے گی۔

رتن سنگھ (نوئیڈا، بھارت)

عزیز و مکرم گلزار جاوید، سلام مسنون۔

''چہارسو'' کا شمارہ نومبر، دسمبر ۲۰۱۰ء ملا۔ رتن سنگھ کی تحریریں نے ابھی تک حیران کیا ہوا ہے۔ آپ نے انھیں بجا طور پر ''قرطاسِ اعزاز'' کے لیے منتخب کیا۔ میں نے سیالکوٹ کا لاڑا۔ سنگھاسن بتیسی اور انگاں دے بوٹے بڑے ذوق و شوق سے پڑھے اُن کے گہرے اور سچے مشاہدے سے متاثر ہوا۔ زبان و بیان دونوں میں کوئی تصنع نہیں ہے۔ رحمان اختر کا ''افسانے کا خلیل جبران'' ایک مفصل مضمون ہے جس میں رتن سنگھ کے متنوع افسانوں اور اُن کی فکری نہج کو بڑی کامیابی سے منکشف کیا گیا ہے۔ رتن سنگھ کے پنجابی کلام نے بھی لطف دیا۔ اس میں بھی ایک بے ساختہ پن ہے۔ میں رتن سنگھ کے نام کے ساتھ کوئی سابقہ، لاحقہ اس لیے نہیں لگا رہا کہ ''بابا'' اتفاقاً میری عمر کا ہے۔

''عید ملن پارٹی'' پڑھا تو مزید حیران ہوا۔ آپ سے اگرچہ کبھی بلمشافہ ملاقات نہیں ہوئی۔ پھر بھی آپ کو شریف آدمی سمجھتا تھا۔ اس لیے یہ توقع نہیں تھی کہ آپ ہمارا کھانا پینا حرام کر دیں گے۔ اب بتائیے کہ موبل آئل، ماربل پاؤڈر، سرف اور ''دوسرے پاؤڈر'' کے نام پر دودھ کون پیئے۔ بیسن کے نام پر سستا چاول، چکنی مٹی اور پسی ہوئی لکڑی کون کھائے۔ مرچ، نمک، دھنیا تو دیکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ آپ تو گھر کے بھیدی لگتے ہیں۔ لوگ کہانیاں لطف اندوز ہونے کیلئے پڑھتے ہیں۔ ''خوف اندوختن'' کے لیے نہیں۔ بہرکیف یہ طے ہے کہ آپ نے ہمارے مسلمان بلکہ ''حاجی، نمازی مسلمان'' معاشرے کی خوب تصویر کھینچی ہے۔ آپ کی پیشانی چومے کو جی چاہتا ہے۔ آپ کے رسالے کا حصۂ غزل و نظم بھی فکر انگیز ہے۔ جس جس نے بھی ہمیں غور و فکر پر ابھارا اُن سب کا شکریہ۔ آپ کے پرچے میں بہت محنت سے اکٹھا کیا ہوا مواد ہے۔ اللہ آپ کو سلامت رکھے۔ ہاں یاد آیا کہ تازہ شمارے کے صفحہ ۵۷ پر میری غزل کے مطلع کے دوسرے مصرعے میں ''تو'' کمپوز ہونے سے رہ گیا ہے۔ براہ کرم ''یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ تو خدا نہیں'' پڑھا جائے۔

امین راحت چغتائی (راولپنڈی)

عزیزم گلزار جاوید، محبتیں!

میری جانب سے چہارسو کے رتن سنگھ نمبر کی اشاعت کے لئے مبارک قبول کیجیے۔ میرے خیال میں تاخیر سے کوئی کام کرنا نہ کرنے سے بہت بہتر ہے۔ رتن سنگھ اور یہ عاجز پچاس کی دہائی سے ایک دوسرے کے دوست اور غم

گسار ہیں۔ میری اُن سے آخری ملاقات رواں صدی کے پہلے سال چندی گڑھ میں اُس وقت ہوئی تھی جب میں امریکہ سے ہندوستان گیا تھا۔ آپ کا انتخاب ہمیشہ خوب ہوتا ہے۔ قرۃ العین حیدر، دیویندر اسّر اور رتن سنگھ جیسے عظیم دوستوں سے تفصیلی ملاقات کرا کے آپ نے اردو ادب کی بڑی خدمت کی ہے۔ اردو ایک عالمی زبان ہے افسوس اب یہ عالمی زبان اور اس کا ادب برصغیر ہندو پاک میں اُس مقام کے حامل نہیں رہے جو ماضی میں اس کا طرّہ امتیاز تھا۔ میں اس خاص نمبر کی اشاعت پر بہت خوش ہوں اور لطف لے کر اپنے کمپیوٹر کی سکرین پر اسے پڑھ رہا ہوں۔ ساتھ ہی ساتھ آپ کی کامیابی اور کامرانی کی دعائیں بھی کر رہا ہوں۔

ستیہ پال آنند (یو۔ایس۔اے)

پیارے گلزار جاوید! السلام علیکم۔

تازہ چہارسو تنوع اور انفرادیت کا طرّہ امتیاز ہے۔ رتن سنگھ جی کے حالات اور خیالات کی جانکاری سے بقولے دل بلیوں اچھلنے لگا۔ خوشی کی بات ہے کہ آپ انڈیا کے اہلِ قلم سے بھی ربط خبط استوار رکھتے ہیں۔ پروین کمار اشک صاحب نے اپنے خط میں مجھے بڑی محبت سے مذکور کیا ہے یہ ان کی مہربانی ہے۔ صورتِ حال یہ ہے کہ میں بوئی (BOI) ہزارہ، پاکستان کا باشندہ ہوں میرے دادا سلطان حسن علی خان آف بوئی قائداعظم کے ساتھی تھے انہوں نے تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا۔ مرحوم نے ریفرنڈم (سرحد) میں بھی مثالی کردار ادا کیا۔ رہلو سے میرا ننھیالی رشتہ ہے۔ والدہ مرحومہ کے بزرگ راجا رحیم اللہ خان راجوری کے والی تھے۔ جب کشمیر اور جموں کا سودا مہاراجا گلاب سنگھ سے ہوا تو راجا رحیم اللہ خان کی آل اولاد، رہلو کی طرف ہجرت کر گئی۔ ان میں کچھ لوگ ثمن برج وزیر آباد میں آن بسے میری والدہ مرحومہ کا تعلق وزیر آباد کے خاندان سے تھا۔ ننھیالی بزرگوں سے رہلو کی باتیں سنتا رہا ہوں میں نے ''رہلو کی یاد'' میں اشعار بھی کہے ہیں پروین کمار اشک صاحب کے اس خط سے بہت خوش ہوا ہوں میرے خیال میں بٹوارے ہی میں بہتری تھی۔ اس وقت پیش آمدہ حالات میں پاکستان کا قیام ضروری ہو گیا تھا اگر زمینی حقائق کا صدقِ دل سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ پاکستان اور ہندوستان باہمی تنازعات ختم کرنے میں بہتری ہے کہ پاکستانی اور بھارتی عوام کے تعلقات خوشگوار ہوں آپ جانیں دونوں ملکوں کے لوگ دکھ سکھ میں ایک دوسرے کے شریک ہونا چاہتے ہیں رسالے کی سبھی تحریریں دلپذیر ہیں۔

آصف ثاقب (ایبٹ آباد)

گلزار جی، آداب۔

چہارسُو کے رتن سنگھ نمبر کی اشاعت کے لئے شکریہ اور مبارک باد قبول کیجیے۔ آپ نے معروف و مقبول افسانہ نگار جناب رتن سنگھ پر یہ خاص نمبر نکال کر ادب کی بڑی خدمت انجام دی ہے۔ رتن جی اس ''قرطاس اعزاز'' کے صحیح معنوی میں حقدار تھے۔ یہ نمبر میرے خیال میں بہت پہلے شائع ہونا چاہیے تھا۔ چلئے دیر آید درست آید۔ واقعی آپ نے بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔

رتن سنگھ ہمارے دور کے ایسے ترقی پسند اور نامور کہانی کار ہیں جنہوں نے بے شمار یادگار کہانیاں اردو ادب کو دی ہیں۔ اُن کے بارے میں اپنے دور کے بڑے قلم کاروں کے مضامین' آرا اور رتن جی کے رشحات قلم کے ساتھ آپ کا تفصیلی انٹرویو رتن سنگھ کی مکمل تصویر عمدگی سے پیش کر رہے ہیں۔ میری جانب سے آپ اور رتن جی کو ڈھیروں مبارک باد۔ آپ کی شبانہ روز محنت و لگن نے چہارسو کو معروف ادبی جرائد کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔ بہت کم اہلِ قلم ہوں گے جو ''چہارسُو'' کے نام اور کام سے واقف نہ ہوں۔ تاہم ابھی چہارسو میں بہتری کی بہت گنجائش ہے۔ اگر آپ چہارسو کو احباب نوازی سے بچا سکیں تو یہ آپ اور چہارسو دونوں کے لئے بہت مفید ثابت ہو گا۔

نند کشور وکرم (دہلی' بھارت)

برادرِ عزیز گلزار جاوید صاحب' السلام علیکم۔

آپ حیران ہوں گے کہ گذشتہ تین شماروں میں مَیں نے ''چہارسُو'' کے کسی ایک شمارے کی رسید تک نہیں دی۔ اپریل ۲۰۱۰ء کے آخری ہفتے مجھ پر پراسٹیٹ کینسر کا حملہ ہوا، مئی کا مہینہ اس کے علاج میں گزرا۔ خوش نصیبی تھی کہ میرا چھوٹا بیٹا ایک عرصے تک سر آغا خان یونیورسٹی میں ڈاکٹر رہا اور اب وہاں کے ہارٹ انسٹی چیوٹ میں انسٹرکٹر یا کا ہیڈ ہے۔ اس نے آغا خان یونیورسٹی کے ہسپتال کے مشہور یورالوجسٹ فرحت عباس صاحب سے علاج کروایا۔ ان کی مساعی سے کینسر پھیلنے سے رک گیا۔ تین مہینوں کے بعد ایک قیمتی ٹیکہ لگواتا ہوں جو تین ماہ کی زندگی کی ضمانت دیتا ہے۔

جہاں تک بیماری کا تعلق وہ تو موجود ہے۔ دن کا زیادہ حصہ بستر پر گزرتا ہے۔ تھوڑے وقت کے لئے جب حواس برقرار ہوتے ہیں تو کچھ پڑھ لیتا ہوں۔ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ میں کسی کتاب یا رسالے کے سرسری مطالعے کا عادی نہیں ہوں۔ اس کے لیے جو وقت درکار ہے وہ اس بیماری کے کارن ناممکن ہو گیا۔ میرے دوست ڈاکٹر انور سدید فرماتے تھے رسالے کے مدیر محترم کو جتنا بھی پڑھ سکو، رسالے کی رسید دیتے ہوئے اس کا ذکر کر دیا کرو۔ اس مشورے پر عمل کرتے ہوئے میں نے الحمرا کے اکتوبر کے شمارے کی سرسری سی رسید دی وہ مدیر محترم نے شائع کر دی۔ نومبر کے الحمرا میں مَیں نے ایک مضمون پڑھا تھا اس کا ذکر رسید کے ساتھ کر دیا ہے۔ یہی سلوک میں آپ کے چہارسو کے تازہ شمارے سے کر رہا ہوں۔ چہارسو کا قرطاس اعزاز ''رتن سنگھ'' ان کی منفرد افسانہ نگاری کا بجا اعتراف ہے۔ میں نے اک زمانے میں ان کے افسانے محمد طفیل مرحوم کے ''نقوش'' میں پڑھے تھے تو رتن سنگھ کا اسلوب مجھے انوکھا لگا تھا۔ رتن سنگھ صحیح معنوں میں مختصر افسانہ لکھتے ہیں۔ اس دفعہ ''چہارسو'' میں آپ نے جتنے افسانے اشاعت کیلئے منتخب کئے ان کی اکثریت بھی رتن سنگھ کی طرح مختصر افسانے ہیں۔ پہلے حصے کے افسانے تو سارے کے سارے مختصر افسانے ہیں۔

نند کشور وکرم، عذرا اصغر، شکیلہ رفیق اور یوگندر بہل کے افسانے متاثر کرتے ہیں۔ اس طرح دوسرے حصے کے افسانوں میں ''عیدملن پارٹی'' آپ کے طنزیہ کی خوبصورت مثال ہے۔ حمید قیصر، کرشن نندہ اور فرخندہ شمیم کے افسانے بھی بڑے دلچسپ ہیں۔ آغا صاحب کو یاد کرنے کا یہ انداز کہ ان کی تخلیقات قندِ مکرر کے طور پر پیش کی نہایت صائب ہے۔ انور سدید نے منشا یاد کی شخصیت اور فن پر لکھی کتاب کا بھرپور تجزیہ پیش کیا ہے۔

سجاد نقوی (لاہور)

گلزار صاحب، تسلیمات۔

تازہ چہارسو ہمہ دست ہوا۔ پرچہ ماشاء اللہ بہت خوب ہے۔ ''قرطاسِ اعزاز'' چہارسو کی انفرادیت کی احسن طریق پر عکاسی کرتا ہے۔ دیگر مشمولات بھی معیار کے اعتبار سے قابل ستائش ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے مضمون کی شمولیت نے چہارسو کی جانب سے خصوصی خراج عقیدت سے بہت متاثر یا۔ عصمت چغتائی کی نظروں سے بھی آپ نے جناب رتن سنگھ کو خوب دکھایا ہے۔ اس کا ایک ضمنی فائدہ یہ ہے کہ قاری خود عصمت چغتائی کے ادبی معتقد کی ایک جھلک دیکھ پاتا ہے۔

آصف رضا (یو۔ایس۔اے)

گرامی قدر گلزار جاوید، سلام ورحمت!

ادب کا ''نورتن'' اور چہارسو کا ''رتن سنگھ'' نمبر بلکہ قرطاس اعزاز کا حوالہ لیے ہوئے ملا۔ خوب اور خوب تر کے مصداق، آپ کمال کرتے ہیں۔ میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ لکھنا، شائع کرنا اور پیش کرنا انتہائی مشکل کام ہے۔ مگر آپ انتہائی چابکدستی، خوبصورتی، خلوص ومحبت کے ساتھ اہلِ ادب کو متعارف کرواتے ہیں۔ اس بار سردار رتن سنگھ کے بارے میں بھی آپ نے بہت محنت کی ہے۔ یہ خاد م خود بھی رتن سنگھ کا قاری رہا ہے۔ چونکہ میں اردو ادب کا نصابی طالب بھی رہا ہوں اس لئے پریم چند سے بیدی تک کا لطف لیتا رہا۔ لیکن رتن صاحب نے اپنا راستہ علیحدہ اور اپنی طرزِ نگارش کو سب سے جداگانہ بنایا۔ مجھے ان کے افسانوں سے زیادہ افسانوں کے عنوانات اور عنوانات سے کہیں زیادہ اندازِ تحریر متاثر کرتا ہے۔ مثلاً ناف کا درد، کاٹھ کا گھوڑا، دھوپ بیمار ہے، چھلنی کے چھید، پنجرے کا آدمی وغیرہ۔ چہارسو کے ذریعے اور بھی راز درونِ خانہ آشکار ہوئے غرض یہ کہ رتن جی کے یہاں ذات سے کائنات اور داخلی سے خارجی فکر وعمل نے ایک ترقی پسند اہلِ قلم کی کمٹمنٹ کا آدمی ہونے کا عملی ثبوت فراہم کیا ہے۔

گلزار بھائی آپ بھی تو کسی سے کم نہیں۔ انٹرویو (براہِ راست) کا انداز آپ کا اپنا ایجاد کردہ ہے۔ نہایت خوبصورت طرز ادا' دریا کو کوزے میں بند کرنا اور جادوگروں کی طرح کوزے سے دریا نکال کر حیران کر دینا۔ اس شمارے میں ''عیدملن پارٹی'' نے تو حیرت واستعجاب میں مبتلا کر دیا ہے۔ میں نے جب سے پڑھا ہے حقیقت نگاری کے اس سحر کا اسیر ہوں۔ یہ ایک لاجواب تحریر ہے جس میں پگڑی سے لنگی تک اور انسان کے اندر سے باہر تک کا جائزہ یوں لیا ہے کہ اس کی جزئیات نگاری پر ایک کتاب لکھی جاسکتی ہے۔

آپ نے ناچیز کی بابت بھی فن اور فنکار کو قاری کے رُوبرو کر کے ایک طرح سے مجھے شیروں کے کچھار میں ڈال دیا تھا۔ شکر خدا کا کہ خطوط کے ذریعے ایسی تحریریں سامنے آئیں کہ میرا قد کچھ اور سوا ہو گیا۔ میں تمام حضرات کا دل کی گہرائیوں سے شکرگزار ہوں اور میرے پاس شکریہ کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ آخر میں ایک مرتبہ پھر آپ اور اراکین چہارسو کو پس منظر میں رہ کر اہلِ قلم کو زینت بخشنے کا منظوم شکریہ۔

میں اپنے آپ کو زنجیر تو کر سکتا ہوں
مگر مجھے کوئی دیوار کر نہیں سکتا
ترے حضور میں آدھی زباں کا آدمی ہوں
جو سوچتا ہوں وہ اظہار کر نہیں سکتا

نقاش کاظمی (کراچی)

گلزار جاوید صاحب' آداب۔

مرسلہ چہارسو محترم مہندر پرتاپ چاند صاحب کے توسط سے چشم نواز ہوا۔ بہت کرم! عہد حاضر کے بزرگ درویش کہانی کار ناول نگار بابا رتن سنگھ پر آپ کا قائم کردہ گوشہ بڑا ہی روح پرور ادب نواز لگا! ایک صدی کا قصہ از دیپک کنول بالی وُڈ سے متعلق ایک دلچسپ series ہے! جس کی پہلی قسط دادا صاحب پھالکے کے نام سے جلوہ افروز ہے۔ دیپک کنول نے یقیناً کافی تحقیقی تگ ودو کر کے قارئین کے لئے مزے دار مواد فراہم کیا۔ بندہ چوں کہ فلمی دنیا سے بطور نغمہ نگار وابستہ ہے اس لئے یہ سلسلہ میرے لئے زیادہ نشاط کا بھی باعث ہے! اللہ پاک دیپک کنول صاحب کو خوب حوصلہ وتوفیق دے کہ وہ اس بے پایاں سمندر کو کھنگال کے چمکتے دمکتے دُرِنایاب پیش کرتے رہیں۔

ممتاز افسانہ نگار اور دانش ور محمد منشا یاد کے فن اور شخصیت پر مرتبہ کتاب کے حوالے سے ڈاکٹر انور سدید نے بہت جامع اور ہمہ گیر نثری انداز میں سیر حاصل تبصرہ کیا ہے! انور سدید صاحب ہمارے عہد کے بڑے حقیقی وتخلیقی تجزیہ نگار ہیں خدا انہیں باصحت، باحیات رکھے!!

منظوم حصے میں جناب شہریار اور امجد اسلام امجد کی نظمیں شمارے کو وقار عطا کر رہی ہیں۔ شرما صاحب کی نظم پھولوں کا پیغام عبرت ناک ہے اور آنند بخشی کا ''راولپنڈی'' ہجرت کی خونچکاں کیفیات کا مرقدِ فن۔ غزلوں میں ملک زادہ منظور، آصف ثاقب، احسان احمد شیخ، امین راحت چغتائی، شباب للت، مہندر پرتاپ چاند اور عارف شفیق زیادہ پسند آئے۔ بندہ پرور اس بار چہارسو میں کہیں کہیں کتابت کی اغلاط دَر آئیں ہیں اس پر خصوصی توجہ دیجیے۔

پروین کمار اشک (پٹھان کوٹ' بھارت)

محترم گلزار جاوید صاحب' آداب۔

''چہارسُو''

اس بار کے چہارسو میں رتن سنگھ صاحب کا گوشہ دلچسپ ہے' بابا فرید کی کافیوں کے ترجمے خاصے کی چیز ہیں۔ان کی بعض کہانیاں بڑی منفرد ہیں البتہ شاعری بلاتبصرہ۔افسانے کا حصّہ پھر بازی لے گیا عذرا اصغر کا ''بلیک ہول'' اچھا ہے' پورے افسانے میں قاری کی توجہ کہانی پر ان کی گرفت مضبوط نظر آئی۔شکیلہ رفیق صاحبہ کا ''نہایت مختصر'' افسانہ ''ٹیپو'' شکن ہے۔حمید قیصر کا ''دوسرا ہار'' بھی اچھا لگا' فرخندہ شمیم کا ''بارودی جیکٹ'' اور عمران مشتاق کا ''جھوٹن'' بھی۔آپ کا عیدملن پارٹی میں بھی کافی کچھ نیا معلوم ہوا' لگتا ہے اس بار آپ ''اس کوٹھی'' میں چلے ہی گئے تھے۔

غزلوں میں بعضے شعر اچھے تھے جیسے کچھ دوسرے اشعار کے علاوہ غالب عرفان اور عارف شفیق کی غزلوں کے بعض شعر' ضیا شبنمی صاحب کی غزل۔مسکین احمد منصور کی غزل گیت کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔کچھ غزلیں ایسی بھی ہیں کہ لگتا ہے بہت ترنگ میں کہہ دی گئی ہیں یا پھر ہم لوگوں کو چھیڑنا مقصود تھا۔نظموں میں شہریار' امجد اسلام امجد' مسکین احمد منصور' علی کمیل قزلباش' احمد ظہور صاحبان کی نظمیں پڑھ کر مزہ آیا' اس بار ستیہ پال آنند صاحب کی نظموں کی کمی محسوس ہوئی۔حفیظ جالندھری کی ''درۂ خیبر'' کیا خوب ہے۔

فیصل عظیم (کینیڈا)

محترم اور شفیق بھائی گلزار جاوید صاحب! آداب وتسلیمات۔

''چہارسو'' کے تازہ شمارہ (بابت ماہ نومبر' دسمبر ۲۰۱۰ء) کو قسطوں ہی میں پڑھ پایا۔براہِ راست ہمیشہ کی طرح بے حد دل چسپ اور معلوماتی ہونے کے ساتھ ساتھ شری رتن سنگھ جی کی شخصیت اور ادبی سفر کے مختلف پہلوؤں کا خوش گوار انکشاف بھی ہے۔شیخ فرید سے متعلق ان کا مختصر مقالہ خاص طور پر بابا فرید کے کلام کے نمونے اور ان کے تراجم بے مثل ہیں۔مسعود مفتی صاحب کی کہانی سالگرہ پر ان کا تجزیہ اور تبصرہ' منی ڈرامہ' اُردو اور پنجابی کلام اور اُن کی کہانی ''سیالکوٹ کالاڑا'' ان کے ادبی وقار کو بخوبی اُجاگر کرتے ہیں۔

رتن سنگھ جی پر شامل تمام مضامین بھی ان کی شخصیت اور ان کے فن کی کامیاب نشان دہی کرتے ہیں۔گو بیشتر حضرات نے ان کی کئی نمائندہ کہانیوں کا ذکر بھی کیا ہے اور ان میں سے اقتباسات بھی دئے ہیں لیکن آپ نے خود اُن کی بس ایک ہی کہانی شامل کی ہے۔کاش آپ ان کی ایک دو اور کہانیاں بھی شائع فرماتے!

''دوسرا ہار'' اور ''جھوٹن'' اچھی کہانیاں ہیں اور حضرت نند کشور وکرم اور کرشن نندہ کی کہانیاں تعمیری' اصلاحی اور سبق آموز ہیں۔ہاں عذرا اصغر صاحبہ کا افسانہ ''بلیک ہول'' قدرے تشنہ ہے۔کوثر صدیقی صاحب کا ڈرامہ ''گلنار'' کئی تاریخی حقائق کی یاد دلاتا ہے۔دیپک کنول صاحب کا نیا سلسلہ ''ایک صدی کا قصہ'' ایک مبارک اضافہ ہے جسے جاری رہنا چاہیے۔اسی طرح فیروز عالم صاحب کی داستانِ حیات ''ہوا کے دوش پر'' خاصی دل پذیر ہے اس کے مطالعہ سے میں بہت خوش وقت ہوا ہوں۔اور آپ کی اپنی تحریر ''عیدملن پارٹی'' تو ہمیشہ کی طرح حاصلِ شمارہ ہے۔ہمارے موجودہ معاشرے میں ایک چہرے پر کئی چہرے رکھنے والوں لوگوں کی کھوکھلی نمائش اور پُرتصنّع کرداروں کی آپ نے خوب صورت عکّاسی کی ہے۔حصّہ نظم بھی ہمیشہ کی طرح جاندار ہے۔

مہندر پرتاپ چاند (انبالۂ بھارت)

قابلِ احترام گلزار جی! بہت سلام۔

تازہ چہارسو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔پرچہ عمدہ اور بھرپُور ہے۔آپ اور رفقائے کار کی کاوشیں صاف نظر آتی ہیں۔میرے لئے چہارسُو میں شائع ہونا ایک اعزاز ہے۔میں آئندہ بھی اس میں شامل ہوکر فخر کرتا رہوں گا کیونکہ چہارسُو کی پیشانی پر سید ضمیر جعفری صاحب جیسے عظیم انسان اور بڑے تخلیق نگار کا نام گُندہ ہے۔اللہ آپ اور چہارسُو کو یونہی جگمگا تا رکھے کہ چہارسُو نے دنیائے ادب کے اہلِ قلم کو آپس میں جوڑ رکھا ہے۔

حمید قیصر (اسلام آباد)

محترم گلزار جاوید صاحب' آداب وسلام۔

گذشتہ دنوں آپ سے گفتگو کر کے محبت وقربت کا اعزاز فزوں تر ہوا۔ٹیکنالوجی کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس نے وسیع وعریض حیاتِ ارضی کو ایک چھوٹے سے گاؤں میں تبدیل کر دیا ہے۔آج انسان منٹوں' سیکنڈوں میں کرۂ ارضی کے ایک سرے سے دوسرے سِرے تک رابطہ قائم کر سکتا ہے۔ای میل کے ذریعے چہارسو کے رتن سنگھ نمبر کی اطلاع خوشی کا باعث بنی۔ہارڈ کاپی کا شدّت سے انتظار ہے۔چہارسو کے تمام خصوصی نمبرات اردو ادب کی ایک منفرد تاریخ مرتب کر رہے ہیں۔قرطاسِ اعزاز پر جگہ پانے والے قلم کاروں کے تعلق سے آپ کے غیر جانبدارانہ اور بے حد منصفانہ انتخاب کے باعث چہارسو کو مستقبل میں ''ادب شناسی کی میزان'' کی حیثیت سے یاد کیا جائے گا۔

مراق مرزا (ممبئی' بھارت)

پیارے بھائی گلزار جاوید' السلام علیکم۔

تازہ شمارہ آپ نے مشہور انسان دوست ادیب رتن سنگھ کے نام معنون کر کے جس طرح اپنی روایت قائم رکھی وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔میں نے سب سے پہلے ان کا افسانہ ''شمع۔دہلی'' میں پڑھا تھا پھر بیسویں صدی اور دوسرے جرائد میں متواتر ان کی تحریروں سے متاثر اور مستفید ہوتا رہا۔چند سال پہلے وہ پاکستان بھی تشریف لائے تھے لیکن میری بے خبری کہ اُن کی واپسی کے بعد مجھے اُن کی آمد کی اطلاع ملی۔بہرحال ''براہِ راست'' کے ذریعے اُن کے فقیرانہ خیالات اور اُن کے حوالے سے مشاہیر ادب کی آراء بالخصوص رحمان اختر کا ''افسانے کا خلیل جبران'' پسند آئے۔اُن کی شاعری بھی لطف دیتی ہے پھر ''دوہے'' تو مزہ دے گئے۔افسانوں میں مختصر افسانہ ''جھوٹن'' ڈاکٹر عمران مشتاق کی فن پر گرفت کا ثبوت ٹھہرا۔''عیدملن پارٹی'' ایک خوبصورت افسانہ تھا

جس میں گلزار جاوید نے ایک بار پھر معاشرے کا وہ رخ دکھایا ہے جسے دیکھتے تو ہم سب ہیں لیکن اُسے غور سے پڑھنے کا یارا نہیں ہوتا۔ کوثر صدیقی نے ''گلنار'' ڈرامہ لکھ کر ایک غلط مفروضے کے ساتھ انصاف کیا ہے۔ اپنے پورے تاریخی پس منظر کے ساتھ اُن کی یہ تخلیق منظر بہ منظر، قاری کو ماضی میں لے جاتی ہے اور واقعی ڈرامے کا لطف دیتی ہے۔ محّی نجیب عمر نے بھی تاج محل کے پس منظر میں ایک افسانہ ''قربان گاہِ تاج پر'' لکھا ہے میں اُن سے کہوں گا کہ وہ یہ افسانہ آپ کو اپنی پہلی فرصت میں ارسال کر دیں۔

ہاں، سب سے اہم بات جو اس شمارے میں محسوس کی گئی وہ ہے بھائی دیپک کنول کا آپ کی خواہش پر ایک نئے روپ میں ''ایک صدی کا قصہ'' لے کر حاضر ہونا۔ امید ہے کہ اُن ساتھ آپ کا یہ رابطہ قارئین ''چہارسو'' کے لئے زیادہ معلوماتی و سودمند ثابت ہوگا موصوف نہ صرف یہ کہ ممبئی کی فلمی صنعت سے منسلک رہے ہیں بلکہ دلیپ کمار جیسی (LEGEND) ہستی سے بھی قریب رہے اور اُن کے فن اور شخصیت پر ایک کتاب بھی لکھی ہے جس کا اشتہار آپ کے رسالے میں دیکھ کر میں نے اُنہیں فون کیا (یہاں یہ بتانا مناسب ہوگا کہ میرے تعلقات غائبانہ دیپک کنول صاحب سے گذشتہ چار پانچ سال سے ہیں) تو انہوں نے یہ تحفہ میرے ایک فون پر مجھے اعزازی طور پر لاہور میں انکے دوست طفیل اختر صاحب کے توسط سے ارسال فرمایا تھا۔ میں نے کتاب کے مطالعے کے بعد اُن کو شکریے کا خط لکھا۔

زیرِ بحث شمارے میں میری غزل کے پانچویں شعر کا مصرعہ ثانی دراصل یوں تھا!

سانحہ گزرا تھا کیا؟ جو زندگی معزول تھی
لیکن کمپوزیوں ہوگیا۔
ساتھ گزرا تھا کیا؟ جو زندگی معزول تھی

غالب عرفان (کراچی)

برادرِ عزیز گلزار جاوید صاحب، مزاج گرامی قدر۔

چہارسو بھولی بسری یادوں اور سنہری حروف کے ساتھ جلوہ گر ہوا۔ رتن سنگھ نارووال (سیالکوٹ) میں پیدا ہوئے اور اردو ادب کے دیگر مشاہیر کی طرح اس زبان کی خدمت اور عظمت کے قائل نظر آتے ہیں اور دیگر زبانوں کے علاوہ اردو میں بھی جامع اور دقیع تخلیقات کا اضافہ کر رہے ہیں۔ اللہ کرے اُردو کے چاہنے والے ہمیشہ صحت اور زندگی سے رہیں۔ یہ زبان ہماری جان ہے شان بان اور ایمان ہے، بلکہ ہماری پہچان ہے۔ نند کشور وکرم صاحب بھی تو راولپنڈی کے ہیں بلکہ اُن کا لہجہ پوٹھوہار کا اصلی لہجہ ہے۔ جو انھوں نے ابھی تک زبان و بیان میں سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔ اُن سے لاہور میں اردو کانفرس میں ملاقات ہوئی تھی، بہت ہی پڑھے لکھے اور تحقیقی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا رخصت ہوگئے، محسن احسان، انیس ناگی اور خالد بن عدم بھی چلے گئے اللہ تعالیٰ ان سب مرحومین کو جوارِ رحمت میں جگہ دے، شباب للت صاحب بھی ہمارے پرانے لکھنے والوں میں سے ہیں، جنہوں نے اردو کی حمایت و محبت میں زندگی صرف کر دی ہے وہ بہت اچھا ادب تخلیق کر رہے ہیں۔ کچھ اساتذہ کی چیزیں اور مرحومین کے تبرکات بھی آپ کے پرچے کا حصہ ہیں۔ نئے لکھنے والوں کی محفل بھی خوب آراستہ نظر آئی۔ پروین کمار اشک، مشکور حسین یاد، جمیل یوسف، علی کمیل قزلباش، گویا تمام دوست چہارسو کو چار چاند لگائے ہوئے نظر آئے، آپ نے مسلسل اور متواتر اپنے پرچے کو رواں دواں رکھ کر ہمت کا ثبوت دیا ہے۔ ورنہ کئی چراغ بجھ گئے ہیں اور کئی ٹمٹماتے نظر آ رہے ہیں۔

کرامت بخاری (لاہور)

محترم گلزار جاوید صاحب۔

چہارسو کا برقی نسخہ عنایت فرمانے کے لئے تہہِ دل سے ممنون ہوں۔ آپ نے اس معیاری اور پروقار رسالے میں عالمی اردو ادب کا ایک جہان سمیٹ دیا ہے۔ ہر صفحہ آپ کی مدیرانہ صلاحیت اور نفاست کا آئینہ دار ہے۔ ایک بار رسالے کی ورق گردانی شروع کی تو آخر تک پڑھتا چلا گیا گویا۔

'کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست'

والا معاملہ تھا۔ بہرحال رتن سنگھ صاحب کی شخصیت کے فیض سے یقیناً شمارے کی آب و تاب میں گراں قدر اضافہ ہوا۔ یہ ایک بہت بھرپور گوشہ ہے، جس میں رتن سنگھ کے حوالے سے اردو کے کئی بلند قامت ادیبوں کی تحریریں دل و نگاہ کو تر و تازہ کر گئیں۔ آپ نے رتن سنگھ کی ساری زندگی، تمام ادب اور ان کی انفرادیت اور صلاحیت کو نہایت عمدہ انداز میں قاری کے سامنے لا کر رکھ دیا۔ اس سال کے ابتدا میں رتن سنگھ قطر تشریف لائے تھے لیکن حقیقتاً میں نے انہیں چہارسو کے ذریعہ اچھی طرح جانا۔ رتن سنگھ کے افسانے پڑھتے ہوئے یہ خیال مجھے افسردہ کرتا رہا کہ ان کی قطر آمد کے دوران موصوف سے بھرپور ملاقات کا سنہرا موقع ضائع ہوگیا۔ آپ کے عزم و حوصلہ کو دیکھتے ہوئے یہ امید کرتا ہوں کہ رسالہ چہارسو اپنی خصوصیات اور معیار کے بل بوتے پر ایک نئی تاریخ رقم کرے گا اور تادیر اردو ادب کے تخلیق کاروں اور قارئین کے درمیان پل کا کام انجام دیتا رہے گا۔

عزیز نبیل (دوحہ، قطر)

محترم گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

چہارسو کا شمارہ نومبر دسمبر ۲۰۱۰ء پڑھنے کو ملا۔ دل خوش ہوگیا۔ جناب رتن سنگھ جیسے ادیب اور شاعر کی نگارشات سامنے لانے کے لیے شکر گزار ہوں۔ اردو نظم و نثر میں ان کا مقام منفرد ہے۔ ان کا پنجابی کلام پڑھ کر ایک نئی خوشی ملی۔ Ezra Pound نے کیا پتے کی بات کہی ہے۔

The sum of human wisdom is not contained in any one language, and no single language is

capable of expersssing all forms and degrees of human comprehension,

ادب انسانوں کوایک دوسرے کے قریب لانے اورایک دوسرے کو سمجھنے کے لیے بہت مدد کرتا ہے کیونکہ انسانوں کے خواب اور خواہشیں، خوشیاں اورغم مشترک ہوتے ہیں اور دنیا کو پُر امن، بہتر اور خوبصورت بنانے کی خواہش بھی۔

دیپک کنول کا مضمون ''ایک صدی کا قصہ'' اس دور میں لے گیا جب سینما میں فلم دیکھنا ایک انوکھا اور پُر لطف تجربہ ہوتا تھا۔ فلمیں اپنے اپنے ملک کی ثقافت کو سامنے لاتی ہیں۔ ان کی کہانیاں، کردار، مناظر اور موسیقی فلم دیکھنے والوں کو کسی اور ہی دنیا میں لے جاتے ہیں۔ ایک اچھی فلم دل و دماغ پر وہی تاثر چھوڑتی ہے جو ایک اچھی کتاب۔ اس لئے اب فلم بھی ادب کا حصہ بنتی جارہی ہے۔ دادا بھائی پھالکے نے فلم کی ابتداء کرنے اور اسے سنوارنے میں جو کردار ادا کیا وہ ناقابلِ فراموش ہے۔ یہ دلچسپ مضمون لکھوانے پر آپ کا شکریہ اور جناب دیپک کنول صاحب کو مبارک باد۔ میرے جیسے لوگوں کے لیے یہ بہت مزیدار مضمون ہے جو ہمیں ایک بھولی بسری دنیا میں لے جاتا ہے، جو بلیک اینڈ وائٹ تھی لیکن آج کی رنگین دنیا سے زیادہ دلکش۔ اس مضمون کی اگلی قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔

پروفیسر مسکین احمد منصور (حیدرآباد، سندھ)

جناب گلزار جاوید صاحب، آداب۔

چہارسُو نومبر، دسمبر ۲۰۱۰ء بدست ہوا۔ یہ آپ کی اور محترمہ ڈاکٹر رینو بہل کی محنت کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ ایک دن پیشتر آپکا Email ملا تھا جس میں آپ نے رسالہ کی Hard copy چند دن بعد ملنے کے بات کی تھی۔ لیکن اگلے دن صبح ہی ڈاکٹر رینو بہل نے غالباً سب سے پہلے مجھے ہی دے دیا۔ میں تہِ دل سے آپکا مشکور ہوں سب سے پہلے نظر ''میرے مولا'' پر پڑی۔ واہ کیا بات ہے۔ بیدل صاحب کہتے ہیں۔

''اپنوں کا تختہ دھڑن کردے مولا''

آپکا ''براہِ راست'' انٹرویو میں نے سب سے پہلے پڑھا۔ ایک ہی نشست میں پڑھا۔ بہت متاثر ہوا۔ آپ کو اتنا اچھا انٹرویو لینے پر مبارکباد۔ دوسرا ڈاکٹر رینو بہل کا ''زندگی کے حسین اتفاقات'' بہت عمدہ ہیں۔ میں نے فوراً رینو جی کو ٹیلی فون پر مبارک بادی۔ جناب رتن سنگھ جی کے بارے میں کیا کہوں۔ ابھی تو پورا شمارہ پڑھنا باقی ہے۔ جتنا پڑھا ہے اُسی سے اُنکے بلند قد اور عظمت کا پتہ لگ گیا ہے۔ خاص طور پر جب وہ کہتے ہیں کہ دنیا کی خوبصورت ترین عورت اُنکی اپنی بیوی ہے بہت اونچی بات کہہ گئے ہیں وہ۔ اس سے اُنکی عظمت اور خوبصورتی کے صحیح معنی معلوم ہوئے ہیں۔ اور جب میں آپ کو رتن سنگھ جی کو اور رینو بہل کو دیکھتا ہوں تو لگتا ہے کہ میں ابھی اردو ادب کی پہلی سیڑھی پر اٹکا ہوا ہوں آپ سب بلندیوں پر ستاروں کی طرح جگمگا رہے ہیں۔ خدا آپ کو مزید بلندیاں عطا فرمائے۔ آمین۔

کرشن نندہ (چندی گڑھ، بھارت)

مدیرِ محترم، تسلیم و آداب۔

سالِ رواں کا آخری شمارہ رتن سنگھ صاحب کا قرطاس اعزاز لئے ہوئے ملا، ادب نوازی کا شکریہ۔ قرطاسِ اعزاز سے انگاں دے بوٹے تک' آپ کے انٹرویو کے علاوہ دیگر جملہ تحریریں بھی محترم رتن سنگھ کے روشن خیال نظریات وفراخدلانہ افکار، نثری و شعری اخلاص مندی، اسلوب کی سادگی وپُرکاری، معاصرین کے مابین منفرد افسانوی تشخص، تنقیدی زاویوں سے اعتراف فن ستائش نگارش کی بھرپور ہنرورانہ ترجمانی کرتی ہیں۔ یہ بھی مقام مسرت ہے کہ اس مرتبہ مزاح کو ادب کا بوکر انعام دیا گیا۔ یاد آتا ہے کہ ''ستاروں پر کمند'' کے ابوالحسن نغمی صاحب اور محترمہ مونی حمید بھی لاہور کے ریڈیائی پروگرام ''ہونہار'' کے بحیثیت بھائی جان و آپا شمیم معروف و مقبول میزبان ہوا کرتے تھے میرے مولا لحہ ٔفکریہ کو بیدار کرتی ہے۔ گزشتہ دنوں تقریباتِ اقبالؒ کے سلسلے میں ایک وفاقی منسٹر یہ کہتے ہوئے پائے گئے کہ کلام اقبال کے مطالعے کے لیے عینکیں اُتارنی پڑتی ہیں، جبکہ شاعر مشرق و مفکر پاکستان جیسے نابغۂ روزگار کے کلام کی تفہیم و توضیح کیلئے کئی کئی بار عینکیں بدلنی پڑیں تو بھی کم ہے۔۔۔۔

''بلیک ہول'' کا پُل درخت' یادوں کے استعارے سے جُڑا ہوا ہے بیانیہ' حقیقی پر چھائیوں سے امتزاج پاکے مزید مؤثر ہوتا گیا، بالغ عورت پڑھ کے ملکۂ ترنم کے گیت کا مکھڑا یاد آیا۔

''دنیا کب چُپ رہتی ہے''

''عجیب حادثہ ہے یہ'' میں خود تعزیتی کے احساس کو زوال پذیر اخلاقی اقدار کے تناظر نے تاثر انگیز و فکر آمیز بنادیا، دوسرا ہار، اصلی و نقلی کی تحسین و تفریق کی لمبی لکیر چھوڑ گیا، بارودی جیکٹ، میں ایموشنلی بلیک میلنگ کے علاوہ جس نفسیاتی مرض کا ذکر ہوا اس میں شاید انسان، دوسروں کے ساتھ ساتھ اپنی ذات سے بھی خطرناک حد تک لاپرواہ ہوجاتا ہے، عیدملن پارٹی کے اس بڑے اور عالیشان گھر کے بھیدی بن کر آپ نے جس باکمال جزئیات نگاری اور ماہرانہ انسانی سائیکی سے کرپشن مافیا کی لنکا ڈھائی ہے اُس کے لیے ڈھیروں داد۔۔۔! ''دوام ابد'' میں منشایاد صاحب کے فکر وفن کا محاکمہ مختصراً مگر عمدگی سے کیا گیا، تاج محل کی فریاد' تہذیبی وثقافتی جاہ جلال کے بتدریج بدلتے ہوئے منظر نامے کے ساتھ متاثر و متفکر کرتی ہے' یادرفتگاں کے تسلسل میں محترم آغا جی اور محترمہ فرخندہ لودھی کو اُن کے انفرادی اوصاف وفنی محاسن کیساتھ خوبصورتی سے یاد کیا گیا۔ راولپنڈی میں بھی ناسٹلجیا کا عُنصر غالب محسوس ہوتا رہا۔

ایک صدی کا قصہ' قارئین کو بالی وڈ کے فلمی سفر کے مختلف مدارج

ومراحل سے شناسا کروانے کا خصوصی اہتمام ہے۔ درۂ خیبر کی تاریخی عظمت و سطوت، مختلف حکمرانوں کے ادوار و یلغار کے پس منظر کے ساتھ، نہایت فنکارانہ تصویر کشی ہے جو خالق قومی ترانہ سے ہی تخصیص پاتی ہے۔ آپ کے سامنے پھیلے ہوئے بہت سے رس رابطوں سے خیال آ رہا ہے کہ ان کے توسط سے بسلسلۂ پذیرائی جریدہ کتاب بھی مرتب ہوسکتی ہے کیونکہ چہارسو کے صفحات کے گوشے تک معنویت آمیز عبارتوں سے ترتیب وتزئین پائے ہوئے ہوتے ہیں۔ بس اک ذرا پروف ریڈنگ کی جانب زیادہ التفات وگرنہ ''دستِ دُعا'' بھی ''دشتِ دُعا'' میں منقلب ہوجاتا ہے۔

شگفتہ نازلی (لاہور)

میرے گلزار! خوش رہو۔

نومبر، دسمبر ۲۰۱۰ء کا آخری شمارہ آپ نے ایک بزرگ اور خوبصورت شخصیت افسانوں کے نورتن جناب رتن سنگھ کو قرطاسِ اعزاز پیش کر کے ایک اور کارِ نیک سرانجام دیا ہے۔ مبارک باد۔ رتن جی پر لکھے مضامین کو پڑھا تو یوں لگا کہ ہر مضمون نگار اُن سے خاص عقیدت وقربت رکھتا ہے۔ بالخصوص عزیزہ رینو بہل کا مضمون ''زندگی کے حسین اتفاقات'' پڑھ کر جی خوش ہوگیا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے مضمون نگار اُن کے ساتھ ساتھ چل رہا ہو۔ اسی طرح ڈاکٹر قمر رئیس اور جناب شارب رودولوی کے مضامین بھی گہری معنویت کے حامل ہیں۔ رتن جی کا افسانہ ''سیالکوٹ کا لاڑا'' بہت پیارا لگا۔ نند کشور وکرم کا ''تعبیر خوابوں کی''، شکیلہ رفیق کا ''بالغ عورت''، کرشن نندہ کا ''قسمت کا فیصلہ'' حمید قیصر کا ''دوسرا بار''، عمران مشتاق کا ''جھوٹن'' اور آپ کا ''عیدملن پارٹی'' نے خوب لطف دیا۔ آپ نے بڑے خوبصورت انداز سے معزز لوگوں کی ''سہرابندی'' کی ہے۔ ہر کوئی اس حمام میں ننگا ناچتا نظر آیا۔ کہانی بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ آپ نے دودھ، دہی، سبزی، پھل، گوشت اور دوائیاں تک کہیں بھی کسی کو نہیں بخشا۔ اس خوبصورت انداز سے کہ ایک ایک بات کی اچھی طرح وضاحت ہو جائے۔ کہیں کوئی غلطی درآنے کی گنجائش ہی نہ رہے۔ آفرین صد آفرین۔ خدا معلوم آپ یہ سب کچھ کس طرح بیان کر لیتے ہو۔ قاری کتنا بھی سخت جان کیوں نہ ہو مبارک دینا اُس کی مجبوری بن جاتی ہے۔

''ہوا کے دوش پر'' فیروز عالم گزرے زمانے کی خوب یاد دلا رہے ہیں اور جس روانی سے وہ یہ تحریر قلمبند کر رہے ہیں اُن پر اور اُن کے قلم پر بہت پیار آتا ہے۔ دیپک کنول نے خوبصورت سلسلہ شروع کیا ہے۔ ''ایک صدی کا قصّہ'' میں ایک ایسی ہستی دادا صاحب پھالکے سے تفصیلی تعارف کرایا ہے جو مقبول عام بھی ہے اور مقبول خاص بھی۔ حصّۂ شاعری بھی کافی پُر لطف ہے مگر خط کی طوالت تفصیل کی اجازت نہیں دیتی۔ میری جانب سے سید سعید نقوی، سریواستو رند، عظمیٰ صدیقی، مہندر پرتاپ چاند، نقشبند قمر بھوپال، خالد حمید شیدا، مسکین احمد منصور، عارف شفیق اور جناب امجد اسلام امجد کو خوبصورت تخلیقات پر مبارک باد پہنچا دیجیے۔

ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ (دہلی، بھارت)

محترم گلزار جاوید صاحب، تسلیمات۔

''چہارسو'' کا تازہ شمارہ ہاتھوں میں۔ ادبی دنیا کا اتنا خوبصورت مجلّہ ہم ادب دوستوں کے لیے کسی نعمتِ مترقبہ سے کم نہیں۔ ہمیشہ کی طرح اسی آن بان کے ساتھ۔ ''رتن سنگھ'' کے نام قرطاس اعزاز نے دل خوش کر دیا۔ ہماری زمین، ہماری زبان اور ہماری معاشرت کے رتن سے آپ نے کیا خوبصورت تعارف کروایا۔ جس کے لیے نہ جانے کتنی کتابوں کے اوراق پلٹنے پڑے۔ رتن سنگھ کا یہ جملہ ''اس دنیا میں سب سے خوبصورت میری بیوی ہے'' خوبصورتی کی ایسی خوب صورت تعریف رتن سنگھ ہی کر سکتے ہیں۔ رتن سنگھ کا شاہکار ''سیالکوٹ کا لاڑا'' کیا نغمگی بکھیر گیا۔ ہم بیان کرنے سے قاصر ہیں۔ گوگلیانی کے گیت افسانے میں ہیرے کی طرح جڑے نظر آتے ہیں۔

عذرا اصغر کا ''بلیک ہول'' خوبصورت تاثراتی افسانہ، شکیلہ رفیق کا مختصر افسانہ ''بالغ عورت'' معاشرے پر خوبصورت طنز۔ حمید قیصر کا ''دوسرا بار'' شطرنج کی شاطرانہ چال کا مزہ دے گیا۔ آپ کا افسانہ ''عیدملن پارٹی'' اگرچہ طویل تھا لیکن قاری کی دلچسپی آپ نے برقرار رکھی۔ اختتامیہ تو افسانے کا ماحصل ہے۔

نظموں اور غزلوں کا انتخاب بھی خوب ہے۔ ''جمیل یوسف'' کی غزل نے ایک کیفیت برپا کی۔ استاد شاعر غالب عرفان کی غزل نے بھی خوب رنگ جمایا۔ ''منشا یاد'' پر لکھی کتاب کا تعارف پسند آیا۔ کتابوں پر تبصروں کا یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ اس سے کتابوں کے انتخاب میں آسانی ہوتی ہے۔

نجیب عمر (کراچی)

محترمی گلزار جاوید صاحب

رتن سنگھ نمبر بذریعہ رتن سنگھ جی موصول ہوا۔ بے حد عمدہ اور جاذب نظر پرچے کی ہر سطر آپکی محنت کی منہ بولتی تصویر ہے۔ دلی مبارک باد! رتن سنگھ جی کے ساتھ سرورق پر میری موجودگی حیرت انگیز ہے۔ اور آپکی وسیع النظری کی دلیل بھی۔ خدا کرے کہ آپ اسی طرح اردو زبان کی آبیاری وتزئین میں نئے ابواب کا اضافہ کرتے رہیں۔ آمین!

'قرطاس اعزاز رتن سنگھ کے نام' میں میرا نام روحی فاطمہ شائع ہو گیا ہے۔ میرا نام رخشندہ روحی ہے۔ عذرا اصغر صاحبہ کی کہانی 'بلیک ہول' میرے دل کے بلیک ہول کے بالکل نزدیک سے گذری۔۔ اچھا لکھتی ہیں۔' بالغ عورت' جو ہمارے معاشرے میں کبھی بالغ نہیں ہوسکتی۔۔ اردگرد کچھ اسی طرح کا ماحول ہے۔ جمیل یوسف صاحب کا یہ شعر اسی طرف اشارہ کرتا لگتا ہے۔

ابھی ایک تشنہ تعبیر ہے جو خواب دیکھا تھا
اسی خواب حسین سے اک جہاں تخلیق کرتے ہیں

رخشندہ روحی (نئی دہلی، بھارت)

۔سرسری تم جہان سے گذرے!۔

(خودنوشت سوانح)

''میرے پاس ڈائری، روزنامچہ یا نوٹس نہیں تھے جن کی مدد سے میں خودنوشت لکھ سکتا۔ زیرِ نظر خودنوشت محض حافظے کے زور پر لکھی گئی ہے۔ یہ کوئی بیس، بائیس سال کی مدت نہیں۔ قریب ایک صدی کی حقیقی اور زندہ داستان ہے۔ صدی بھی ایک طوفانی، تلاطم خیز اور ہنگامہ برسر جس میں ایک دو نہیں کئی انقلاب رونما ہوئے۔ یہ خودنوشت سوانح میری ذات کے حوالے سے کئی جہات پر حاوی ہے۔ کھیل کود، ادب، سیاست، اُفتادِ طبع اور دفتری زندگی کے نشیب و فراز، مشغولات و معمولات اور طرح طرح کی مہمات۔ میں نے حتی المقدور کوشش کی ہے کہ خودنوشت میں تسلسل رہے اور کسی طرح خشک اور بوجھل نہ ہونے پائے۔ اس خودنوشت میں مجھے پنڈت جواہر لال نہرو، اسٹالن کے مدِ مقابل ٹراٹسکی کے دستِ راست کامریڈ ایم۔ این رائے سے قربتِ خاص اور علامہ اقبال کی زیارت کے مواقع بھی میسر ہوئے ہیں''.....اکرام بریلوی

سرسری تم جہان سے گذرے چار سو چار نفیس صفحات مجلد اور اسلم کمال کے خوبصورت سرِ ورق کے ساتھ فقط چار صد پاکستانی روپے اور بیرونِ ملک پندرہ ڈالر کے عوض، بختیار اکیڈمی A-149، بلاک 3، گلشنِ اقبال کراچی پر بہ آسانی دستیاب ہے۔

○

۔پروفیسر محمد حسن کی یاد میں اور باتیں۔

''ڈاکٹر محمد حسن سنجیدہ ادب کے قارئین کے لئے لہلہاتی کھیتی تھے۔ ایک زمانہ تھا جب انجمن اساتذہ کے روحِ رواں محمد حسن تھے تو سارے چھوٹے، بڑے لکھنے والے ان کے ہمنوا تھے۔ ذہانت کے بے پناہ خزانے کی بدولت وہ اپنی نظیر آپ تھے۔ تھکن یا ماندگی اُن میں نہیں تھی اسی لئے آخری عمر تک نہایت فعال رہے۔ خودداری اور حق گوئی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ صابر وشاکر بھی تھے یہی وجہ ہے کہ خود کو نمایاں کرنے کی طرف اُنھوں نے کبھی توجہ نہیں کی۔

ڈاکٹر محمد حسن پر اس پہلی کتاب میں معنوی جہتیں اور جمالیاتی تاثر بھی ہے۔ سوچ کا دھارا کیسی سمت کا متلاشی رہتا ہے اور نئے انعکاسات سے نئی راہیں کس طرح روشن کرتا رہتا ہے اسے صرف محسوس کیا جاسکتا ہے''.....ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

قیمت: فقط اسّی صد روپے ہندوستانی۔ دستیابی: ایجوکیشنل پبلی شنگ ہاؤس، لال کنواں، دہلی۔6، بھارت۔

○

۔گیتانجلی۔

''گیتانجلی کے اردو سمیت دنیا کی بیشتر زبانوں میں بھی ایک سے زائد تراجم ہوئے ہیں مگر سچی بات یہ ہے کہ مرحوم و مغفور سید ظہیر عباس کا ترجمہ سب سے مختلف ہے۔ اس ترجمے میں اصل متن سے وفاداری بھی ہے اور جمالیاتِ شعر کے اعلیٰ معیار بھی پیشِ نظر رکھے گئے ہیں۔ اس حسین امتزاج نے زیرِ نظر ترجمے کو تخلیقی سطح پر لا کھڑا کیا ہے۔ نغمہ و آہنگ کی ہنروری لطافتِ احساس کے تمام سلیقوں اور قرینوں کے ساتھ ترجمے میں بھی برقرار ہے اور یہ کوئی آسان بات نہیں ہے۔ میرے خیال میں مرحوم ظہیر عباس کا یہ ترجمہ ٹیگور کے شاعرانہ کمال سے براہِ راست استفادہ نہ کر سکنے والوں کے لئے بے حد کارآمد اور مفید ثابت ہوگا، مجھے اس کا یقین ہے''.....افتخار عارف

دستیابی: پورب اکادمی، اسلام آباد، پاکستان۔

''چہارسُو''